سہ ماہی



خسرو نمبر

103

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمد شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم

خسرو



شبیہ حضرت امیر خسرو

دانی کہ ہستم در جہان من خسرو شیرین بیان
گر نائی از بہر دلم بہر زبان من بیا
(خسرو)

حضرت امیر خسرو کا مزار

پس منظر میں امیر خسرو کے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیا کا مزار پر انوار



حضرت امیر خسرو کے ہمعصر سات بادشاہ



ناصر الدین محمود



غیاث الدین بلبن



معز الدین کیقباد



سلطان جلال الدین محمد فیروز خلجی



سلطان علاؤ الدین خلجی



قطب الدین مبارک شاہ خلجی



سلطان غیاث الدین تغلق



عالی جناب فخرالدین علی احمد صاحب صدر جمہوریہ ہند امیر خسرو یادگاری ٹکٹ کی رسم اجرا انجام دے رہے ہیں
شری شنکر دیال شرما وزیر مواصلات ٹکٹ کا البم پیش کر رہے ہیں۔



عالی جناب فخرالدین علی احمد صاحب صدر جمہوریہ ہند جو قومی تقاریب کمیٹی کے سرپرست اعلیٰ ہیں امیر خسرو یادگاری جلد کو ملاحظہ فرما رہے ہیں
تصویر میں نواب علی یاور جنگ صدر کمیٹی اور حسن الدین احمد جنرل سکریٹری بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

امیر خسروؒ کے عرس میں شرکت کیلئے آنیوالے پاکستانی زائرین کا پنجاب وقف بورڈ کی جانب سے واگہ سرحد پر استقبال



تصویر میں پاکستانی زائرین کے قائد اور چودھری طیب حسین خان ایم۔پی چیئرمین پنجاب وقف بورڈ

پیچھے

مولانا خلیل الرحمن ممبر پنجاب وقف بورڈ عصمت علی خان صاحب ایڈیشنل سکریٹری۔ جی اے ٹو ڈپٹی کمشنر امرتسر
پاکستانی زائرین کا استقبال کر رہے ہیں۔



حضرت امیر خسرو کی سات سو سالہ تقاریب کمیٹی کے زیر اہتمام ۲۳۔۲۴۔۲۵ جنوری ۱۹۷۶ء کو وگیان بھون میں

حضرت امیر خسرو پر بین الاقوامی سمینار کا انعقاد



حضرت امیر خسرو پر بین الاقوامی سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے عالی جناب فخر الدین علی احمد صاحب صدر جمہوریہ ہند جناب بی۔ ڈی جتی نائب صدر جمہوریہ ہند دوسرے غیر ملکی معزز شرکا کے ہمراہ تشریف فرما ہیں۔
جناب علی یاور جنگ صدر امیر خسرو قومی تقریب کمیٹی استقبالیہ کلمات فرما رہے ہیں



تصویر میں امیر خسرو قومی تقریب کمیٹی کے اراکین۔ جناب بی۔ ڈی جتی نائب صدر جمہوریہ ہند جناب شیخ عبداللہ وزیر اعلیٰ کشمیر سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ جناب علی یاور جنگ گورنر مہاراشٹر جناب پروفیسر نورالحسن وزیر تعلیم حکومت ہند جناب یونس سلیم ایم۔ پی جناب حسن الدین احمد بھی موجود ہیں۔

یکے از مطبوعات پنجاب وقف بورڈ

سہ ماہی اوقاف

مدیر
حکیم اجمل خان

جلد ——— (۴)

شمارہ ——— (۱)

جنوری، مارچ ۱۹۷۶ء

اس شمارہ کی قیمت - ۶ روپے

اشتراکات: ———

سالانہ: ۱۲ روپے

فی شمارہ: ۳ روپے

خط وکتابت کا پتہ

" اوقاف میگزین "

۵۰ سردار پٹیل مارگ، انبالہ کینٹ

ترسیل زر کا پتہ:

سکریٹری پنجاب وقف بورڈ (میگزین)

۵۰ سردار پٹیل مارگ، انبالہ کینٹ

محبوبات

مقالات

نظمیں

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر حکیم احمل خاں نے ہمدرد وقف بورڈ کی جانب سے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر ۵ سردار پٹیل مارگ چانکیہ پوری سے شائع کیا۔

مدیر

"فکریات"

ہندوستانی عوام اور حکومت کے لئے یہ باعث صد افتخار ہے۔ کہ اس سال فارسی زبان کے سب سے بڑے ہندوستانی شاعر حضرت ابوالحسن یمین الدین امیر خسروؒ کی سات صد سالہ یادگار تقریبات نہایت اہتمام سے منائی جا رہی ہیں تقریبات کے انعقاد و اہتمام اور خسرویات کی ترتیب و اشاعت میں جو اہل فن اور دانشور شریک کار رہے ہیں مبارک کے مستحق ہیں۔

سات صد سالہ یادگار تقریبات کے سلسلے میں اب تک جو پروگرام اور کوششیں سامنے آچکی ہیں۔ ان میں سب سے اہم چیز قومی سطح پر حضرت امیر خسرو قومی تقریبات کمیٹی کا قیام ہے۔ عزت مآب جناب فخرالدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند اس کے سرپرست اعلیٰ اور جناب علی یاور جنگ گورنر مہاراشٹر صدر ہیں نیز ممتاز قومی رہنما، ارباب نظر، ادیب و دانشور کمیٹی کے عہدیدار و رکن ہیں۔ حضرت امیر خسرو کی شخصیت، فن، اور تعلیمات پر روشنی ڈالنے کے لئے کمیٹی کے سامنے وسیع المقاصد پروگرام ہیں۔ جنہیں تدریجی طور پر بروئے کار لایا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ جو مساعی اب تک سامنے آچکی ہیں۔ ان میں حکومت ہند کی وزارت مواصلات کی جانب سے حضرت امیر خسرو کی ادبیں یادگاری ٹکٹ جاری کیا جا چکا ہے۔ وزارت اطلاعات ونشریات کے ڈی اے وی پی نے ہندی، اردو اور انگریزی میں شاندار باتصویر بروشر شائع کیا ہے۔ ترقی اردو بورڈ کی کتاب "خسرو شناسی یادگاری مضامین کا مجموعہ" مرتبہ ظ انصاری و ابوالفیض سحر اور پبلیکیشنز ڈویژن کی جانب سے امیر خسرو پر انگریزی مجموعہ مضامین کی اشاعت خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، اور نیشنل میوزیم نے امیر خسرو کی کتابیں و مخطوطات کی نمائش کا اہتمام کیا ہے۔ ڈاکٹر ملک محمد کی کتاب "امیر خسرو" (ہندی) جناب ڈاکٹر ظہورالحسن صاحب انصاری کی کتاب "امیر خسرو احوال و آثار" جناب سلیم احمد صاحب کی کتاب "عہد خسرو" اور ایس۔ ایس لامبہ صاحب کی کتاب "ندر خسرو" بھی خسرویات میں شامل اور قابل قدر اضافہ ہیں۔

ہمارے کئی جرائد نے اس موقعہ پر اپنے خصوصی نمبر شائع کئے جن میں ماہنامہ آجکل نئی دہلی، نیا دور یوپی لکھنؤ، قومی راج مہاراشٹر بمبئی اور برگ آوارہ حیدرآباد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان اشاعتوں میں حضرت امیر خسرو کی زندگی اور فن پر مختلف محققین نے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ امسال حضرت امیر خسرو کے سالانہ عرس کی تقریبات حضرت نظام الدین دہلی میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئیں ممتاز ادبا، شعرا، اور رہنمایان کرام نے شاندار خراج عقیدت پیش کیا۔ پاکستانی زائرین بھی عرس کی تقریبات میں شریک ہوئے جن کا پرتپاک خیر مقدم پنجاب وقف بورڈ کی جانب سے واگہ بارڈر پر کیا گیا تھا۔

پنجاب وقف بورڈ نے حضرت امیر خسرو کے مشہور دیوان "بقیہ نقیہ" مرتبہ جناب سید شاہ القادری کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ نیز اپنے جریدہ اوقاف میگزین کی اس خصوصی اشاعت کو حضرت امیر خسرو سے منسوب کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

اوقاف میگزین کی خصوصی اشاعت کی ترتیب میں یہ ملحوظ رہا ہے۔ کہ حضرت امیر خسرو کی شخصیت اور فن کے تمام روشن پہلو قارئین کرام کے سامنے آجائیں۔

چنانچہ حیات خسرو کے عنوان سے علامہ شبلی مرحوم کا ایک طویل مگر تحقیقی مقالہ شریک اشاعت ہے حضرت امیر خسرو کی شخصیت اور علامہ مرحوم کا قلم دونوں ہی منفرد ہیں۔

ممتاز قومی سکالر جناب ڈاکٹر ظ۔ انصاری جو اپنی جوانی جوہر نوں سعدی، حافظ، اور فردوسی کی سرزمین میں قیام پذیر رہ چکے ہیں نے حضرت امیر خسرو کی ہندوستانیت، حب الوطنی، وفاداری، اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ کا عمدہ جائزہ لیا ہے۔

ہمارے دوسرے لکھنے والوں میں ڈاکٹر خلیق احمد نظامی، جناب صلاح الدین عبدالرحمان، جناب نثار احمد فاروقی، جناب حسن الدین احمد، جناب عتیق حنفی، جناب صفدر آہ، جناب محمد عمر جیسے مورخ، نقاد، محقق، مقالہ نگار، ادیب، دوسرں کا ر شریک ہیں۔ ان مقتدر شرکاء نے اپنے مقالات میں حضرت امیر خسرو کی شخصیت، فن، اور کردار کے مختلف گوشوں پر اچھی اور تحقیقی بحث کی ہے۔ جیسے آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

حصۂ نظم میں جناب ماہر القادری، ساغر نظامی، سلام مچھلی شہری، جمیل مظہری، سید غلام سمنانی، جگن ناتھ آزاد، تسنیم گرہانی، مفخر الدین احمد جیسے ممتاز شعرائے کرام شریک ہیں نیز حضرت امیر خسرو کی تقریبات کے سلسلے کی تصاویر بھی شامل کی جا رہی ہیں۔

حضرت امیر خسرو یقیناً اپنے عہد کی بے مثال اور عظیم شخصیت تھے جنہیں انسانیت اور فن کا کمال حاصل تھا۔ آپ ایک طرف حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے ہم نشین تھے۔ اور دوسری طرف اپنے ہم عصر شہنشاہوں کے درباری بھی، فارسی کے شاعر بھی اور ہندوی کے بھی، موسیقار بھی تھے اور نغمہ گو بھی، مرثیہ خوان بھی تھے، اور مثنوی نگار بھی! آپ کی انسانیت، اسلامیت، اور کمال فن کا اعتراف حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس طرح فرمایا ہے

جو پوچھے گا خدا روز جزا لایا ہے کیا تو
تو کہہ دوں گا کہ خسرو ہے مرے اعمال کا ثمرہ

فن درباداری میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ سیر الاولیاء میں امیر خورد نے آپ کے کمال فن کا ایک واقعہ قلم بند کیا ہے۔

"میں نے اپنے والد سے یہ بھی سنا ہے۔ کہ سلطان جلال الدین خلجی اپنے عہد دولت میں چاہتا تھا۔ کہ شیخ کبیر حضرت نظام الدین اولیاء سے ملے لیکن باوجود اس خواہش کے اجازت نہ ملی۔ آخر میں اس نے امیر خسرو سے جو اس کے مصحف دار تھے خفیہ طور سے طے کیا کہ بغیر اجازت آپ کی خدمت میں آئے۔ امیر خسرو نے یہ مناسب سمجھا کہ اس بات کو اپنے مرشد سے عرض کر دینا چاہئے۔ بادشاہ نے ان سے ایک بات خفیہ کہی تھی لیکن آپ کو خوف تھا کہ آپ نے یہ بات شیخ کبیر سے چھپائی۔ تو وہ آپ سے رنجیدہ ہو جائیں گے کہ تم کو معلوم تھا تم نے مجھے کیوں نہیں آگاہ کیا۔ اس لئے امیر خسرو نے اپنی جان سے کھیل کر شیخ کبیر کو اطلاع دی۔ کہ کل بادشاہ آپ سے ملنے آئے گا۔ حضور اسی روز اجودھن شیخ فرید کی زیارت کے لئے روانہ ہو گئے۔ جب بادشاہ نے یہ سنا۔ تو امیر خسرو سے رنجیدہ ہوا کہ تم نے میرے بھید کو کیوں ظاہر کر دیا۔ اور مجھے سعادت پائے بوسی سے محروم رکھا۔ امیر خسرو نے جواب دیا کہ بادشاہ کی خفگی سے خوف جان ہے۔ لیکن شیخ کی خفگی سے ایمان ضائع ہونے کا خوف ہے۔ بادشاہ مرد دانا تھا اس نے اس جواب کی تعریف کی۔"

قصیدہ گوئی میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا جس کی مثال ملک علاء الدین کشلی خاں عرف ملک چھجو کی شان میں لکھا گیا یہ مشہور قصیدہ ہے۔

چرخ را گفتم کہ خورشیدت کجاست — آسماں روئے ملک چھجو نمود

آپ انتہائی پُر درد اور پُر سوز مرثیہ نگار تھے۔ سلطان محمد کی شہادت پر آپ نے ایک مرثیہ اسپ نامہ مرتب کر کے سنایا۔ جسے سن کر سامعین ہوش و حواس گم کر بیٹھے۔ ہندوستان کی فارسی مرثیہ نگاری کی تاریخ میں اتنا مقبول مرثیہ نہیں لکھا گیا۔

شہ وریں ہند سرو آگہ نے کہ تقدیر خدا — صورت تدبیر را خط سیہ در کشید

اس مرثیہ کے بعد آپ کی غیر معمولی مقبولیت شروع ہوئی۔ پھر قران السعدین لکھی تو ملک الشعراء بن گئے۔ اور جب جلال الدین خلجی کے کارناموں پر مفتاح الفتوح ترتیب دی تو امیر کا خطاب مل گیا۔ ایک اندازے کے مطابق حضرت امیر خسرو نے چار لاکھ اشعار کہے ہیں۔ اشعار کی اتنی بڑی تعداد ایرانی شعرا کے ہاں بھی نہیں ملتی۔ پھر اشعار بھی ہر قسم کے، جن سے مورخین تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ ادیب فن کی باریکیاں نکالتے ہیں۔ صوفیا سلوک کی راہیں ڈھونڈتے ہیں۔ موسیقار سُر دُھن کے انداز تلاشتے ہیں۔ اور وہ کا رانگنے مدداں ہستید

دانی کہ ہستم در جہاں، من خسرو شیریں بیاں
گر نائی از بہر دلم، بہر زبانِ من بیا

امیر خسرو قومی تقریبات کمیٹی کے صدر، اور اراکین اس بات کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کی اس عظیم شخصیت حضرت امیر خسرو کی حیات اور فن پر ایک سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار کے انعقاد کا اہتمام وگیان بھون نئی دہلی میں کیا جس میں سینکڑوں ملکی و غیر ملکی ادیب، دانشور اور رہنما شریک ہوئے۔ کمیٹی کے سرپرست اعلیٰ عزت مآب فخر الدین علی احمد صدر جمہوریہ ہند نے اس سیمینار کا افتتاح فرمایا جو بہت کامیاب رہا۔

ہمارا خیال تھا کہ ہم اس سیمینار کے مبارک موقعہ پر اوقاف کی اس اشاعت خاص کو قارئین کرام اور سیمینار کے شرکاء کی خدمت میں پیش کر سکیں گے مگر افسوس اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔

میں جناب حسن الدین احمد صاحب سکریٹری حضرت امیر خسرو قومی تقریبات کمیٹی کا شکر گذار ہوں۔ کہ آپ نے اوقاف کی خصوصی اشاعت حضرت امیر خسرو نمبر کے لئے ہمیں متوجہ کیا۔ اور اس کے لئے مضامین و تصاویر کا انتخاب و اہتمام بھی فرمایا۔

اوقاف میگزین کی یہ اشاعت خاص اپنے موضوع پر ہرگز کوئی معرکہ نہیں ہے۔ لیکن خضر راہ کا کام ضرور دے سکتی ہے۔ امید ہے کہ شائقین ہماری اس حقیر پیشکش کو قبول فرمائیں گے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ

امیر خسرو

ولادت و تعلیم

ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے لقب سے مشہور ہے۔ حضرت امیر خسرو اسی قبیلے سے ہیں۔ ان کے والد کا نام سیف الدین محمود ہے۔ ترکستان میں ایک شہر کش ہے۔ وہاں کے رہنے والے اور اپنے قبیلے کے رئیس تھے (فرشتہ)۔ اور دولت شاہ نے لکھا ہے بلخ کے امراء میں سے تھے۔ چنگیز خان کا فتنہ جب اٹھا تو سیف الدین ہجرت کرکے ہندوستان میں آئے اور سلطان محمد تغلق کے دربار میں ایک بڑے عہدہ پر مامور ہوئے۔ محمد تغلق ان کی بہت قدر و منزلت کرتا تھا۔ ایک مہم میں کفار سے لڑ کر شہید ہوئے۔[1]

لیکن صاحب بہارستان سخن تاریخی استدلال سے اس واقعہ کا ناممکن ہونا ثابت کرکے لکھتے ہیں۔

> پس آنچہ دولت شاہ در تذکرۂ خود نوشتہ کہ پدر امیر خسرو در
> درعہد سلطان محمد تغلق شہید شدہ و امیر خسرو را از حق دے معاند
> مرا است خلاف صریح و محض غلط است غالباً شاہزادۂ سلطان
> محمد شہید را کہ حاکم ملتان بود بعلت اشتراک اسمی محمد تغلق
> خیال کردہ۔

بہرحال سیف الدین کے تین بیٹے تھے۔ اعز الدین علی شاہ، حسام الدین اور امیر خسرو۔ سیف الدین کے انتقال کے وقت امیر صاحب کی عمر ۷ برس کی تھی۔ امیر صاحب کی والدہ عماد الملک کی بیٹی تھیں جو مشہور امرائے شاہی میں تھے اور دس ہزار فوج کے افسر تھے۔ امیر صاحب ۶۵[illegible]ھ میں بمقام پٹیالی[2] پیدا ہوئے تو امیر سیف الدین ایک خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے۔ مجذوب نے دور ہی سے دیکھ کر کہا کہ "وہ شخص آتا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائے گا"۔ مجذوب صاحب کے کمالات کا ہم انکار نہیں کرتے لیکن ان کے اس مذاق کا تسلیم کرنا مشکل ہے۔ خاقانی کو امیر خسرو سے کیا نسبت۔

جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے ان کو مکتب میں بٹھایا اور خوشنویسی کی مشق کے لئے مولانا سعد الدین خطاط کو مقرر کیا لیکن امیر صاحب کو تختی لکھنے کے بجائے شعر گوئی کی دھن رہتی تھی۔ جو کچھ موزوں ناموزوں کہہ سکتے تھے کہتے تھے۔ اور وصلیوں پر اسی کی مشق کرتے تھے۔ خواجہ اصیل کوتوال کے نائب تھے۔ وہ کبھی کبھی سعد الدین خطاط کو خطوط وغیرہ لکھوانے کو بلا لیا کرتے تھے۔ ایک دن بلایا تو امیر صاحب بھی ساتھ گئے۔ خواجہ اصیل کے مکان پر خواجہ عز الدین بھی تشریف رکھتے تھے۔ سعد الدین نے خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا ابھی سے کچھ موزوں کر لیتا ہے۔ معلوم نہیں کہ موزوں بھی کہتا ہے کہ نہیں، ذرا آپ اس کا کلام تو سن لیجئے۔ خواجہ عزیز کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض تھی۔ امیر صاحب کو دی کہ کوئی شعر پڑھو۔ امیر صاحب نے نہایت خوش الحانی سے پڑھا۔ چونکہ آواز میں قدرتی تاثیر تھی، لوگوں پر اثر ہوا۔ سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور سب نے تحسین کی۔ ان کے استاد نے کہا شعر گوئی میں امتحان لیجئے۔ خواجہ عز الدین نے چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا کہ ان کو ملا کر شعر کہو۔ مو۔ بیضہ۔ تیر۔ خربزہ۔ امیر صاحب نے برجستہ کہا۔

ہر موئے کہ در دو زلف آں صنم است
صد بیضۂ عنبریں برآں موئے ضم است
چوں تیر مداں راست دلش را زیرا کہ
چوں خربزہ دندانش درون شکم است[3]

---

[1] والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو باپ کے ساتھ ترکستان کے اطراف سے ہندوستان میں آئے اور پھر لکھتے ہیں کہ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو کی ماں حاملہ آئی تھیں امیر خسرو دہلی میں پیدا ہوئے لیکن پہلی روایت بظاہر صحیح ہے۔ تمام واقعات تاریخی سے ثابت ہے کہ خسرو ہندوستان زاد ہیں لیکن والہ داغستانی کو کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا شخص پیدا ہو۔

[2] پٹیالی ضلع ایٹہ کمشنری آگرہ میں چھوٹا سا قصبہ ہے۔ پہلے یہی مقام ضلع کا صدر تھا۔ اب ایٹہ ہے کسی زمانہ میں دریائے گنگ اسکے نیچے بہتا تھا اب کئی میلوں کا فاصلہ ہے۔ یہاں اب اسٹیشن بھی ہے۔

[3] جس نسخہ سے یہ رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا میں نے اسی طرح نقل کر دیا۔

خواجہ عزالدین کو سخت حیرت ہوئی۔ پوچھا نام کیا ہے؟ انھوں نے کہا خسرو۔ باپ کا نام پوچھا انھوں نے اصل نام کے بجائے قبیلہ کا نام بتایا یعنی لاچین۔ خواجہ صاحب نے ظرافت سے کہا لاچین یعنی بے چین نہیں" پھر کہا "ترک جلد باز" یعنی ان کو ترک کہا جاتا ہے؟ انھوں نے اسی عبارت کو الٹ کر کہا "بے جا طرب اسپ" یعنی قطعاً وہ ترک ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا یوں کہ تم کو دربار سلطانی سے تعلق ہے اس لئے تم کو سلطانی تخلص رکھنا چاہئے۔ چنانچہ تحفۃ الصغر کی اکثر غزلوں میں یہی تخلص ہے۔

امیر صاحب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر کی تحصیل تمام تھی لیکن تذکرہ نویسوں نے اس کے متعلق کچھ تفصیل نہیں لکھی۔ تاہم یہ قطعی ہے کہ ۱۵ یا ۲۰ برس کی عمر میں یہ تمام درسی علوم دینیوں سے فارغ ہو چکے تھے۔

درباری تعلقات

امیر خسرو صاحب سن رشد کو پہنچے تو دلی کے تخت پر سلطان غیاث الدین بلبن جلوہ افروز تھا۔ جو ۶۶۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تھا۔ اس کے امرائے دربار میں سے کشلو خاں معروف بہ چھجو سب سے بڑے رتبہ کا سردار تھا۔ وہ سلطان کا بھتیجا اور باربکی کے عہدے پر مامور تھا۔ فرشتہ میں لکھا ہے کہ مجلس آرائی اور جود و کرم کی وجہ سے حاتم کی طرح مشہور ہو گیا تھا۔ اور مصر۔ شام۔ روم۔ بغداد۔ عراق۔ خراسان۔ ترکستان وغیرہ سے اہل کمال اور شعرا اس کے دربار میں آتے تھے اور کامیاب ہو کر جاتے تھے۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ جو کچھ نقد اسباب سامان تھا سب لٹا دیا۔ یہاں تک کہ خود اس کے بدن پر پیرہن کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

امیر صاحب کو جیسا کہ غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے سب سے پہلے اس کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور دو برس تک اس کے دربار میں ملازم رہے چنانچہ اکثر قصیدے اس کی مدح میں لکھے ہیں۔ ایک قصیدہ میں مدح کی تمہید لکھتے ہیں۔

بود پنہاں آفتاب آں دم کہ صبح — ہمدمی با دعسر بو بود
صبح را گفتم کہ خورشیدت کجا است — آسماں روئے ملک چھجو نمود

امیر صاحب نے مثنوی نہ سپہر میں لکھا ہے۔

رتبہ یابان کسے کا ذکر کردبار — معز الدین بود سے کیقباد

لیکن اس سے کشلو خاں کی اولیت پر حرف نہیں آتا۔ کشلو خاں امرا میں سے تھا۔ بادشاہ نہ تھا اور تاجداروں میں سب سے پہلے جس نے امیر صاحب کی قدر دانی کی وہ معزالدین کیقباد تھا۔ امیر صاحب اکثر کشلو خاں کے دربار میں قصیدے لکھ کر لے جاتے اور مجلس گرم کر دیتے تھے۔

ایک دن اتفاق سے بغرا خاں (سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا) موجود تھا اور شعر و شاعری کے چرچے ہو رہے تھے شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر جو مشہور شعرا میں سے تھے وہ بھی حاضر تھے۔ امیر صاحب نے اپنی زمزمہ سنجی سے وہ سماں باندھا کہ بغرا خاں بہت متاثر ہوا اور صلہ کے طور پر طشت بھر کر روپے دیئے۔ کشلو خاں کو یہ ناگوار ہوا کہ اس کا وابستہ دولت دوسرے دربار کا احسان اٹھائے چہرہ سے ملال کے آثار ظاہر ہوتے۔ امیر صاحب نے اس کے بعد بار بار مختلف موقعوں پر اس کی تلافی کرنی چاہی لیکن کشلو خاں کے دل سے سایہ یاس نہ نکلا۔

بغرا خاں سامانہ کا حاکم تھا۔ امیر صاحب نے تنگ آکر چھجو سے علیحدہ ہو کر سامانہ کا قصد کیا۔ بغرا خاں نے نہایت قدر دانی کی اور ندیم خاص بنایا۔ اسی زمانہ یعنی ۶۷۸ھ میں لکھنوتی (بنگال) میں طغرل نے بغاوت کی اور شاہی لشکر کو بار بار شکستیں دیں۔ بالآخر سلطان غیاث الدین بلبن نے خود اس مہم پر جانے کی تیاریاں کیں اور بغرا خاں کو ساتھ لیا۔ امیر صاحب بھی اس سفر میں ساتھ گئے۔ سلطان غیاث الدین اس بغاوت کو فرو کر کے دہلی واپس آیا اور بنگال کی حکومت بغرا خاں کو عنایت کی۔ امیر صاحب کو اب زمانہ امن و اطمینان کا موقع حاصل تھا۔ دربار کے شعرا شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی ان کے قیام پر مصر تھے۔ لیکن وہ دلی کو بنگال کے معاوضہ میں نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ رخصت لے کر دلی میں آ گئے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں سلطان غیاث الدین کا بڑا بیٹا ملک محمد قاآن (مشہور بہ خان شہید) دلی میں آیا تھا۔ وہ نہایت فاضل۔ صاحب علم۔ منصف اور قدرداں علم و فن تھا۔ تہذیب و متانت کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی کبھی دن کا دن گذر جاتا تھا لیکن زانو نہیں بدلتا تھا۔ اس کی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ۔ دیوان خاقانی۔ انوری۔ خمسہ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ ایک بیاض جس میں اسے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کر کے درج کئے تھے۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ان اشعار کے حسن انتخاب پر امیر صاحب اور خواجہ حسن دہلوی بھی داد دیتے تھے۔ یہ خاص ایسی نادر چیز تھی کہ جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین نے اپنے خاص کتاب

---

۱ یہ تمام حالات امیر صاحب نے خود تحفۃ الصغر میں لکھے ہیں۔ ۲ چھجو خاں کا نام تاریخوں میں اس طرح مختلف لقب اور خطاب سے آتا ہے کہ دھوکا ہوتا ہے کہ ایک شخص نے کئی ہیں۔ امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ بیس بانکی رفاقت کے بعد سب سے پہلے خان معظم کشلو خاں عرف چھجو کے دربار میں پہونچا اس سے اس قدر ثابت ہوا کہ کشلو اور چھجو ایک ہی شخص ہیں۔ بدایونی (منتخب التواریخ جلد اول) میں ہے کہ چھجو آخر میں کڑہ مانک پور کے ساتھ سامانہ کا حاکم مقرر ہوا تھا۔ اور سلطان معز الدین کیقباد نے اس کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ فرشتہ میں لکھا ہے کہ علاء الدین محمد بن اخر الدین سلطان غیاث الدین بلبن کا برادر زادہ تھا۔ سلطان نے اس کو باربک مقرر کر کے خان اعظم کشلی خان کا خطاب دیا۔ بدایونی ص۱۹۴ میں ملک چھجو کو برادر زادہ سلطان غیاث الدین لکھ کر لکھا ہے کہ اس کو کشلو خاں خطاب ملا تھا۔ ان تمام عبارتوں کو ملاؤ تو ثابت ہو گا کہ علاء الدین کشلو خاں چھجو ایک ہی شخص ہیں۔

۳ یہ تمام حالات خود امیر صاحب نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھے ہیں۔ ۴ تاریخ فرشتہ ۵ امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں ان واقعات کو خود لکھا ہے۔ لیکن اس قدر پیچیدہ لکھا ہے کہ بڑی مشکل سے اور تاریخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے اصل حال کا پتہ چلتا ہے۔ اور ایک سخت تر یہ ہے کہ غرۃ الکمال کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ سخت غلط اور گویا بالکل مسخ ہے۔

دار امیر علی گوری۔ امیر علی کے بعد امیر صاحب کے ہاتھ آئی۔ اس باب ذوق اس کی نقلیں
لیتے تھے اور بیاضوں میں درج کر لیتے تھے۔ (تاریخ فرشتہ)

امیر صاحب کی شاعری کا شہرہ ہو چکا تھا۔ سلطان محمد نے اُن کو بلا کر ملتان میں داخل کیا۔ اور جب وہ ملتان کا حاکم مقرر ہو گیا تو ان کو اور ان کے ساتھ خواجہ حسن دہلوی کو بھی ساتھ لے گیا۔ پانچ برس تک یہ اس کے دربار میں رہے

اس زمانہ میں چنگیز خاں کا پوتا ارغو خان ایران کا حکمراں تھا۔ اس کے امراء میں سے تیمور خاں بیس ہزار سوار لے کر لاہور اور دیپالپور کو فتح اور غارت کرتا ہوا ملتان کی طرف بڑھا۔ سلطان محمد خان نے ملتان سے نکل کر تیمور خاں کو شکست دی لیکن جوش ظفر کی بنا پر بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک تالاب کے کنارے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ نماز میں مشغول ہوا۔ موقع پاکر تاتاریوں نے دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا۔ سلطان محمد نے انہی یاروں کے ساتھ نماز سے فارغ ہو کر تاتاریوں کا مقابلہ کیا اور کئی بار ان کو شکستیں دیں۔ لیکن آخر ان سے ایک تیر آکر لگا اور زخم کھا کر گر گیا۔[1]

امیر صاحب اور خواجہ حسن دہلوی بھی اس معرکہ میں شریک تھے چنانچہ تاتاری ان کو گرفتار کر کے لے گئے۔ یہ واقعہ ۶۸۳ھ میں پیش آیا۔ امیر صاحب نے نہایت پُراثر مرثیہ لکھے اور دلی بھیجے۔ مہینوں تک لوگ گھر گھر ان مرثیوں کے اشعار پڑھتے تھے اور اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے تھے۔ چند اشعار ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

واقعہ است ایں یا بلا از آسمان آمد پدید — آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید
راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ را — رخنہ کامسال در ہندوستان آمد پدید
مجلس یاراں پریشاں شد چو برگ گل ز باد — برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید
منکہ آب چشم حلقہ شد روان در عارضو — ہیچ آبے دیگر اندر رو ملتاں آمد پدید
جمع شد سیارہ در جسم مگر طوفاں شود — چوں بہ برج آبی انجم را قراں آمد پدید
من کہ ام حرحماں جمعیت ، اں کہ شود — خود محال است ایں کہ آں ملعون پدید شود
تیغ کافر کش برائے کشتن کافر کشید — پادشاہ عہد و بزرگ شاہ از ملتان لشکر کشید
آنکہ کافر بود لشکرے لشکر دیگر ہست — زانکہ رستم را نشاید مست لشکر کشید
چوں بہ تکبیر دید من از طمع مداں جوت کہ دلست — بے محابا چشم در سر کرد در اسب سر کشید
ملک تاتش ار ملتان تا لاہور اور قنادر — بیس اندر عہد من کافر تو اندر کشید
آنچناں تیغیں کم امسال خاک از خون ماں — کز زمیں باید شفق را گونہ احمر کشید
عہد در بن تدبیر ہوا آنکہ نے کہ تدبیر فلک — صورت تدبیر را خط مشیت در کشید

باچہ ساعت بود کہ کافر بر سر لشکر کشید
میگدر شد خوں جوں ار آب تا گہ درکشید

بہت بڑا مرثیہ ہے اور لڑائی کی تمام کیفیت لکھی ہے اخیر کے بند جہاں شاہزادہ کی شہادت کا ذکر ہے نہایت پُراثر ہیں۔

دو برس کے بعد امیر صاحب نے کسی طرح تاتاریوں کے ہاتھ سے رہائی پائی اور دلی میں آئے۔ خان شہید کے مرثیے پر جو لوحہ لکھا تھا غیاث الدین بلبن کے دربار میں جا کر پڑھا۔ دربار میں کہرام پڑ گیا کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ سلطان اس قدر رویا کہ بخار آگیا اور تیسرے ہی روز اسی صدمہ میں انتقال کر گیا۔

امیر دلی سے پٹیالی میں آئے اور گنگا کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔ ۶۸۶ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن نے وفات پائی اور درباریوں نے اس کے خلاف وصیت۔ اس کے پوتے کیقباد کو جو لڑکا جاہل کا بیٹا تھا تخت نشین کیا۔

کیقباد نے امیر صاحب کو دربار میں طلب کیا لیکن چونکہ عنان سلطنت ملک نظام الدین کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ امیر صاحب سے صاف نہ تھا۔ امیر صاحب نے تعلق پیدا نہ کیا اور خان جہاں جو امرائے شاہی میں تھا۔ اس کی ملازمت اختیار کی۔ حاتم خاں اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا اور امیر صاحب کو ساتھ لے گیا چنانچہ خود قران السعدین میں فرماتے ہیں۔

خان جہاں حاتم مفلس نواز — گشت با وطائع او قدم سرفراز
من کہ بدم جاکر او پیش از آں — کرد کرم آنچہ کند مثل ازاں
تا رجان بخشش خاطر رسید — مدہ شدہ لازمہ آں رکیب
در او دم بردہ ز لطف جہاں — کس کہ ز لطف تا بعاں
در اودہ ز لطف او ماہ وسال — ہیچ غم و نالہ بوزار مال

دو برس تک اودھ میں رہے۔ ان کی والدہ کو ان سے حد سے زیادہ محبت تھی وہ دلی میں تھیں۔ اور ان کے خطوط آتے رہتے تھے کہ میں تم سے دور زیادہ نہیں رہ سکتی۔ امیر صاحب کو بھی ماں سے بے انتہا محبت تھی۔ چنانچہ سب تعلقات چھوڑ کر دلی میں آئے۔ ماں نے گلے سے لگایا۔ اور آنکھوں سے محبت کے دریا بہائے

مادرم آں حسنۂ عمارم — چوں نظر افگند بہ دیدار من
پر دو از روئے شفقت اگر رفت — اشک فشاناں بدرم در گرفت

کیقباد جب سلطنت پر بیٹھا تو عیاشی اور رندی شروع کی۔ اس کا باپ نصیر الدین بغرا خاں بنگال میں تھا۔ یہ حالت سن کر بنگال سے روانہ ہوا۔ کیقباد نے نا اہلی سے باپ کا مقابلہ کرنا چاہا۔ چنانچہ ایک عظیم الشان فوج تیار کر کے دلی سے روانہ ہوا۔ راہ میں نامہ و پیغام ہوتے رہے۔ آخر صلح نامہ ہوا اور کیقباد دلی کو واپس گیا۔

امیر صاحب نے باپ بیٹے کے اتحاد اور مصالحت پر ایک قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں۔

زہے ملک خوش چوں دو سلطان یکے شہر — زہے مہر خوش چوں دو مہ ماں یکے شہ
پسر بادشاہ بے ۔ پدر پیر سلطاں — کنوں ملک میں چوں دو سلطان یکے سا
زہر جہانداری و پادشاہی — جہاں زادہ ما ، جہانباں یکے تد
یکے ناصر عہد محمود سلطاں — کہ فرمانش در چار ارکان یکے سا
دگر ستمعز جہاں کیقباد ے — کہ در مجلس ایران وتوراں یکے سا

[1] تاریخ فرشتہ [2] بدایونی صفحہ ۱۲۱

کیقباد چاہتا تھا کہ یہ واقعات نظم کے پیرایہ میں آئیں۔ امیر صاحب کو بلا کر خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ امیر صاحب نے چھ مہینے کی مدت میں قران السعدین لکھی جس میں باپ بیٹے کی مراسلات اور ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ اس وقت امیر صاحب کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور ۶۸۸ھ تھا چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

ساخته گشت از دورِ جامہ — از پسِ شش ماہ چنیں نامہ
در رمضان شد بسعادت تمام — یافت قران نامہ سعدین نام
آنچہ تاریخ ز ہجرت گذشت — بود سن شش صد و ہشتاد و ہشت
سال من از مرد را اگر بر رسی — راست بگویم بہ شش بود و سی

کیقباد عیاشی میں بیمار ہو کر تین برس حکومت کے بعد ۶۸۹ھ میں مر گیا یا مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا تین سالہ بیٹا شمس الدین کیکاؤس تخت نشین ہوا وہ بالکل بچہ تھا تین مہینے کے بعد امرائے دربار نے تخت سے اتار کر قید کر دیا۔ اب خاندان میں کوئی شخص دعویدار سلطنت نہیں رہا تھا۔ اس لئے ترکی امرائے دربار میں سے ملک فیروز شائستہ خاں خلجی جس کی عمر ۷۰ برس کی تھی۔ اور جس نے دربار میں بڑا اثر حاصل کیا تھا۔ تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اور سلطان جلال الدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ بڑے عظمت و اقتدار و جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی جامع صاحب کمال۔ رنگین طبع۔ خوش صحبت تھا شعر بھی کہتا تھا۔ چنانچہ بدایونی نے اس کے دو شعر بھی نقل کئے ہیں۔

آں زلفِ پریشانت ژولیدہ نمی خواہم — واں روئے چو گلزارت تفسیدہ نمی خواہم
بے پیرہنت خواہم یک شب بکنار آئی — باں تنگ قبا بستہ پوشیدہ نمی خواہم

احباب اور شریک صحبت بھی جس قدر تھے۔ سب فاضل۔ اہل فن موزوں طبع اور رنگین مزاج تھے۔ مثلاً ملک تاج الدین کرچی۔ ملک فخر الدین۔ ملک اعز الدین۔ ملک قرابیگ۔ ملک نصرت ملک مستب۔ ملک کمال الدین۔ ابوالمعالی۔ ملک امیر الدین کرانی۔ ملک سعد الدین۔ انیس اور ہم صحبت تھے۔

اسی طرح اکثر بڑے بڑے اہل کمال ندیمی کے لئے انتخاب کئے تھے چنانچہ تاج الدین عراقی۔ خواجہ حسن دہلوی۔ مؤید جاجرمی۔ مؤید دیوانہ۔ امیر ارسلان۔ اختیار الدین باغی۔ ندمائے خاص میں تھے۔ ساقی۔ مغنی۔ اور مطرب بھی وہ لوگ تھے مثلاً امیر خاصہ۔ حمید۔ راجہ۔ نظام۔ محمد شاہ۔ نصرخاں۔ بہروز۔

ایسے لوگوں صاحب مذاق بادشاہ کے دربار کے لئے امیر صاحب سے زیادہ کون موزوں ہو سکتا تھا وہ عالم بھی تھے۔ فاضل بھی۔ مغنی بھی۔ مطرب بھی۔ اور شاعر تو تھے ہی۔ معز الدین کیقباد کے زمانہ میں جب سلطان جلال الدین عارض تھا اسی وقت اس نے امیر صاحب کو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ چنانچہ معمول مشاہرہ مقرر کر کے خاص اسی لباس عطا کیا تھا تخت پر بیٹھا تو امیر صاحب کو ندیم خاص بنایا اور مصحف[2] داری اور طہارت کا عہدہ رہا۔ اس کے ساتھ جامہ اور کمر بند جو امرائے کبار کا مخصوص لباس تھا ان کے لئے مقرر کیا۔ امیر صاحب امیر کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے۔

امیر صاحب نے جلال الدین خلجی کے تمام فتوحات نظم کئے اور تاج الفتوح نام رکھا۔ اس کی تفصیلی کیفیت آگے آئے گی۔ جلال الدین خلجی کو اس کے بھتیجے سلطان علاء الدین خلجی نے ۶۹۴ھ میں دھوکے سے قتل کرا دیا۔ اور خود تخت نشین ہوا۔ سلطان علاء الدین نے اگرچہ دغا اور بے رحمی سے تخت سلطنت حاصل کیا تھا اور اگرچہ جہالت ولی اور سفاکی اس کی طبیعت کا جوہر تھا۔ تاہم بہت بڑے عزم و استقلال۔ شوکت و شان کا فرمانروا گذرا ہے بعض انگریز فتوحات اور انتظامی کارناموں کو چھوڑ کر علمی قدردانی بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ اس کا دربار زرنگار علماء و فضلاء شعراء سے ہر وقت معمور رہتا تھا۔ ان میں بعض کے نام حسب ذیل ہیں[3]۔

قاضی فخر الدین ناقلہ۔ قاضی فخر الدین کرمانی۔ مولانا نصیر الدین غنی۔ مولانا تاج الدین مقدم۔ قاضی ضیاء الدین۔ مولانا ظہیر الدین لنگ۔ مولانا ظہیر الدین بھکری۔ قاضی رکن الدین ناقلہ۔ مولانا شرکتی۔ مولانا نصیر الدین رازی۔ مولانا علاء الدین، مقدر تبریزی۔ مولانا اسراں بابک کلہ۔ مولانا حجت الدین ساوی۔ مولانا شمس الدین۔ مولانا صدر الدین۔ مولانا علاء الدین لاہوری۔ قاضی شمس الدین گازرونی۔ مولانا شمس الدین یحیی۔ مولانا شمس الدین۔ مولانا صدر الدین زادہ۔ مولانا معین الدین دہلوی۔ مولانا افتخار الدین رازی۔ مولانا میر الدین اندرپتی۔ مولانا نجم الدین۔ مولانا حمید الدین ملوری۔ مولانا علاء الدین کرک۔ مولانا حسام الدین سادہ۔ محی الدین کاشانی۔ مولانا کمال الدین کولوی۔ مولانا وجیہ الدین کابلی۔ مولانا مصباح الدین۔ مولانا نظام الدین کلالی۔ مولانا نصیر الدین کرہی۔ مولانا نصر الدین لوبی۔ مولانا علاء الدین تاجر۔ مولانا کریم الدین جوہری۔ مولانا محب ملتانی۔ مولانا حمید الدین۔ مولانا برہان الدین بھکری۔ مولانا افتخار الدین۔ مولانا حمید الدین ملتانی۔ مولانا نکل محمد شیرازی۔ مولانا حسام الدین سرخ۔ مولانا شہاب الدین ملتانی۔ مولانا فخر الدین لسوی۔ مولانا فخر الدین تقاملی۔ مولانا علیم الدین۔

قراء مولانا شاطبی۔ مولانا علاء الدین مقری۔ خواجہ زکی۔
واعظین مولانا حسام الدین درویش۔ مولانا شہاب الدین۔ مولانا اکرم۔
شعراء خواجہ حسن دہلوی۔ صدر الدین عالی۔ فخر الدین قواس۔ حمید الدین راجہ۔ مولانا عارف عبدالحکیم۔ شہاب الدین۔ لیکن امیر صاحب کے آفتاب کمال نے ان ستاروں کو بے نور کر دیا تھا۔

چنانچہ اس وسیع مرقع میں صرف امیر صاحب کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کے بعد اگر کسی کے حالات پائے جاتے ہیں تو وہ خواجہ حسن ہیں وہ بھی امیر صاحب ہی کا فیض ہے۔ علاء الدین نے امیر صاحب کا ایک ہزار سالانہ تنکہ[4] مقرر کیا تھا۔ امیر صاحب نے سلطان علاء الدین کی تمام فتوحات کو نہایت تفصیل سے لکھا جس کا نام خزائن الفتوح ہے تفصیل آگے آئے گی۔

۶۹۸ھ میں امیر صاحب کی والدہ اور ان کے بھائی حسام الدین نے انتقال

---

[1] تاریخ فرشتہ [2] جس کو قرآن مجید رکھنے کی خدمت سپرد ہوتی تھی اس کو مصحف دار کہتے تھے۔ [3] یہ فہرست بدایونی سے ماخوذ ہے [4] تاریخ فرشتہ۔ غالباً یہ طلائی سکہ ہوگا۔

دول رانی خضر خاں میں اس واقعہ کو نہایت پُر درد مرثیہ کی صورت میں لکھا ہے۔ نظامی کی پنج گنج کا جواب اسی زمانہ میں لکھا۔ چنانچہ سرگذشت سلطان علاء الدین کے نام سے مصنف ہے آخری مثنوی ہشت بہشت ہے جو ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی۔

اسی زمانہ میں امیر صاحب نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے ہاتھ پر بیعت کی تفصیل آگے آئے گی۔ سلطان علاء الدین نے ۲۱ برس حکومت کے بعد ۷۱۶ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا شہاب الدین (مدت حکومت ۳ ماہ) اور اس کے بعد ۷۱۶ھ میں قطب الدین مبارک بن علاء الدین خلجی بادشاہ ہوا۔ وہ اگرچہ نہایت عیاش بے مغز اور سنگدل تھا۔ لیکن امیر صاحب کی قدردانی سب سے بڑھ کر کی چنانچہ امیر صاحب نے جب ۷۱۸ھ میں اس کے نام پر مثنوی نہ سپہر لکھی تو ہاتھی برابر تول کر روپیہ دیا۔ خود امیر صاحب قطب الدین کی بابت لکھتے ہیں۔

تاریخ ہم چوں من اسکندرے — کند ہر کہ آرایش دفترے
رنج گراں مایہ بے شمار — دہم بار تنش بہ آں پیل بار
مرا خود دریں رہ بدر شد دلیل — کہ میداد زر ہم ترازوئے پیل
تا سدرہ کشتی خرد رہنموں — کہ از پیل ارسد در لشق فزوں
چو میراث شد پیل زر داد کم — بہ لر ماست زیں پیل زر داد کم
شہا گنج بخشا کرم گسترا — معانی شناسا سخن پرورا
چنیں بخششے کرد تو حکم یا فتم — دل ما بہ پیسہ کم یا فتم
کنوں لا بد از سر سخن چوں کشم — بہ اندازہ بخشش آمد سخن

قطب الدین خلجی نے ایک ہندو نومسلم غلام کو خسرو خاں کا خطاب دے کر تمام اختیارات عطا کیا تھا۔ اس نے ۷۲۱ھ میں قطب الدین کو قتل کر کے خود تخت حکومت پر جلوس کیا۔ یوں کہ اس نے دربار میں تمام ہندو بھر دیئے اور خاندان شاہی پر طرح طرح کے ظلم کئے۔ امراء نے بغاوت کی۔ چنانچہ چار مہینے کی حکومت کے بعد ۷۲۱ھ میں غازی ملک کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

اب خلجی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور امرائے دربار میں سے غازی ملک نے جس کا باپ سلطان غیاث الدین بلبن کا ترکی غلام اور ماں اس کی ہندنی تھی۔ دربار میں پکار کر کہا کہ مجھ کو تخت سلطنت کی آرزو نہیں۔ خاندان شاہی سے کسی کو تخت نشین کیا جائے۔ لیکن خلجی خاندان میں سے کوئی شخص باقی نہیں رہا تھا اور غازی کی صداقت کا تمام دربار معترف تھا۔ اس لئے سب نے متفقہ اسی کو بادشاہ بنایا۔ وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے نہایت عدل و انصاف سے حکومت کی اور بہت سی فتوحات حاصل کیں۔ تغلق آباد کا مشہور قلعہ اسی کی یادگار ہے۔ امیر صاحب کی اس نے نہایت قدردانی کی اور ان کو مال و دولت سے نہال کر دیا۔ امیر صاحب نے بھی اس کے احسانات کا حق ادا کیا۔ چنانچہ اس کے نام پر تغلق نامہ لکھا جو تغلق کے عہد حکومت کی مفصل تاریخ ہے۔

وفات، اعزہ و اولاد

تغلق نے جب بنگال کا سفر کیا تو امیر صاحب ساتھ گئے۔ تغلق واپس آیا لیکن ابھی وہیں رہ گئے۔ اسی اثنا میں خبر مشہور ہوئی کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے انتقال کیا۔ امیر صاحب یلغار کرتے ہوئے دہلی میں آئے۔ اور جو کچھ زر و مال پاس تھا خواجہ صاحب کے مزار پر نثار کر دیا۔ ماتمی سیاہ کپڑے پہن کر خواجہ صاحب کی تربت پر مجاور ہو بیٹھے چھ مہینے کے بعد ذیقعدہ ۷۲۵ھ میں انتقال کیا۔ خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میرے پہلو میں دفن کرنا۔ لوگوں نے اس وصیت کی تعمیل کرنی چاہی لیکن ایک خواجہ سرائے خود امارت کا منصب رکھتا تھا کہا کہ لوگوں کو دونوں قبروں کی تمیز کرنے میں دھوکا ہوگا۔ غرض خواجہ صاحب کی پائنتی دفن کیا۔ اور اس سے بڑھ کر ان کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی۔ ان کا مقبرہ مہدی خواجہ نے جو سلطان بابر کے امرا میں سے تھا تعمیر کرایا اور ملا شہاب معمائی نے تاریخ لکھ کر لوح پر کندہ کرائی۔

سید عدیم المثل کتاب تاریخ او — دادی ذکر سید طوطی شکر مقال

امیر صاحب کو خدا نے فرزندان معنوی کے علاوہ اولاد ظاہری بھی عنایت کی تھی۔ ان کے صاحبزادے کا نام ملک احمد ہے وہ شاعر تھے اور سلطان فیروز شاہ کے دربار میں ندیم تھے۔ ان کی شاعری نے چنداں رونق نہیں حاصل کی لیکن شعر اور شاعری کے دقائق سے خوب واقف تھے۔ اشعار کے عیب و ہنر کو خوب پرکھتے تھے اور نہایت نازک اور دقیق نکتے پیدا کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر اساتذہ کے اشعار پر جو حرف گیریاں کیں عموماً اہل فن اس کو تسلیم کرتے تھے۔ ظہیر کا شعر ہے۔

کلاہ گوشۂ حکم تو از طریق نفاذ — ربودہ امر گردوں کلاہ جباری

ملک موصوف نے ربودہ کو فگندہ سے بدل دیا جس سے مصرع کی ترکیب چست ہو گئی۔ بخیل کی ہجو میں مشہور شعر ہے۔

ایں بخیل بوئے گر بہ زر خویشتن — گر ناں حرام خواجہ آں را چکید ہے

ملک صاحب نے یوں اصلاح دی۔

ایں بخیل بود کہ آب حیات خواست — گر ناں خواجہ خواستی آں را چہ کہ

ناں کے ساتھ آب حیات کے مقابلے نے لطف پیدا کر دیا۔ ایک اور شعر تھا۔

گر تشنہ خواہد خاک درت را فلک مریخ — برج کہ بہر بطش خود دار فلکد

ملک موصوف نے پہلے مصرعہ کو یوں بدل دیا۔

گر لعل خواہد سنگ درت مشتری مریخ

لیکن افسوس یہ ہے کہ امیر صاحب کی یادگار سے ہم اس سے زیادہ توقع رکھتے تھے۔ بدایونی نے ان اصلاحوں کو نقل کر کے یہ لکھا کہ ملک احمد چونکہ خسرو کی یادگار تھے اس لئے بادشاہ اور درباری اس کو بھی امیر کا ترکہ سمجھتے اور غنیمت جانتے تھے۔

امیر صاحب کی ایک صاحبزادی تھیں لیکن سخت افسوس ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی ایسی بے قدری تھی کہ امیر کو ان کے پیدا ہونے کا رنج تھا۔ جب وہ سات برس کی ہوئیں تو امیر صاحب نے لیلیٰ مجنوں لکھی۔ اس میں صاحبزادی سے خطاب کرتے ہیں۔

اے رفعت نگنہ ربع نور — ہم عفیفہ نام و ہم مستور
کاش مادر تو ہم پسر بودے — در رحم طفل ہشت مہ بودے
لیک چوں زادہ خدا انگار است — با خداداد گاں ستیزہ خطاست

من پذیرفتم ای یزداں داد   کانچہ او داد باز خواہاں داد
پدرم ہم ز مادر است آخر   مادرم ہم ز دختر است آخر

چلئے آرزو کی ہے کہ کاش ہم پیدا نہ ہوتیں۔ یا ہوتیں تو بیٹی کے بجائے بیٹا ہوتیں پھر طرح طرح کی تاویلوں سے دل کو تسلی دی ہے کہ خدا کیے دیئے کو واپس لے سکتا ہے۔ اور آخر یہ ایسا ہم قطعہ رست سے ادا ہوا۔ اور میری ماں بھی تو آخر عورت تھی۔

صاحبزادی کو جو نصیحتیں کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی حالت بہت پست تھی۔ امیر صاحب اس قدر صاحب دولت و ثروت تھے۔ لیکن بیٹی سے کہتے تھے کہ چرخہ اور چرخہ کا سایہ چھوڑنا اور کبھی کوکھے سے پاس بیٹھ کر راہ گزر عمر یہ چھانکنا۔

دوک دستوری گذاشتن ز دست   کالت پردہ پوشی بدن است
تا بماں عاقبت سر زکس   روبہ دیوار و پشت بر در کس
در بساط رو رسید ہوش است   زود رسیدہ جسم سوزن توش است

امیر صاحب کو اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی۔ بڑے ہو کر بھی یہ حال تھا کہ وہ اس جوش محبت سے ماں سے ملتے تھے جس طرح چھوٹے بچے ماں سے لپٹ جاتے ہیں اور دودھ کی معمول ملاقات صرف اس سایہ چھوڑ دی کہ ماں زندگی میں بھی اور ان کو یاد کیا کرتی تھیں۔ اور دودھ سے جب زندگی میں آتے ہیں تو ماں سے ملنے کا حال اس جوش سے لکھا ہے کہ لفظ لفظ سے محبت کی شراب ٹپکتی ہے۔

ایک موقع پر جب ماں سے ملے ہیں اور ماں نے سینہ سے لگایا ہے تو ایک شعر بے اختیار زبان سے نکلا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ماں کا سینہ بہشت ہے۔ چنانچہ دو ہی برس زندہ کی اس میں جاری ہیں ۶۹۸ھ میں انھوں نے انتقال کیا۔ یہی نظموں میں دونوں کا مرثیہ ایک ساتھ لکھا ہے۔

امسال دو نور از اختر م رفت   ہم مادر و ہم برادرم رفت
یک ہفتہ بہ جست حصہ من   گم شد دو مہ دو ہفتہ من
محنت از دو شکنجہ داد بہم   برشد از دو طپانچہ کرد بجسم
ماتم دو شد و غم دو افسار   فریاد کہ ماتم دو افتاد
حیف است دو داغ خون سینہ را   یک شعلہ بس است خرمنہ را
یک سینہ دو بار برنگیرد   یک سر دو خمار برنگیرد
چوں مادر من بزیر خاک است   گر خاک بسر کنم چہ باک است
اے مادر من کجائی آخر   روئے از چہ نمی نمائی آخر
خنداں ز دل زمین برون آئے   بر گریہ زار من ببخشائے
ہر جا کہ ز پائے تو غبار سے   مارا ز بہشت یادگار یست
داں لوکہ حفظ جان من بود   نشت من و پشتبان من بود
روزے کہ لب تو در سخن بود   پند تو صلاح کار من بود
امروز منم و مہر تو بند   خاموشی تو ہمی دہد پند

فقر و تصوف

اٹھ بالس برس کی عمر میں ماں کو اس طرح یاد کرتے ہیں جس طرح کمسن بچہ ماں کے لئے بلکتا ہے۔ اس سے آگے بھائی کے مرثیہ کے شعر ہیں اور وہ بھی خون جگر سے لکھے ہیں۔

امیر صاحب اگرچہ خاندان کے اثر سے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اسی قسم کی زندگی بسر کرتے تھے جو تمام دنیا داروں کا طریقہ ہے لیکن یہ امر ان کی اصل فطرت کے خلاف تھا دربارداری، خوشامد اور تحسین پرستی سے ان کو طبعی نفرت تھی اور موقع بے موقع یہ خیالات بے اختیار ان کی زبان سے نکل جاتے تھے۔ لیلیٰ مجنوں ۶۹۸ھ میں لکھی تھی۔ جب ان کو سلطان علاؤالدین خلجی جیسے جبار بادشاہ سے تعلق تھا تاہم خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

شب تا سحر و ز صبح تا شام   در گوشۂ غم بگیرم آرام
تا شم ز برائے نفس خود راتب   نہ مستی خود و نہ شادہ زیاتے

اس پر مزید یہ ہوا کہ ان کے والد نے ان کو آٹھ برس کی عمر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے قدموں پر ڈال دیا تھا اور برکت کے لئے بیعت کرا دی تھی۔ حضرت خواجہ کی روحانی تاثیر جیسے جیسے اپنا کام کرتی جاتی تھی۔ امیر صاحب کی طبیعت میں عشق و محبت کا مادہ بھی ازلی تھا۔ وہ سراپا عشق تھے۔ اور یہ بجلی ان کی رگ رگ میں کوندتی پھرتی تھی۔ آخر یہ نوبت پہونچی کہ ۷۱۲ھ میں جیسا کہ خود افضل الفوائد میں لکھا ہے خواجہ صاحب کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کی۔ خواجہ صاحب نے چار گوشہ کی ٹوپی جو اس سلسلہ کی نشانی تھی عنایت کی۔ اور مریدان خاص میں داخل کیا۔ عبدالقادر نے طبقات السراج میں لکھا ہے کہ امیر صاحب نے جب خواجہ صاحب سے بیعت کی تو جو کچھ نقد اور اسباب تھا سب لٹا دیا اور بالکل دامن ہو کے بیٹھ گئے۔

خواجہ صاحب سے امیر صاحب کی ارادت اور عقیدت عشق کے درجہ تک پہونچ گئی تھی۔ ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ اور گویا ان کا جمال دیکھ کر جیتے تھے۔ خواجہ صاحب کو بھی ان کے ساتھ یہ تعلق تھا کہ فرمایا کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو خسرو کو پیش کروں گا۔ دعا مانگتے تھے تو خسرو کی طرف اشارہ کر کے فرماتے تھے الٰہی بسوز سینہ این ترک مرا بخش۔

ایک دفعہ خواجہ صاحب لب دریا ایک کوٹھے پر بیٹھ کر ہندوؤں کی عبادت اور اشنان کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ امیر خسرو صاحب بھی حاضر تھے خواجہ صاحب نے فرمایا دیکھتے ہو

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اس وقت خواجہ صاحب کی ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی امیر صاحب نے اس کی طرف اشارہ کر کے برجستہ کہا۔

ما قبلہ راست کردیم بر طرف کج کلاہے

جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ میری مجلس میں قوال یہ شعر گا رہے تھے۔ میں نے اس کا شان نزول پوچھا۔ ملا علی احمد مہرکن نے واقعہ بیان کیا مصرع آخر کے ختم ہوتے ہوتے ملا کی حالت بدلنی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ غش کھا کر گرے۔ دیکھا تو دم نہ تھا۔[1]

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۸ - مطبوعہ علی گڑھ

خواجہ صاحب نے امیر صاحب کو ترک اللہ کا خطاب دیا تھا۔ اور اسی لقب سے پکارتے تھے۔ امیر صاحب نے جابجا اس پر فخر کیا ہے۔ چنانچہ ایک قصیدہ میں خواجہ صاحب کی مدح میں یہ فرماتے ہیں۔

پیر ما ہست خواجہ چون خطاب بندہ ترک اللہ شد   ہست ترک اللہ گر دم ہم بہ ایشان سپار

خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میری قبر کے پہلو میں دفن کرنا۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایک قبر میں دو انسانوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی ہی قبر میں ان کو بھی دفن کراتا۔

امیر صاحب نے تصوف میں جو مدارج حاصل کئے ان کو نہ ہم جان سکتے ہیں اور نہ بیان کر سکتے ہیں۔ یہ البتہ نظر آتا ہے کہ امیر صاحب کا ہر ہر جز جلیاں کراتا ہے وہ اسی وادی عشق کی سرشاریاں ہیں۔

امیر صاحب کی صوفیانہ زندگی کا ایک بڑا واقعہ حسن دہلوی کے تعلقات ہیں۔ حسن نہایت صاحب جمال تھے اور نان بائی کا پیشہ کرتے تھے۔ امیر صاحب کا اس طرف گزر ہوا۔ اتفاق تھا کہ ایک دن اتفاق سے ان کی دوکان کے سامنے سے گزرے۔ آنکھ حسن کی صاحب ان پر بھی پڑی۔ وہیں ٹھہر گئے اور پوچھا کس حساب سے روٹی بیچتے ہو۔ حسن نے کہا کہ ایک پلڑے پر روٹی رکھتا ہوں اور خریدار سے کہتا ہوں کہ دوسرے میں سونا رکھئے۔ سونے کا پلہ جھک جاتا ہے تو روٹی حوالہ کر دیتا ہوں۔ امیر نے کہا اور خریدار مفلس ہو۔ حسن نے کہا تو سونے کے بدلے دیدار اور نیاز لیتا ہوں۔ اس انداز گفتگو نے امیر صاحب کو اور بھی بے اختیار کر دیا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا۔ حسن نے گو اولیاء کی نظر نہیں لگی لیکن وہ بھی شکار ہو گئے۔ اسی وقت دوکان بند کر کے خواجہ صاحب کی خدمت میں جا پہنچے اور اپنے ذل دادہ (امیر خسرو) سے ملے۔ اسی تعلق سے خواجہ صاحب کی خدمت میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔[1]

امیر صاحب سے اس قدر تعلقات بڑھے کہ دونوں ایک دم کے لئے بھی جدا نہیں ہوتے تھے۔ امیر صاحب نے جب خان شہید کی ملازمت کی تو حسن بھی ساتھ ملازم ہوئے۔ چنانچہ جب ملتان میں خان شہید کو تاتاریوں نے ہلاک کیا تو امیر صاحب کے ساتھ حسن بھی اس موقع پر موجود تھے۔ دونوں کے تعلقات کا چرچا زیادہ پھیلا تو لوگوں نے خان شہید سے شکایت کی۔ امیر صاحب نے اس واقعہ پر غزل لکھی۔

زیں دل خود کام کار من۔ برسوائی کشید   حسن فریاں دل برین نہیں بار آورد

خان شہید نے بدنامی کے خیال سے حسن کو امیر صاحب کے ملنے سے منع کر دیا۔ لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ خان شہید نے غصہ میں آکر حسن کے ہاتھ پر کوڑے لگوائے۔ حسن سیدھے امیر صاحب کے پاس گئے۔ خان شہید کو اسی وقت خبر ہو گئی۔ نہایت متحیر ہوا اور امیر صاحب کو بلوا بھیجا۔ آئے تو کہا کیا حالت ہے؟ امیر نے آستین سے ہاتھ نکال کر دکھایا اور کہا۔

گواہ عاشق صادق در آستین باشد

دیکھا تو جہاں حسن کے کوڑے لگے تھے وہیں امیر صاحب کے ہاتھ پر بھی کوڑے کے نشان تھے۔[2]

چونکہ حسن کا تذکرہ ہم الگ نہیں لکھتے۔ اور صرف غزل پر ان کا احسان ہے۔ اس لئے ان کے چند اشعار۔ امیر صاحب ہی کے تذکرہ میں انتخاب کرتے ہیں۔

خلق گوید۔ دل از صبر۔ بجا آور یار   اے دل۔ از صبر تسلی دہ اگر جائے ہست
اے کہ نظارہ دیوانہ نگردی ہرگز   قدمے رنجہ کن ایں سوئے کہ دیوانہ

بر جوں تو کسے دگر گزیدن   کارے دگر ست کار من نیست
گفتی کہ چرا جدائی از من   ایں از ملک است۔ از حسن نیست

یار اس دلم سوئے دلارام مرود   از دام جست۔ باز سوئے دام مرود
ایام در یاد تو باما بدوستی   وان خوش ہم بہ سیرت ایام مرود

اے خواجہ! در محلہ تقوی مقام گیر   در کوئے عاشقی نتوان نیکنام شد
عقلم کہ در پی ز اہل ایام می نہاد   آخر شکار دانہ عشق تو رام شد

طرفہ سر و کارے است کہ با دلبر معشوق   صابر نتوان بود و تقاضا نتوان کرد

از حسن ایں چہ سوال است کہ معشوق تو کیست   ایں سخن را چہ جواب است تو ہم میدانی

دوست یار آئی گفتم کہ مرا ہیچ نساں   رشتہ تعلق۔ شاید کہ ازیں بہانہ گیرم

ہیچ کردم حیایاں را جواب   زاں دعا ہائے کہ مستجاب نبود
اے حسن بار کرد خطائے کرد   ہم شکایت از دو صواب نبود

بہ تقوائے نام نیکو بردہ بودم   نکورویان۔ مرا بدنام کردند
گفتی کہ چرا حال دل خویش نگوئی   من خود کہ ام آخر نہ پایان کر رسانند؟

---

[1] واقعہ اکثر تاریخوں اور تذکروں میں منقول ہے۔ لیکن صاحب بہارستان سخن نے اس کی معقول بنا پر تکذیب کی ہے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی یہ عبارت نقل کی ہے قیاس چناں نمی آید کہ حسن را نسبت امیر خسرو گو۔ نقدم باشد۔ چہ میر حسن را در مدح سلطان غیاث الدین بلبن قصائد غراست در کلام امیر خسرو در مدح سلطان کیقباد بقدر یافت شد۔

[2] یہ تمام واقعات فرشتہ نے امیر خسرو کے تذکرہ میں لکھے ہیں۔ لیکن آخر کا واقعہ آج کل کون تسلیم کرے گا۔

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو سوز و گداز اور درد و اثر ان کے کلام میں موجود ہے ان کے کتنے حصے (امیر صاحب) میں بھی ہیں۔

جامعیت کمالات

ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا۔ اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع۔ ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہوں گے۔ صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔ فردوسی۔ سعدی انوری۔ حافظ۔ عرفی۔ نظیری نے ہفت اقلیم سخن کے علم دیکھے ہیں۔ لیکن ان کی حدود حکومت۔ ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا۔ حافظ عرفی۔ نظیری غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ لیکن امیر صاحب کی جہانگیری میں غزل مثنوی قصیدہ۔ رباعی سب کچھ داخل ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے خطۂ ہائے سخن یعنی نظمیں۔ مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ساٹھ ہزار ہے۔ صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہے ہیں۔ لیکن امیر صاحب کا کلام بھی لاکھ سے کم نہیں۔ اکثر تذکروں میں خود امیر صاحب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے۔ لیکن اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے۔ امیر صاحب نے ابیات کا لفظ لکھا ہے اور ہندی کے محاورے میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں۔ چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جا بجا نظر آتی ہیں کہ اس قدر ... متن ہیں۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرۂ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر صاحب کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اسی قدر برج بھاشا میں ہے۔ کس قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں۔

مختلف زبانوں کی زبان دانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے عربی میں اہل عرب کے ہمسر ہیں۔ سنسکرت کے ماہر ہیں۔ چنانچہ مثنوی نہ سپہر میں تو ضمنی کے طور میں اس کا ذکر کیا ہے۔

جس قدر نے نثر نویسی کا رشدم

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے۔ اس وقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے نہیں مرتب کئے تھے۔ انہوں نے ایک مستقل کتاب اعجاز خسروی تین جلدوں میں لکھی۔ اور اگر چہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور صنائع و بدائع پر بیکار گیا۔ لیکن ان کی طباعی اور دراحت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب۔ ان کے بعد آج تک پھر کوئی شخص حاصل نہ کر سکا۔ چنانچہ اس کی تفصیل مستقل عنوان میں آئی ہے۔

ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر و تصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالم قدس کے سوا دنیائے مادی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا چنانچہ اس کا ذکر بھی الگ عنوان میں آئے گا۔

ان سب باتوں کے ساتھ جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ ان کاموں میں مشغول ہونے کے لئے وقت کس قدر ملتا تھا۔ تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے اور درباروں میں تمام دن حاضری دینی پڑتی تھی۔ یہ کام جو سر دست تھا۔ وہ شاعری نہ تھی بلکہ اور اشغال تھے۔ پیلے گھوڑوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

مسکین من بستہ دل مدہوش	از شوخی چو دیگ پر جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام	در گوشۂ غم نگیرم آرام
باشم ز برائے نفس خود رائے	پیش چو خودے ستادہ بر پائے

یعنی نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے صبح سے شام تک مودب کھڑا رہتا ہوں۔

تا خوں نہ رود ز پائے تا سر	دستم نہ شود ز آب کس تر

جب تک پاؤں کا پسینہ سر تک نہیں پہنچا۔ کھانا کھانے کو نہیں ملتا۔

ان حالات کے ساتھ اگر صانع قدرت ان کے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چنداں نا موزوں نہ ہوگا۔

کمال موسیقی

امیر صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے اس نازک اور لطیف فن پر بھی توجہ کی اور اس درجہ تک پہنچایا کہ چھ سو برس کی وسیع مدت نے بھی ان کا جواب پیدا نہ کیا۔ ان کے زمانہ کا مشہور سنگیت استاد جو تمام ہندوستان کا استاد تھا نایک گوپال تھا۔ اس کے بارہ سو شاگرد تھے جو اس کے سنگھاسن یعنی تخت کو کہاروں کی طرح اٹھا کر لے چلتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے اس کے کمال کا شہرہ سا تو دربار میں بلایا۔ امیر صاحب نے عرض کی کہ میں تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھتا ہوں۔ نایک گوپال سے گانے کی فرمائش کی جائے۔ نایک نے چھ مختلف جلسوں میں اپنا کمال دکھایا۔ ساتویں دفعہ امیر صاحب بھی اپنے شاگردوں کو لے کر دربار میں آئے۔ گوپال بھی ان کا شہرہ سن چکا تھا۔ ان سے گانے کی فرمائش کی۔ امیر صاحب نے کہا مغل ہوں۔ ہندوستانی گانا یوں ہی سا جانتا ہوں۔ پہلے آپ کچھ سنائیں تو میں بھی کچھ عرض کروں گا۔

گوپال نے گانا شروع کیا۔ امیر صاحب نے کہا یہ راگ تو مدت ہوئی میں باندھ چکا ہوں۔ پھر خود اس کو ادا کیا۔ گوپال نے دوسرا راگ شروع کیا۔ امیر صاحب نے اس کو بھی ادا کر کے بتایا کہ مدتوں پہلے میں اس کو ادا کر چکا ہوں۔ غرض گوپال جو راگ راگنی اور سُر ادا کرتا امیر صاحب اس کو اپنا ایجاد ثابت کر جاتے تھے۔ بالآخر کہا کہ یہ تمام بازاری راگ تھے۔ اب میں اپنے خاص ایجادات سناتا ہوں۔ پھر جو گانا شروع کیا تو گوپال .. .. مبہوت ہو کر ....

راگ گیا [1]

امیر صاحب چونکہ ہندی کے ساتھ فارسی راگوں سے واقف تھے اس لئے انھوں نے دونوں موسیقی کو ترتیب دے کر ایک نیا علم پیدا کر دیا۔ چنانچہ ان کے ایجاد کردہ راگ حسب ذیل ہیں [2]

مجیر — غار اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے

سازگری — پوربی، گورا، کنگلی، ایک فارسی راگ۔ قران السعدین میں اس کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

نوزنہ سازگری در عراق کردہ … اتفاق

ایمن — ہنڈول اور نیریز

عشاق — سارنگ اور بسنت اور نوا

موافق — ٹوڑی، مالوی، دوگاہ، حسینی

غنم — پوربی میں ذرا تغیر کر دیا ہے۔

زیلف — کھٹ راگ میں شاناز کو ملایا ہے۔

فرغنہ — کنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ہے۔

سرپردہ — سارنگ، بلاول اور راست کو ترکیب دیا ہے۔

باخرز — دیسکار میں ایک فارسی راگ ملا دیا ہے۔

فردوست — کانہڑا، گوری، پوربی اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے۔

منم — کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ہے۔

راگ درپن میں لکھا ہے کہ ان راگوں میں سازگری، باخرز، عشاق اور موافق میں موسیقی کا کمال دکھایا ہے۔ باقی راگوں میں کچھ یوں ہی ادل بدل کر کے دوسرا نام رکھ دیا ہے۔ قول، ترانہ، خیال، نقش، نگار، بسیط، تلانہ، سوہلے۔ یہ سب بھی امیر صاحب کی ایجاد ہیں۔ ان میں سے بعض خاص ان کی ایجاد ہیں۔ بعض کے نام ہندی میں پہلے موجود تھے۔ امیر صاحب نے ان میں کچھ تصرف کر کے نام بدل دیا۔

تصانیف

جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ امیر صاحب نے ۹۲ کتابیں تصنیف کیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ امیر صاحب نے خود کسی کتاب میں تحریر کی ہے کہ میرے اشعار پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ ہیں۔

امیر صاحب کی کثرت تصنیف سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن یہ بیان مبالغہ سے خالی نہیں۔ چار پانچ لاکھ اشعار کی یہ کیفیت ہے کہ قدیم زمانہ میں سطر کو بیت کہتے تھے۔ اور یہ استعمال نہایت کثرت سے مروج ہے۔ اس بنا پر ان کی ہر قسم کی تصانیف کی ۴ - ۵ لاکھ سطریں ہوں۔ تو چنداں تعجب نہیں۔ لوگوں نے بیت اور شعر کو مترادف سمجھ کر بیت کی جگہ شعر لکھ دیا۔ ہندی کلام مدون نہیں ہوا۔ اس لئے مبالغہ کے لئے کافی موقع ہے۔ بہرحال جس قدر تصنیفات آج ملتی ہیں وہ بھی کم نہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

دیوان تحفۃ الصغر [3] — اس کے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ یہ سب سے پہلا دیوان ہے جس میں ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے۔

دیوان وسط الحیات — اس میں ۲۰ برس کی عمر سے ۳۲ یا ۳۴ برس تک کلام ہے۔ اس میں جو قصائد ہیں سلطان محمد خان وغیرہ کی مدح میں ہیں۔

غرۃ الکمال — یہ دیوان اپنے بھائی علاء الدین علی خطاط کے اصرار سے مرتب کیا ہے۔ ۳۴ برس کی عمر یعنی ۶۸۵ھ سے تقریباً ۶۹۵ھ تک کا کلام ہے دیباچہ میں مختصر سی سوانح عمری لکھی ہے۔ سلطان معز الدین اور جلال الدین خلجی کے مدحیہ قصائد ہیں۔ … میں اس کی ترتیب دی اور دیباچہ لکھا۔

بقیہ نقیہ — بڑھاپے کا کلام ہے۔ تاریخ تالیف مذکور نہیں لیکن سلطان علاء الدین خلجی کا مرثیہ اس میں موجود ہے اس لئے کم از کم ۷۱۵ھ کے بعد تک کا کلام ہے۔

نہایۃ الکمال — پانچواں دیوان ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی المتوفی ۷۲۰ھ

---

[1] عالمگیری علماء میں فقیر اللہ جس کا لقب سیف خان تھا۔ ایک مشہور امیر تھا۔ عالمگیر نے اسی کی شان میں کہا ہے رنگ گفتگوئے طوطی از آئینہ می خیزد مگر با قد سیف خان راقص را نسبت۔ وہ موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ فن موسیقی کی ایک مستند کتاب مانک سوہل بھی فقیر اللہ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا اور بہت سے فوائد اضافہ کئے اور اس کا نام راگ درپن رکھا۔ مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۹ ۴ مطبوعہ کلکتہ میں تفصیل مذکور ہے۔ اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس ہے اور ایک ندوہ کے کتب خانہ میں ہے گوپال کا واقعہ اور آمدہ امیر خسرو کی ایجادات میں نے اسی نسخہ سے لئے ہیں۔

[2] راگ درپن کے دو نسخے جو میرے استعمال میں ہیں دونوں غلط ہیں اس لئے راگوں کے نام صحیح نہیں پڑھے گئے۔ اس لئے کہیں کہیں میں نے صرف صورت نویسی کر دی ہے۔

[3] امیر صاحب نے اپنے چاروں دیوانوں کے دیباچوں میں تصنیف کے متعلق کچھ حالات بھی لکھے ہیں تحفۃ الصغر اور غرۃ الکمال کا دیباچہ اس وقت میرے پیش نظر ہے اور نہایۃ الکمال کے دیباچہ بھی نظر سے گذر رہے ہیں لیکن اس وقت سامنے نہیں۔ اس لئے ان کی نسبت جو کچھ لکھا ہوں وہ ڈاکٹر نور (آر۔ آئی۔ ای۔ ڈی) کے انگریزی سے ماخوذ ہے جو انھوں نے سالار جنگ میوزیم کے کتب خانے کی فہرست میں لکھے ہیں۔ اس اطلاع کے متعلق میں مولوی عبدالقادر پروفیسر نور کالج کا ممنون ہوں۔

مرثیہ اور ان کے دلسوز بین کی مدحیں ہیں۔ ایک قطعہ میں ۶۷۵ھ کا ایک واقعہ مذکور ہے اور اسی سن کا حساب امیر خسرو نے استعمال کیا ہے۔

قران السعدین سب سے پہلی مثنوی ہے ۶۸۸ھ میں جب کہ مصنف کی عمر ۳۶ برس کی تھی لکھی۔ کیقباد اور بغرا خاں کے مراسلات اور صلح و ملاقات کا حال ہے۔

مطلع الانوار مخزن الاسرار کا جواب ہے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر لکھی۔ ۳۳۱۰ شعر ہیں۔ دو ہفتہ میں تمام ہوئی۔ سال اختتام ۶۹۸ھ ہے تصوف کے مضامین ہیں اور پنج گنج کے سلسلہ کی پہلی کتاب ہے۔

شیریں خسرو رجب ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی۔ ۴۱۲۴ شعر ہیں

سکندر نامہ کا جواب ہے۔ سال اختتام ۶۹۹ھ ہے۔ اشعار کی تعداد ۴۴۴۰۔

لیلیٰ مجنوں ۲۶۶۰ شعر ہیں ۶۹۸ھ میں ختم ہوئی۔

ہشت بہشت سلسلۂ پنج گنج کی سب سے آخر مثنوی ہے یعنی ہفت پیکر نظامی کا جواب ہے۔ ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی ۳۳۸۲ شعر ہیں۔

پورا خمسہ سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر ہے کل ۱۸ ہزار شعر ہیں۔ خمسہ نظامی میں ۲۸ ہزار شعر ہیں۔ پانچوں کتابیں دو برس کی مدت میں تمام ہوئیں۔

تاج الفتوح سلطان جلال الدین فیروز شاہ کی تخت نشینی کے سال اول یعنی ۶۸۹ھ سے جمادی الآخر ۶۹۰ھ تک کے حالات ہیں۔ اور اسی سنہ میں یہ مثنوی تمام بھی ہوئی۔ مطلع یہ ہے۔

سخن بر نام شاہے کردم آغاز

نہ سپہر قطب الدین خلجی کے نام پر ہے نو باب ہیں اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے اس مناسبت سے نہ سپہر نام رکھا ہے۔ اس وقت امیر خسرو کی عمر ۶۵ برس کی ہو چکی تھی۔ ۷۱۸ھ میں تمام ہوئی۔

دول رانی اور خضر خاں دیول رانی۔ گجرات کے راجہ کی لڑکی تھی۔ خضر خاں سلطان علاء الدین کا بیٹا تھا۔ وہ دیول رانی پر عاشق ہو گیا تھا اور اس سے شادی کی خضر خاں نے خود یہ حالات بطور یادداشت کے لکھے تھے اس کی فرمائش سے امیر صاحب نے اس کو نظم کا لباس پہنایا اور عشقیہ نام رکھا۔ چار مہینے میں تمام ہوئی۔ ۴۲۰۰ شعر تھے۔ خضر خاں کے مرنے پر دولرانی کو جو واقعات پیش آئے ان کو لکھا تو ۳۱۹ شعروں کا اضافہ ہوا ۷۱۵ھ میں تمام ہوئی۔

افضل الفوائد خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ہیں۔

اعجاز خسروی نثر نویسی کے اصول اور قواعد منضبط کئے ہیں اور سیکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں۔ ۷۱۹ھ میں تمام ہوئی تھی پانچ جلدوں میں ہے۔

تغلق نامہ غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات ہیں

خزائن الفتوح سلطان علاء الدین کے فتوحات ہیں۔

مناقب ہند تاریخ ہند

ان کتابوں کا ذکر دولت شاہ نے کیا ہے۔ دولت شاہ نے لکھا ہے کہ ان تصنیفات کے علاوہ فن حساب۔ اور فن موسیقی میں بھی ان کی تصنیفیں ہیں۔

شاعری

امیر صاحب اگرچہ ہندی نژاد تھے لیکن ایرانی شعرا کو بھی ان کی شاعری اور زبان دانی کا اعتراف کرنا پڑا۔ جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ خمسہ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا طوطی ہند خود ان کا خطاب تھا۔ ایرانی بھی اسی خطاب سے ان کو یاد کرتے ہیں۔

غزل

ز روح خسرو ازیں پارسی شکر دادم — کہ کام طوطی ہندوستاں شود شیریں

خواجہ حافظ

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

آذری نے جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی شیرازی خسرو سے ملنے کے لئے شیراز سے دہلی میں آئے۔ اگرچہ یہ روایت قرین قیاس نہیں۔ اور بعض تذکرہ نویسوں نے صراحۃً اس واقعہ سے انکار کیا ہے تاہم اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ آذری کے نزدیک خسرو اس پایہ کے شخص تھے کہ سعدی کا ان کی ملاقات کے لئے سفر کرنا ممکن تھا۔ اور اس قدر تو تمام تذکرہ نویسوں کو تسلیم ہے کہ جب سلطان شہید نے سعدی کو شیراز سے بلایا تو انہوں نے بڑھاپے کا عذر کیا اور لکھ بھیجا کہ خسرو کی ہر حال میں ان کی تربیت کی جائے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۲ برس سے زائد تھی۔

تاہم بعض بعض ایرانی شعرا قومی تعصب کو چھپا نہیں سکے۔ چنانچہ ایک شاعر جو امیر کا معاصر ہے کہتا ہے۔

غلط استاد خسرو زاں خامی — کہ سکباجے بہ رونگ نظامی

امیر صاحب کی شاعری قدرتی تھی۔ وہ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوئے تھے ان کے باپ دادا۔ شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ قلم کے بجائے تیغ سے کام لیتے تھے۔ تاہم امیر کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے کہ ان کی زبان سے بے اختیار شعر نکلتے تھے دیباچۂ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں۔

ہم دوران صغرسن کہ دنداں می افتاد سخن می گفتم، گوہر از دہانم می ریخت ”

دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

نہ بود مرا اُستادے کہ سرآمدہ بر سر سایہ بودے کہ بر سر رو فائق ذال شدے

تا بوئے مشکل از قلم بار از سواد خطا بار آوردے ”

ایک مدت تک یوں ہی بطور خود کہتے رہے۔ استاد کے بجائے اساتذہ کے دیوان کو سامنے رکھ کر ان کا تتبع کرتے تھے۔ جس دیوان کا مطالعہ کرتے تھے اسی انداز پر کہنا شروع کر دیتے۔ جامی کا کلام دیکھا تو سب سے الگ نظر آیا۔ اس کے الفاظ مل گئے لیکن جو دیباچہ تحفۃ الصغر میں لکھے ہیں کہ اس کا تتبع نہ ہو سکا بلا زور ان الکل بے اصلاحی ہے۔ امیر صاحب اس کو مرتب کرانا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن بھائی کی خاطر سے مجبور ہو گئے۔

لیکن بالآخر وہ اپنا کلام اساتذہ کو دکھلانے لگے۔ ہشت بہشت کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ کتاب شہاب کی اصلاح یافتہ ہے۔ شہاب کی پہلے بہت تعریف کی ہے پھر لکھتے ہیں۔

من کہ دعوی کردہ نامۂ خویش	از پی اصلاح راند خامۂ خویش
دید ہر نکتہ را رقم بہ رقم	ریخت بر او نہاد دوست بہ ہم
نظرے برکرد و موئے شگاف	بے بہ عمیا نظارۂ نگذاف
این دقائق کہ بد مقرر پوست	موبمو تحریر کردۂ اوست
شمع من یافتہ ضیا از وے	مس من گشتہ کیمیا از وے
ہرچہ انگشت من نہادم گوش	برکشادم مگس زشرم نوش
وانچہ بود و من نجستم پیے	عیب آن بر من ست نہ بر وے
یارب او چون بہ نیم نامۂ من	بُرد بیرون خطائے خامۂ من
نامۂ او کہ حرز جانش باد	در قیامت خط امانش باد

اخیر کے شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچوں مثنویاں شہاب کی اصلاح دیدہ نہیں۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امیر صاحب ایسے معتقد نہ تھے جہاں اُن کو اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی وہاں اُستاد کی رائے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ گو ادب کا پاس اب بھی ملحوظ رکھتے تھے۔

عیب آن بر من ست نہ بر وے

کیا عجیب بات ہے۔ وہ اُستاد جس کے دامن تربیت میں آپ جیسا شخص پل کر بڑا ہو۔ آج اس کا نام و نشاں تک معلوم نہیں۔

معاصر استادوں کے علاوہ امیر صاحب نے قدیم اساتذہ سے بھی بہت فیض حاصل کیا ہے وہ اُن کے کلام کو سامنے رکھ کر کہتے تھے اور اسی طرح اُس سے فائدہ اٹھاتے تھے جس طرح کوئی شاگرد زندہ استاد سے شاعری سیکھتا ہے۔ اسی بنا پر لیلیٰ مجنوں میں نظامی کی نسبت لکھتے ہیں۔

زندہ است معنی او بنظامم   در پیش نقش حیات دادم

شیخ سعدی سے استفادہ کا اشارہ کرتے ہیں

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت   شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ امیر صاحب جوانی کے جوش میں اکثر اساتذہ کی شان میں گستاخی کرتے تھے۔ چنانچہ جب مطلع الانوار لکھتے ہوئے یہ شعر کہا۔

کوکبۂ خسروم شد بلند   زلزلہ در گور نظامی فگند

تو غیب سے ایک تلوار نکلی اور خسرو کی طرف بڑھی۔ خسرو نے خواجہ نظام الدین اولیا کا نام لیا۔ دفعۃً ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے اس تلوار کے سامنے کر دی تلوار اس کو کاٹتی ہوئی ایک سری کے درخت پر جا لگی۔ واللہ اعلم۔

خسرو نے مطلع الانوار ۶۹۸ھ میں لکھی ہے۔ اس وقت اُن کی عمر ۴۷ برس کی ہو چکی تھی۔ یہ شباب کا زمانہ کہاں ہے۔ شباب کے زمانہ میں انھوں نے غرۃ الکمال مرتب کیا ہے اُس کے دیباچہ میں صاف لکھتے ہیں کہ میں مثنوی میں نظامی کا پیرو اور شاگرد ہوں۔

اسی زمانہ میں قران السعدین لکھی اُس میں لکھتے ہیں۔

نظم نظامی بہ لطافت چو دُر	وز دُر او سر بسر آفاق پُر
پختہ از آن شد چو معانی تمام	خام بود پختن سودائے خام
بگذر از آن خانہ کہ جائے کسست	دہ بہ رہ باریک جائے تو ست
کالبدے زاری و جان آمد ست	ہرچہ تو دانی بہ از آن اندر ست
تا بود ان سکۂ عالم درست	بر تن تو کیسۂ او دان تست
مثنوی او راست جانے بگوئے	شورش از دور دو جائے بگوئے
این ہمہ انصاف نگر در بست	گر تو نہ می دگرے کو رس ست

نظامی کی نسبت لیلیٰ مجنوں میں لکھتے ہیں۔

زندہ است معنی او بنظام   وز نیست نقش حیات دادم

غرض امیر صاحب نے کبھی اساتذہ کی اُستادی سے انکار نہیں کیا۔ وہ تمام اُستادوں کا نہایت ادب کرتے تھے۔ مطلع الانوار میں جو کہہ دیا ہے وہ ایک اتفاقیہ تحریر جوش تعاصر سے نظامی کی تحقیر منظور نہ تھی۔

خود اپنی شاعری کی نسبت اظہار رائے

امیر صاحب کے حالات شاعری میں سب سے عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ خود اپنے کلام پر آپ ریویو کرتے ہیں۔ اور ایسی بے لاگ رائے دیتے ہیں کہ اُن کا دشمن بھی ایسی آزاد رائے نہیں دے سکتا۔ قران السعدین میں انھوں نے کیقباد اور بغرا خاں کا حال لکھا ہے لیکن اصلی واقعہ کو چھوڑ کر خاص خاص چیزوں کی تعریف میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ واقعات کا سلسلہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے اور کلام نہایت بے ربط ہو جاتا ہے۔ اس عیب کو خود ظاہر کرتے ہیں۔

وصف بران گونہ دور اندہ ام   کز غرض قصہ فرو ماندہ ام

---

[1] یہ واقعہ جس قدر عقل کے خلاف ہے اُسی قدر تاریخ کے بھی خلاف ہے۔

عیب جاں نیست کہ بہ بنمودہ ام　　تا بتو گوید ہمہ گفتہ ام
چوں ہمہ اندر قلمِ کانِ خویش　　معترف خود نہ نقصانِ خویش
عیب کسے مست کہ گوید بار　　چوں ہمہ عیب است بگوید بار

غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ شاعری کی تین قسمیں ہیں۔ استادِ تمام جو کسی طرزِ خاص کا موجد ہو جیسے حکیم سنائی۔ انوری۔ ظہیر۔ نظامی۔ استادِ نیم تمام جو کسی طرزِ خاص کا موجد نہیں۔ لیکن کسی خاص طرز کا پیرو ہے اور اس میں کمال بہم پہنچایا ہے سارق جو اوروں کے معانی چراتا ہے پھر لکھتے ہیں کہ استادی کی چار شرطیں ہیں۔ طرزِ خاص کا موجد ہو۔ اس کا کلام شعراء کے انداز پر ہو موشگافی اور روزمرہ کے طریقہ پر نہ ہو غلطیاں اور لغزشیں نہ کرتا ہو۔

یہ شرائط لکھ کر فرماتے ہیں کہ درحقیقت میں استاد نہیں۔ اس لئے کہ چار شرطوں میں سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی میں سرقہ نہیں کرتا۔ اور میرا کلام موزوں اور روزمروں کے انداز پر ہے لیکن دو شرطیں پائی جاتی۔ یعنی میں سرقہ نہیں کرتا۔ اور میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا خود ان کے الفاظ یہ ہیں۔

بندہ را از ایں چہار شرطِ استادی کہ گفتہ شد۔ اول شرطے کہ ایک طرز صنعت برحکم ما اختراع کنم کہ در عرصہ قلم جریان یافت کہ چندیں استادان متابع کلمات بودہ ام۔
چوں من رو طور رہبر بوادم　　پس شاگردم نہ استادم
و شرطِ دوم آں کہ در بادۂ سوادِ لوے خطا نا شد از ان میرزم بحمام رود
کہ نظم بندہ اگرچہ متین روان است۔ اما اما چادر غزل و شعر تعریفی ہم سب
در ایں دو شرط معترفم کہ از لاف استادی توبہ کردم تو ام غلطائید۔

کیا دنیا میں اس سے زیادہ کوئی انصاف پرستی اور بے نفسی کی مثال مل سکتی ہے۔ امیر صاحب کے کلام پر ریویو کرنے کے لئے اس سے زیادہ بڑھ کر کیا دلیل راہ ہو سکتا ہے
امیر صاحب نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ اصناف سخن میں سے کس صنف میں کس کے پیرو ہیں تفصیل اس کی یہ ہے۔

غزل	سعدی	مثنوی	نظامی
مواعظ و حکم	سنائی و خاقانی	قصائد۔ ظہیر الدین نیشاپوری و کمال الدین اسمٰعیل خلاق المعانی	

لیکن بعض یہ کون بتلائے، یہ کس کا منصب ہے۔ ہم ادنیٰ زبان سے صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ بعض کلام میں (قرآن السعدین دائما رحمہ دی) لفظی رعایت بہت ہے جو ضلع جگت کی حد تک پہنچ گئی اور بعض جگہ بالکل تکلف اور آورد ہے۔

امیر صاحب نے شعر و شاعری کے متعلق دیوان کے دیباچہ میں سب سے پہلے لکھے ہیں جن سے اس فن کے متعلق متعدد نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اس پر بحث کی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری میں کس کو ترجیح ہے۔ مقصد فارسی کے نام میں کیا ہے اور اس کی یہ دلیلیں لکھی ہیں۔

(۱) عربی میں ایسے زحافات ہیں کہ اگر فارسی میں ہوں تو کلام ناموزوں ہو جائے اس سے ثابت ہے کہ فارسی کے اوزان ایسے منضبط اور لطیف ہیں کہ ذرا سی کمی بیشی برداشت نہیں کر سکتے

(۲) عربی زبان میں ایک ایک حرف کے لئے متعدد مترادف الفاظ ہیں اس لئے شاعری آسان ہے۔ ایک لفظ کسی وزن یا بحر میں نہ کھپ سکا تو دوسرا موجود ہے بخلاف اس کے فارسی میں نہایت محدود سا الفاظ ہیں باوجود اس کے فارسی شعراء پر میدان شاعری تنگ نہیں۔

(۳) عربی زبان میں صرف قافیہ ہے ردیف نہیں۔

اب غور کرو عربی زبان کو متعدد طرح کی وسعت حاصل ہے وزن اتنا وسیع کہ جتنے زحافات چاہیں استعمال کرتے جائیں۔ لفظوں کی یہ بہتات کہ ایک لفظ کے بجائے دوسرا اور دوسرے کے بجائے تیسرا موجود ہے۔ ردیف کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ صرف قافیہ پر مدار ہے۔ جس قدر قافیہ ملتے جائیں کہتے جاؤ۔ ان سب وسعتوں کے ساتھ عربی شاعری فارسی شاعری پر غالب نہیں آسکتی۔

اس کے علاوہ عرب کا شاعر اگر ایران میں آئے اور برسوں قیام کرے تاہم فارسی زبان میں شعر نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایران کا شاعر بے تکلف عربی میں شاعری کر سکتا ہے۔ رودکی اور سوزنی جیسے لیکن زبان دانی میں عرب ادبا سے کم نہ تھے۔ فارسی کے وجوہ ترجیح لکھ کر لکھتے ہیں کہ یہ اور بہت سے وجوہ ہیں لیکن میں اس لئے قلم انداز کرتا ہوں کہ کوئی مذہبی تعصب کے پردہ میں مخالفت پر نہ آمادہ ہو جائے۔

خصوصیات شاعری

امیر خسرو فن شاعری میں جن خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) ایران میں جس قدر شعراء گذرے ہیں خاص خاص اصناف شاعری میں کمال رکھتے تھے۔ مثلاً فردوسی نظامی مثنوی میں انوری اور کمال قصائد میں۔ سعدی اور حافظ غزل میں یہی لوگ جب دوسری صنف میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو پھیکے پڑ جاتے ہیں بخلاف اس کے امیر صاحب قصائد مثنوی اور غزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے ہیں مثنوی میں نظامی کے بعد آج تک ان کا جواب نہیں ہوا۔ غزل میں وہ سعدی کے دوش بدوش ہیں۔ قصائد میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی لیکن کلام موجود ہے مقابلہ کر کے دیکھ لو۔ کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں تفصیل اس کی آگے آتی ہے۔

(۲) ایشیائی شاعری پر یہ عام اعتراض ہے کہ خاص خاص چیزوں پر نظمیں نہیں لکھی گئیں۔ مثلاً قلم۔ کاغذ کرسی۔ دریا۔ شمع۔ صراحی جام۔ خاص خاص موقعوں اور پھولوں وغیرہ وغیرہ پر ایسی مسلسل اور لمبی نظمیں نہیں ملتیں۔ جن سے ان کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ امیر صاحب نے ایشائی شاعری کی اس کمی کو پورا کر دیا انہوں نے قران السعدین میں اکثر اسی قسم کی نظمیں لکھی ہیں۔ اور اس کتاب سے اُن کا مقصد اس قسم کی شاعری کا نمونہ قائم کرنا تھا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

بود در اندیشۂ من چند گاہ　　کز دل دانندۂ حکمت پناہ
چند صفت گویم و آتش دہم　　جمع اوصاف حلاوتش دہم
طرز سخن را زدستش نو دہم　　سکۂ آں ملک زخسرو دہم

منکہ چو دریں حی امدست رائے — تا رہ شاہم رہ شیمز بائے
ہمہ رہاں گو۔ شدازل یرواں — کاں دگرے بادل آمدکہ چوں

شاعری کا نام امیر صاحب نے وصف نگاری رکھا۔ اور یہ بہاریہ موردوں نام
اگرچہ افسوس ہے کہ زمانہ کے مذاق کے لحاظ سے اس میں تجزیہ کا پورا رنگ نہیں آیا
اور مضمون آفرینی کا رنگ چڑھا ہوا ہے تاہم حسن قدر ہے غنیمت ہے۔

کاغذ کی تعریف

کاغذ شامی فسِ و صبح دوام — آں کہ شدآرایش صحنِ رسام
چادرے ورنے اطلس رخویش — ناصف ورتہ شدہ پوید بہ خویش
جامے تحریر آمدہ ادراہ نورد — طرہ تحریرے کہ تواں حرد کرد
آمدہ ایجز اشتس فراہم زآتشے — لیک پراگندگیش ہم زآب
سکہ شدہ آز بس لیاپر پشت — پشت دو تا گردد تش از یک شکست
گہہ بود او درسہ سختی گذر — گہ دیدار یح بہ معراں سر
گہہ جلوہ سورن مسطر کشیدہ — گہ کشش رسشہ دو ترکشید
حرف حرف از قلم آراستی — لک بہ دیدہ ہمہ بر خویشتن

سب سے شعر لکھے ہیں ہم نے قلم انداز کر دیتے۔

کشتی کی تعریف

ساختہ از حکمت کار آگہاں — جانہ گرد یدہ بہ گرد جہاں
نادرۂ حکم صدائے حکیم — جانہ رداں خانگیاں معظم
اہل سفر را ہمہ برد سے گذر — بہرہ اد ساکن داد درسفر
چارۂ ہند رہائش سلیم — حامل چیدن بہ لکن عقیم
میسر از مرغ پر دو درکتاد — پیشتر از بادرود۔ رود باد
رفتہ دو مرحلہ رہ دے بل دو چند — باس وسلسلہ و جہد حد
ہمچو کلنگاں بہ ہوا سر فراز — پرچو حواصل زدہ مو کردہ باز
ہر طرفش رہ بہ ستتاب دگر — ہر قدمش بر سر آب دگر
گرچہ بہ دریا گذرد میں دکم — آب سا شد بگردش تا شکم
دست چو زد آب فراز افگند — آب بدست آرد و باز افگند
نظرہ زدہ بر رخ دریا بہ زور — آب ازاں نطرہ بہ دریا دوسور
ورزہ نے آب ملاد شدن — کیست کہ بے آب تواند سدن

(۳) تشبیہ شاعری کے چہرہ کا غازہ ہے۔ لیکن تقلید پرستی نے یہ حالت پیدا
کر دی تھی کہ جن چیزوں کی جو تشبیہیں ایک دفعہ قدما کے قلم سے نکل گئیں ان
کے سوا گویا دنیا کی تمام چیزیں بیکار تھیں۔ امیر صاحب نے بہت سی نئی تشبیہیں
نکالیں چنانچہ قرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں۔

تشبیہات نوساراست ایں محمل جلا یافل تو اندکرد۔ اما دو سہ نظر
برائے یادگار بگردتمہ۔

اس کے بعد دو تین مثالیں لکھی ہیں۔

زانتظار دو دراہی ساں نوصدچشم — بر برہ بوے دادم دو سرام ماہی گیر
مژہ ہائے کتر دل آویز ت — کیترہائے دوکاں قصاب است

زہے خرامش آن نازمیں رعنائی — کبوترے بہ نشاط آمد ست پنداری

امیر صاحب چونکہ ہندی زبان سے آشنا تھے اس لئے تشبیہات میں ان کو
رنگ بھاکا کے سرمایہ سے بہت مدد ملی ہوگی۔ آخر شعر غالباً اسی قسم کی خوش چینی ہے
فارسی شعرا مستوں کی رفتار کو کبک کی رفتار سے تشبیہ دیتے تھے۔ ہندی میں ہنس کی
چال عام تشبیہ ہے۔ لیکن کبوتر مستی کی حالت جس طرح چلتا ہے وہ مستانہ خرام کی
سب سے اچھی تصویر ہے۔

قصیدہ۔ مثنوی۔ غزل میں انھوں نے جو جدتیں پیدا کیں ان کی تفصیل علیحدہ
علیحدہ عنوان میں آگے آتی ہے۔

مثنوی

مثنوی میں خصائص جو لکھے ہیں نظامی کے جواب ہیں۔ نظامی کے پنج گنج میں
تین قسم کی مثنویاں ہیں۔ رزمیہ۔ عشقیہ۔ صوفیانہ۔ امیر صاحب نے بھی تینوں مضامین کو
لیا ہے اور ہر رنگ کو نظامی کے انداز میں لکھا ہے۔

ایک ایک مثنوی پر ریویو کرنا خاص ان کے سوانح نگار کا کام ہے البتہ بعض
مثنویوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

قران السعدین۔ سب سے پہلی مثنوی ہے جو ٣٦ برس کی عمر میں لکھی۔ اس لئے اس
میں تکلف اور آورد بہت ہے۔ لیکن باوجود اس کے اکثر جگہ نہایت لطف زبان اور
برجستہ ہے۔ مثنوی کا قصہ صاف یہ ہے کہ معز الدین کیقباد بادشاہ اپنے باپ سے مخالفانہ حملہ و
کثرت اور جنگ کی تیاری۔ بیٹا یعنی کیقباد بادشاہ تھا اور باپ بیمر تھا لیکن مشکل
یہ تھی کہ وہی صاحب تخت تھا اور اسی کی فرمایش سے یہ مثنوی لکھی گئی۔ شاعر بھی
چاہتا تھا کہ اس کی گستاخیاں جن کو وہ اپنی دلیری کے کارنامے سمجھتا تھا تفصیل اور
آب و رنگ کے ساتھ لکھی جائیں۔ اور یہ ثابت کیا جائے کہ باپ کے ہوتے تخت
سلطنت کا مستحق بیٹا ہے۔ اس چھوٹی سطح کو امیر صاحب نے جہاں تک ہو سکا۔
خوب نبھایا ہے۔ چنانچہ بیٹے کی زبان سے کہتے ہیں۔

گر بہ کہیں تاج ستاں بو ام — عیب مکن گوہر کان بو ام
در بہوس تاج برادرسر است — من گہرم تاج مرا درخور است

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک کاغذ شام سے آتا تھا۔

[2] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بھی اسی طرح کاغذ بنائے جاتے تھے کہ روئی اور کپڑے کے چیتھڑوں کو پانی میں بھگو کر پانی کی طرح سال بناتے تھے۔ پھر وہ خشک ہو کر
کاغذ ہوجاتا تھا۔

چوں سرم از عہد سرا باز گشت — تاج تو بر تارک من باز گشت
تحت جہاں ہرو بر نمائے گرد — لیک براں تخت مرا جائے گرد
ملک بہ میراث نیابد کسے — تا نہ زند تیغ دو دستی بسے
از تو اگر نام پدر روشن ست — حلقۂ بعد من؟ بنام من است
ہر دو جو ایم من و تخت من — باد دو جو ان پنجہ بہم در زمن
گرچہ بروئیت نہ کشم در ستیز — از پئے تعظیم تو شمشیر تیز
لیک تو دانی کہ چو کیمیا آورم — شیر ملک را بہ زمیں آورم
خود تو کسے گر دم از من دور است — سر رکش تیغ عشق سر زدے
لیک تو چوں ہستے ابن پدر — من بدہم گر تو توانی بہ گیر

باپ نے جواب لکھا ہے دیکھو کس طرح۔ حرف حرف۔ پدرانہ محبت کے نشے چور ہے۔

اے ز پسر گشتہ سزائے سریر — در پسری انکھو پدر نے بطر
گرچہ عیار است زکار تو نام — سرمۂ چشم است عیار تو نام
تا تو نہ دانی کہ دریں گفتگوے — از پئے ملک است مرا گفتگوے
گرچہ تو ام ز تو ان نابرد — از تحت انم نکو خواہم سپرد
شکر کہ تا زندہ بہ ایام تو — حق ز بود نام من از نام تو
باس نہ کام کہ بکام تو ام — زندہ و پائندہ بنام تو ام
خواہم از جاں کہ بجاہی مرا — در تو نہ خواہی دہ خواہی مرا
جز نہ تملئے تو سودام نیست — سیر ازیں ہیچ بسام ہست
گرچہ کہ سلطان جہانم بہ ملک — تاج دہ و تخت ستانم بہ ملک
لیک چو وہ رم ز لوائے تیکسی — بے خوشم از تاج و نہ سازم ز تخت
بخت من از پائے بر افلاک سود — باتو چو یک دم نہ نشینم چہ سود

ان جاں گداز الفاظ نے بیٹے کے دل پر بھی اثر کیا۔ اب اس کا لہجہ بدل جاتا ہے اور فرزندانہ جوش محبت میں کہتا ہے۔

من کہ گلے زستہ باغ تو ام — پرتوے از نور چراغ تو ام
گرچہ بسر ماہ رسید افسرم — ہم بہ تہ پائے تو باشد سرم
ز ابرو خود کس تو اسار سد بکس — من سر جاناں فگنم بر زمیں
تاج زمن سر ز تو از امن — عاج ز تو تخت زمن ساختن
ورنہ ملاقات رہی رائے تست — از من خدمتی بائے نیست
نیست مراں محل ز آں شکوہ — کر سر خود سارہ بتانم کوہ

باپ جب بیٹے سے ملنے آتا ہے تو بیٹا تخت شاہی پر متمکن تھا۔ باپ کو دیکھ کر بے اختیار تخت سے اترا اور باپ کی طرف بڑھا۔ باپ نے چھاتی سے لگایا۔ دیر تک دونوں جوش محبت میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے۔ پھر بیٹے نے باپ کو لے جاکر تخت پر بٹھایا۔

گرم دو چشم ز تخت بلند — کرد بہ آغوش ن ار جمند
داشتن نہ آغوش خودش بادیر — مہر ز شہ جوش شد از جوش سیر
پا خودش از فرس نہ از رنگ زر — تحت کیاں بہار کیاں را ضرد
گاہ ز دیدہ نہ ستارس گرفت — گاہ دوبارہ نہ کنارش گرفت
گاہ بہ لطف نہ رخ رماش کرد — گاہ دل از مہر شکیباش کرد
پرسش از اندازہ رعایت گذشت — حد نوازش ز رعایت گذشت

قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائف نظم کی پابندی کے ساتھ تاریخی مستند تمام ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ اس طرح کی کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھ کر ان باتوں کو نہ لکھتا۔

خمسہ میں پانچ مثنویاں ہیں یعنی مطلع الانوار شیریں خسرو۔ لیلیٰ مجنوں۔ آئینہ اسکندری۔ ہشت بہشت۔

جس ترتیب سے ہم نے ان کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ یہی ان کی تصنیف کی ترتیب ہے۔ جیسا کہ امیر صاحب نے خود ہشت بہشت میں تصریح کی ہے۔ ان پانچوں کتابوں کی تصنیف کا زمانہ کل سوا دو برس ہے اور یہ قادر الکلامی اور پرگوئی کا حیرت انگیز اعجاز ہے۔

اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ نظامی کے جواب میں جس قدر خمسے لکھے گئے ان میں نسبتاً امیر صاحب کا خمسہ سب سے بہتر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں بعض نظامی کی تصنیف سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں۔ مطلع الانوار میں صاف خامی نظر آتی ہے اور آئینہ اسکندری بالکل پھیکی اور کمزور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود امیر صاحب کے دل میں احساس تھا۔ آئینہ اسکندری میں لکھتے ہیں۔

دگر بار گرمی تو بود خویش — مرا خود عزیز است فرزند خویش
سر گرچہ آوازہ سرخندہ را — نہ از عنوان گوشش خندہ را
بر دیار نحالیش نہ اد گر — کہ برمن نہ بخشش نگاہ نظر
ہمہ خونے در عیب خونی مکوش — مرا ہر عیب سبب بر خود بپوش

نظامی کے زور دار رزمیہ معرکوں کے مقابلہ میں ان کے زور طبع کا یہ نمونہ ہے۔

نہ گردوں تندار بانگ زریں جرس — نہ دریائے لشکر در افتاد جوش
ہر اہر در آمد نہ ہر دو سپاہ — ز نازو در آمد نگو رسد ماہ
علم سبز عوق بر برگشتند — سان چشم سیارہ بر برکشید
جہاں ہمہ پست سیر گشت — جہانے بر از شیر و شمشیر گشت
غبار من کلہ بر ماہ بست — نعل را ز روں گلو راہ بست
جہاں گشت زیر ہوا گرد ناک — کہ سارہ گم کرد خود را بخاک
سپاہ از رہ موج زن یادرج — چو دریا کہ بادش در آرد بموج
نہ دریائے آہن جہاں گشتہ غرق — ہوا پر ز تیغ و زمیں پر زبرق
ز بانگ ہوایاں کہ سی و رد — حشد بر سرا گشتہ لاجورد
غرق کردن تو ساں وساب — ز دریائے آتش برانگیخت آب
ترارہ کہ زد نعل ہنگام تو — ستارہ بردن ریخت از جاہ تو
تعیرہ از چاشنی کمان — شدہ چاشنی بخش جان ہر زمان
گرہ بر گرہ شست پیکاں رماں — زرہ بر زرہ پشت رویں تناں

سر بر سر تیغ رخشاں تاب — جاں کردہ برنگ سیلو آب

اس کمی کے مختلف اسباب ہیں۔ مثنوی امیر صاحب کا اصلی مذاق نہیں۔ نظامی کی طرح انہیں نے دو مثنویاں لکھے تھے اور گویا کہ التے تھے۔ چنانچہ خمسہ کا خمسہ دو سوا دو برس میں لکھا ہے اور مطلع الانوار تو صرف دو ہفتہ کی کمائی ہے۔

ان کتابوں کی تصنیف کے زمانہ میں دربار کی خدمتوں سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ لیلی مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ نظامی کو شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا اور کسی قسم کی پریشانی نہ تھی۔ میرا یہ حال ہے کہ پاؤں کا پسینہ سر پر چڑھتا ہے تب روٹی ملتی ہے۔

مسکیں من مستمند بے ہوش — از سوختگی چو دیگ در جوش
شب تا بسحر ز صبح تا شام — در گوشہ غم نگیرم آرام
باشم ز برائے لقمہ نان — چون قوت نہ دستادہ بر پائے
تا چون نہ رود ز پائے تا سر — دستم نہ رسد در آستین بر

اس خمسہ میں ایک کتاب ان کے خاص مذاق کی ہے یعنی لیلی مجنوں اگرچہ اس کتاب میں بھی انہوں نے خاکساری سے نظامی کے سامنے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے۔

میدانی دور نظم نامہ ہیچ — بانی ز کدا است ہیچ ما ہیچ

لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کی لیلی مجنوں اور نظامی کی لیلی مجنوں میں اگر کچھ فرق ہے تو اس قدر باریک ہے کہ خود وہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔

اس کتاب میں ہر قسم کی شاعری کے موقع پیدا کئے ہیں۔ اور اُن کا کمال دکھایا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر دھوپ کی شدت اور گرمی کا سماں دکھاتے ہیں۔

آتش زدہ گشتہ کوہ تا کاں ہم — تفسیدہ زمین و آسماں ہم
جانے نہ کہ دیدہ را زہ خواب — ابرے نہ کہ تشنہ را دہد آب
مرغان ہمہ در شجر نہادہ در ساج — در روضہ چہرہ گاں نہ سوراخ
رنگ از رخ تختہ در گرانی — چوں ما نہ زور میہمانی
از گرمی ریگہائے گرداں — پُر آبلہ پائے رہ نوردان

عشق و محبت کے جذبات کے دکھانے کا اس سے بڑھ کر کون سا موقع مل سکتا تھا۔ اس لحاظ سے اس مثنوی کا ہر شعر گویا ایک پُر درد غزل ہے۔ سگ لیلی کا واقعہ نہایت مشہور ہے اور شعراء نے اس دلچسپ روایت کو طرح طرح سے رنگا ہے۔ امیر صاحب نے اس کو سب سے زیادہ موثر طریقہ سے ادا کیا ہے۔ مجنوں کتے سے خطاب کرتا ہے۔

ہمسیم من ز تو بر دوست گرد — لیکن تو نہ بادہ من از درد
چوں بار گذر کنی دراں کوے — بر خاک درش زمیں ہمی بوسے
بر جس کہ ز وگر اشتہ نگا ہے — از من بر سانش سلامے
بر جا کہ نہاد پائے رد دستش — بر خاک بوسی از لب مستش
خواہد چو ترا درون دہلیز — یاد آرد ہی از سگ دگر نیز
از بحر تو دست ہمدو بر دوش — از گردن من مکن فراموش

اس پیرایہ کو دیکھو۔ کہتے ہیں کہ جب لیلی تجھ کو ڈیوڑھی کے اندر بلاتے تو ایک اور سگ در کو یاد دلادینا۔ جب لیلی تیری گردن میں طوق ڈالے تو دیکھ میری گردن کو بھول نہ جانا۔

عاشق کا پیغام و سلام سب لکھتے ہیں۔ لیکن معشوق عاشق کو کیا لکھتا ہے۔ نہایت نازک مقام ہے۔ دیکھو امیر صاحب اس نازک موقع کو کیونکر نباہتے ہیں لیلی مجنوں کو لکھتی ہے۔

اے عاشق دور ماندہ چونی — وے شمع ز نور ماندہ چونی
روزت دائم کہ بے نشان است — شبہائے سیاہ بر زباں است
از من نکنے بری حکایت — با خود نکنی ہمی شکایت
در گوشہ کہ بالش می رسانی — دریائے کہ قطرہ می فشانی
بازار تو در کدام سوی است — سیلاب تو در کدام جوی است

معشوق اس قدر ضرور جانتا ہے کہ عاشق روتے ہوئے اور درد دل کہے بے نہیں رہ سکتا۔ اس کی غیرت یہ سوال پیدا کرتی ہے کہ کس کے سامنے روتا ہے کس سے درد دل بیان کرتا ہے کس کے آگے میرا نام لیتا ہے۔ یہ باتیں گو رازدار اور معشوق پرستی کے خلاف ہیں ان کے جذبات اور خیالات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

آئینہ اسکندری یعنی ہے لیکن اس کتاب میں ان کے مذاق کا جو میدان ہے اس میں وہ نظامی کے دوش بدوش ہیں۔ نظامی نے سکندر اور ملکہ چین کی بزم آرائی کا قصہ بڑی آب و تاب سے لکھا ہے خاص اس موقع پر خوب زور طبع دکھایا ہے جہاں وہ دل ربا سکندر کی ایک ایک بات پر اپنی ترجیح ثابت کرتی ہے امیر صاحب نے بھی یہ معرکہ باندھا ہے اور اسی طرح سے چینی کا فخر۔ لکھا ہے نظامی کے طرز سے ملا کر دیکھو معشوق چینی کہتا ہے اور سکندر کے ایک ایک وصف کے مقابلہ میں ترجیح ثابت کرتا ہے۔

مسعود کہ وا دجہاں بہ حق — زمیں باد بش یاری آموختم
ہمہ خوں خوبان کش می خورم — ز لب نوش بادم کہ خوش مخورم
رخ ہر صنم باید ارمی است — صنم خانہ بار اکلید از من است
سپہر آفتاب از من خواہدم — دگر ماہ میرد ہمیں خواہدم
سکندر کہ گرد آب حیواں ہوس — نظر جستی لو و مقصود و بس
گر او جست گنج خضر و جام جوے — مرا جام گنجی سماتیب روے
گر از مجلس او مصر بے دماد — مرا لالہ و گل ز تن مے دمد
گر اورا سب ترتیب ملتے لست — مرا در دل او وصف جائے نشست
گر اوتاج خواہد زشاہاں خراج — من از سروراں سرستانم باج
گر اقبال و دولت ورا باز در بد — مرا ہر دو چون کمترین چاکر اند
گر از دشمناں راکوں خوردن است — مرا خوں صد دوست بر گردن است
گر او را ایک آئینہ بر کف است — دو آئینہ دارم من از انگشت رسنت
کماں دے از صد شکار افگند — یک ابروے من صد ہزار افگند
کمندے از رسید بند صد دام — من آنم کہ صیاد گیسو در دام
گر اورا کلاہے است بر آسماں — مرا صد کلاہ است بر آستاں

مثنوی ہشت بہشت۔ سب سے اچھی مثنوی ہے اور امیر صاحب کی شاعری اس میں پختگی اور فنکاری کی انتہا حد تک پہنچ گئی ہے۔ خاص خوبی اس میں یہ ہے کہ واقعہ نگاری کا کمال ہے۔ ساری کتاب میں بزمی حکایتیں لکھی ہیں۔ لیکن یہ التزام کیا ہے کہ جو واقعہ لکھا جاتا ہے اس کے بہت چھوٹے چھوٹے جزئیات جن کے ادا کرنے سے زبان عاجز ہو جاتی ہے۔ ادا کئے جاتے ہیں۔

تمام کتاب کا یہی انداز ہے اور اس خصوصیت کے لحاظ سے فارسی زبان کی کوئی مثنوی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

مثلاً ایک قصہ لکھا ہے کہ حسن ایک سنار تھا۔ اس کو بادشاہ نے ایک جرم کی سزا میں یہ سزا دی کہ ایک اونچی لاٹ پر چڑھوا دیا جس کی چوٹی لاٹ کے اس کی حسن نے لاٹ پر سے کہا کہ بازار سے ریشم اور شہد لا۔ جب وہ لائی تو کہا کہ ریشم کے تار کے سرے پر شہد لگا کر کسی چیونٹی کے منہ میں جو لاٹ پر چڑھ رہی ہو دے دے۔ اور جو دھاگہ جلد جلد تار کی گولی کھولتی جاتے۔ چیونٹی تار کو لئے اوپر چڑھتی چلی گئی۔ حسن کے قریب پہنچی تو حسن نے تار کو لے کر اس سے رسی بٹی۔ اور پھر ایک خاص تدبیر سے اسی کے سہارے نیچے اترا۔ تمام قصہ بہت لمبا ہے۔ اس کے چند شعر ہم نقل کرتے ہیں۔

چوں نگہ کرد خواجہ از بالا   کہ زنش در رسید ناگہ لا
دادش آواز گفت بر سر دار   پارۂ قند کن بر ورد بیار
وہ بمورے کہ می رود بر سیل   تا سالاس کی رود تحصیل
رشتہ داد در دم کن یار   گرنشیب آورد بہ سوئے فراز
ہم چناں کرد زن کہ او فرمود   واں رشتہ بمور زود زود
راہ بالائے میل بار گرفت   رسن سست بر حصار گرفت
چوں بہ سر دیک رشتہ رفت سرور   ریسماں را کشید خواجہ زدور

قصائد

قصیدہ میں ان کا کوئی خاص انداز نہیں ہے۔ کمال۔ اسمٰعیل۔ خاقانی اور انوری کی تقلید کرتے ہیں۔ اور جس کے جواب میں قصیدہ کہے ہیں۔ اس کا تتبع کرتے ہیں۔ خاقانی کا مشہور قصیدہ ہے۔

مجلس دو آتش دادہ۔ برای برخوردار از جو   اس کز یعقل لامعتز واں جام را جاوداشتہ

اس کے جواب میں سب سے بڑا قصیدہ لکھا ہے۔ وہی انداز۔ وہی ترکیبیں یہی استعارے ہیں۔ اور چونکہ خاقانی کا معاملہ ہے۔ اس لئے، اکثر جگہ کم رہ گیا ہے۔ اس میں واقعہ نگاری کا خاص انداز قائم ہے عید کا سماں کہا ہے اور عید کا پورا سماں دکھایا ہے۔

سرسبز خواناں لوسلت بر موضوعہ ساں در قصب   طفلاں بہ نغمہ از طرب دیدہ بہ فرداداشتہ
از سروجر جامہ دوری در سر خواری بہ رتس   چوں سرخوراں در دہن یساں جرعہ داشتہ

خورشید چوں سر بر زدہ ہرکس سرائے در شدہ   ایں رہ سوی میکدہ اور در معلا داشتہ
واں کز رہ بازوردہ گہ در مسجد گہ سو دیدہ   سر بر بساط سجدہ گہ دل سوئے صہبا داشتہ
دارندۂ طوطی سنت سے ل جاں بگلو ل است سے   خورسند کو ل است مے در طاس صہبا داشتہ

ان کے قصائد میں مدحیہ مضامین بہت مدہم اور پھیکے ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ مدح دل سے اُن کو پسند نہیں۔ صرف معاش کی ضرورت سے۔ گوارا کرتے ہیں۔ اس لئے قصیدہ میں اور مضامین کو لیتے ہیں اور اُن میں زور طبع دکھاتے ہیں مثلاً بہار کا سماں۔ برسات کی رُت۔ صبح و شام کی کیفیت۔ ایک قصیدہ میں برسات کے آثار سے تمہید شروع کی ہے اور صرف مطلع میں سب کچھ کہہ دیا ہے۔

ابر بارید و ہمہ روئے زمیں زار کرد   خبر آرید کہ سبزہ چہ قدر سر بر کرد

سپیدہ دم کہ صبا گشت بوستاں فرسود   نتاب خاک زمیں بار پرساں فرمود
چو زرد گشت بارگ گل بہ آفتاب ملاشت   زمانہ بر سر سبزہ اُو بر سایہ باں فرمود
زلالہ خواست کہ ساغر دہند تحفہ   زابر خواست زمیں سربت زرنگاں فرمود
ہر آنچہ در دور خویش عجب شکل باشد   معشوق کوس بہار و صبا بہاں فرمود

صبح کا سماں

سپیدہ دم کہ فلک روشنی بہ گیہاں داد   نسیم غالیہ مورد ادامن گلستاں داد
عروج پیرہ رخ روئے سپیدی و سحر می   بدستش آئینہ داد آفتاب رخشاں داد
درست مغربی آفتاب را کہ فلک   بہانہ زیر زمیں بامداد تاباں داد
ستارہ را زچہ شد دیدہ خیرہ از خورشید   چو شب رفتہ عاشق سر بہ ہجراں داد
غلام بادِ صبا ام کہ بامداد پگاہ   صلائے عیش بہ عشرت سرائے مستاں داد

باغ

نوبہار است و چمن جلوہ چو حورا کردہ   ابر بارید ہمی لولو لالا کردہ
گرۂ طرۂ سنبل کہ صبا بازشدہ   دامن لالہ پُر از عنبر سارا کردہ
بر گل و لالہ سرو ورآمدہ قمری   پائے آلودہ بخوں بانچہ بالا کردہ
عاشقاں رفتہ بگلزار و دل سوختہ را   بہ تکلف بر گل و لالہ شکیبا کردہ

نوبہار است بار روزہ فرماید ہمی   گل چنان تر داس ارے لب بیالاید ہمی
بردہاں غنچہ گہ گہ ی بدبو سر نسیم   کاں شکر لب حریرہ بوسہ روزہ بکشاید ہمی
باد در کہسار جام لالہ را بر سنگ زد   گل بخندہ گفت ارے ایں چنیں باید ہمی
نرگس رعنا قدح بر دست و چشم اندر ہوا   گو تماشی جوارہ ماہ عید را باید ہمی

(گویا اتراب جوار ماہ عید کو ڈھونڈتا ہے)

برسات

ہوائے خرم است و طرف باراں ہمی بارد   نگہ سم مطرہ کر بالائے گل ریحاں ہمی بارد
نگوں سر تا خیالے سرگوئی در ہمی چیند   رسن کا مر ز راقاں نووی طفلاں ہمی بارد

لے زنداں فرمودن۔ فوراً حاضر کرنا۔

بعض تشبیہیں نو ایسی ہوتی ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل کے ٹکڑے زمین پر اتر آتے ہیں۔ ان کے رد سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

از عطرِ رسیدِ بہار پر تو بیدار ی   کہ سبزہ ایں کہ نو رستہ است امروز ہمان بہار
چو آن ونیکہ مطرب زمان نکوان بر روس   ترکان زمان سرو و نارا ن ہمی نارد

بعض قصائد سرتاپا موعظت و اخلاق میں ہیں۔ ان میں بحر الابرار حو بڑا مسرحامل قصیدہ ہے مشہور ہے۔ التزام کیا ہے کہ ہر شعر میں نجوی اور اس کے ساتھ دلیل ہو۔

گر نشہ مالی و مائگ طلش نہ در سر است   ہر کہ مانع تندرستی و ورشتہ سحر ور است
عاشقی مسلط است وزدان رالسر راحت است   سلسلہ سداست وشیران را گردن بربند است

یعنی عاشق میں گو تکلیف ہے لیکن مردوں کو وہی آرام دہ ہے جس طرح شیر زنجیر میں مقید ہوتا ہے اور یہی زنجیر اس کا زیور ہے۔

خواہان در طلب پادشاہ عالم است   تیغ حصہ در پیام پاسبان کشور است
ابر دو چون در پا گوشد مرید شہوت است   پیمار بی جان رنج ساز لیکن سر سبز است
حاک سب ہر گز نور بالا نز قوت است   سایہ زیر پا تو و ہر گز کہ نہ بالا کہ خور است
ہمائی کو تشویش است در محشر است   آب ریحا کہ در در یستی تو روبر است
پاکس دگس ہر کہ حرص وبالدار دوزخی است   نوہ ہر کس ہر چہ در آتش وتند حاکستر است
اے برادر ما بروبرا از خور روح مرتج   خون ترا خون برادر بہ رسیر ماذر است
دہر حاکے را نمونہ سکندر کیس مردم است   کز آئے راعلوہ میکند کس گو ہراست

اہل فن کے نزدیک قصیدہ میں شاعری کی حد مطلع کا آغاز و مطلع یعنی گریز ہوتا ہے۔ اس معیار کے لحاظ سے امیر خسرو اپنے تمام ہمعصروں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کے کمالوں کی چند مثالیں ذیل میں ہیں۔

زمانہ کے ذکر کے بعد

مرا امروز جنس وگر دان پایہ در مطلع   مگر دیگر کس نیست مگر شاہ جہان گرد

بہار کی تمہید کے بعد

گل از کرم مرشد گر بان وانی   کہ در رخ تو یکسر عمر جاودان را
بال بالا شاہی رکن حق آن کہ   ربزم اوست رونق بوستان را
کش وہ چہرہ کہ ماہ ہے قدم برنتے زمین   در ملک محمود کہ آسمان ایں است

طلوع صبح کا سماں کر کے

صبح رانگفتم کہ خورشید کجاست   آسمان روئے ملک محمود

مار روئے آن ماہ کہ رگر مہیچ آسیے   مگر در زمانہ رایات شاہ کامگار آمد

طلوع آفتاب کے بعد

خورشید جہانگیر بیدار کہ در رزم   شمشیر کشیدہ ملک آلشرق بر آمد

قصائد میں امیر صاحب نے جس قدر جدید مضامین، لطیف استعارے اور نئی نئی تشبیہیں گوناگوں اسباب پیدا کئے اس کا احاطہ نہیں ہو سکتا ہم اس موقع پر صرف بہاریہ تمہید کے چند شعر اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ بہار شعرا کا پامال میدان ہے لیکن امیر صاحب اس میں بھی سب سے الگ ہیں۔

بوستان شگفت در دے لالہ حساں گشت باز   در رخ گل طرۂ سنبل پریشاں گشت باز
سرو مطلے صبا سر خوا ندن بلبل نو شست   بلبل آنگہ از حط عریان غزل خوان گشت باز
خون لالہ گونیا خوا ہد چکید از تیغ کوہ   تا چکید آن خون کہ کوہ آلودہ دامان گشت باز

غزل

اوپر پڑھ آئے ہو کہ غزل قدما کے زمانہ تک کوئی مستقل چیز نہ تھی۔ سعدی نے غزل کو غزل بنا دیا۔ امیر خسرو کی غزل گوئی پر تقریظ کرنی ہو تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہی خمخانہ سعدی کی شراب ہے جو دوبارہ کھینچ کر تیز ہو گئی ہے۔

غزل کی جان کیا ہے؟ درد سوز و گداز۔ جذبات و معاملات عشق و پیار اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ یہ جذبات اور معاملات جس زبان میں ادا کئے جائیں وہی زبان ہو جس میں عاشق معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے یعنی سادہ ہو۔ بے تکلف ہو۔ نرم ہو۔ لطیف ہو، شیریں ہو۔ اس کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحریں ہوں۔ جملوں کی ترکیبوں میں ابہام کو بھی دخل نہ ہو۔ قریب الفہم خیالات ہوں۔ اس حد تک امیر صاحب شیخ سعدی کے دوش بدوش ہیں۔ لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں انہوں نے غزل کی اصلیت کے علاوہ کمال شاعری کی بہت سی چیزیں اضافہ کیں اور ایجادات اور اختراعات کے جن کھلا دیئے۔ یہ سب اعمال تفصیل ذیل میں ہے۔

بحروں کی موزونی وہ اکثر شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کرتے ہیں جس میں خواہ مخواہ ان کو معانی۔ سادگی۔ اور اختصار سے کام لینا پڑتا ہے مثلاً۔

من دارم کہ سامان نیست اورا   نہ دل دروے کہ درمان نیست اورا
واش کر عزم رور زار آن کہ   نیست دارم کہ پایاں نیست اورا
بہ راہ انتظارم ہست چشمے   کہ حوالے ہم پریشاں نیست اورا

یار من دل زود ساں بر داشت   مہر دیرینہ از میاں بر داشت
در دل او زکر دکار ا جیہ   سنگ از بادام تعاں بر داشت
دے زے مدی لمد کر دا امرو   از پے ستم کماں بر داشت

آں دوست کہ بود مہرباں شد   واں صبر کہ داشتم نہاں شد
گفتم کہ اسیر کردی اے دل   دیدی کہ بعاقبت ہماں شد
دل بر دگرے بہشم ولیکن   عاشق بہ ستم ہمی تواں شد

عاشقے را چو نامہ یار کشید   نام من بر سرش طراز کشید
گرشما دبن ما سعان دارید   بعد از ان پیش مت نماز کشید
گاہ مردن رسیدہ ام محمود   کف بدیم ہوے ایاز کشید

دادم آں نیست کہ طرہ راز بند داد   پاسخے بیر دل تو از بہ داد

خواب ما را بست و بالین گرد   دل ما را سرد و ناز نہ باد
تو چہ دانی یار مہ ری چیست   چون عداوت ہمیں یار سعادت

مورد گدار اور سوز و گداز کے خیالات جب وہ ادا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آگ سے دھواں اٹھ رہا ہے ۔ اس میں بھی معشوق سے اپنا حال کہہ رہے ہیں کبھی اپنی تصویر کھینچتے ہیں کبھی خود اپنے آپ ان کو رحم آتا ہے ۔

برائے دوست پرسیدی کہ چون بگذشت حال   اے سر گردم چہ میپرسی بخواری گذشت

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عاشق معشوق سے اپنی سرگزشت حب بیان کرتا ہے تو تھوڑا سا کہہ کر اس کو رونا آتا ہے ۔ ٹھہر جاتا ہے ۔ رو لیتا ہے پھر آگے بڑھتا ہے اس کی تصویر کھینچے ہیں ۔

عمر ہاست وشب افسانہ و بازو ہر بار   قدرے گریہ دپس بر سر افسانہ رود

زانوش جز و بند بر سر بہانہ   سر بہانہ بر سر زانو نخفت

اے آشنا کہ گر نہ کمان پیوند سہی   آب از بروں مریز کہ آتش نہان گرفت

کبھی کبھی عاشق کا دل کہتا ہے کہ صبر سے کام لینا چاہئے ۔ پھر دل پر غصہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ کمبخت خواب نہیں ہو سکتی اس کے کہنے سے کیا فائدہ ۔ اس معاملہ کو یوں نظم کرتے ہیں ۔

عہد ہا می کشد اے دل بہ صبر حوصلہ   وہ چہ آلودگی از اں کار کہ نتوانی کرد

حسد بردی اے وکیل ما عقل وداس حرز   ما با بر مراد خاطر خود دیدی آنکوس

رنج و غم کی اس سے بڑھ کر عبرت انگیز تصویر نہیں کھینچی جا سکتی عاشق جس کا فضل و کمال اور عقل اور سمجھ عموماً مسلم ہے ، عاشق ہو کر تمام فضل و کمال اور عقل کھو چکا ہے ۔ وہ اسی حالت پر طرفہ تماشے تو عیاں آتا ہے کہ سمجھوں کی امید بر آئی ۔ اس کو کس موثر طریقے سے ادا کیا ہے ۔

جان رفت بر سری و در رعنائی ہنوز   در بیابان دیدی و در رعنائی ہنوز

گفتی اندر خواب گر کہ روئے خوش نمایید   ای کس کہ باز آگو آشنا را خواب نیست

غمزۂ تو بر دل سلطان زند   زر ہر رگی بر دل رو نشستہ ہم

یعنی تیرا غمزہ بادشاہوں کے دل پر حملہ کرتا ہے ۔ اور تیرا بہانہ ان تو فقیروں پر بھی " زر ہر رگی " سے کس قدر عاشقانہ حسن طاہر ہوتا ہے ۔

کشم از تیغ عاشق جزیں ؟؟   بر تو آسان کردم نیز جو لیس ہم

من کجا حسبم کہ از دریا دم   سنت کی حسد کھینچے بر لوٹے تو

صبر طلب میکند از دل عاشق   محو جرأت کہ بر خواب بوسید

یعنی معشوق ، عاشق کے دل سے صبر چاہتے ہیں ۔ یہ ایسی بات ہے کہ خواب میں بوسہ لیں ۔

لگایا جائے ۔

اے دیدہ جز بری از دروں آب   کیں شعلہ بہ جان گرفت ما را
اے خواب بروکہ بار امشب   سودائے فلاں گرفت ما را

اے عشق تا بکو جوں ناکسے نماند   گویا کسے نماند جہاں خرابہ را

دل ندارم غم جاناں چہ توانم خورد   پیش ازیں گر غمے بود دلے ہم بودہ است
کس چو داند کہ چہ رفت از غم لیدن بمن   از سبب بیرہ جہد یہ من کہ کرم بودہ است

ما بہ دوستاں جاناں جفا کن   ہر آں تیرے کہ بر قلبیں خطا شد
دل ماز سوئے آں دست لم تو چہ مرد   آں تو گرفتہ بار دراں کو چہ مرد

گریہ حتی دل ویرانِ مرا   گو نمایند گر آباد نہ بود

کافرے رفت دلم غارت کرد   شہر اسلام دمرا داد نہ بود

____________ میرا انتخاب یہ کہا گیا

کرشمہ چیار کسی بر من آخر این جان است   کی رند رزمن وصبا می آرد

اس مضمون پر میں سو برس کے بعد آپ نے یوں ریشہ دوانی کی ۔

کرشمہ حسد کسی بر من آخر این جان است   می رند رزمن آسمان می بارد

رسیم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم   پس ازاں کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

جدت اسلوب غزل کی ترقی کا تو رونا ۔ لطف ادا ۔ اور جدت اسلوب ہے جس کے موجد شیخ سعدی ہیں ۔ لیکن پھر وہ نقش اول بس تھا ۔ امیر صاحب کی طبیعت نے جدت اسلوب کے سیکڑوں نئے نئے پیرائے پیدا کر دئے ۔ جو آگلوں کے خواب و خیال میں نہ آتے تھے ۔ مثلاً یہ مضمون کہ معشوق ظلم و ستم کے ساتھ بھی محبوب ہے یوں ادا کرتے ہیں ۔

جان رفت بر سری و در رعنائی ہنوز   زندہ بادی و در بالی ہنوز

مثلاً معشوق کی گراں قدری کو اس پیرائے میں ادا کرتے ہیں ۔

ہر زہ عالم ہمہ خونِ کشتہ   رح بالا کن کہ ارزانی ہنوز

معشوق کی آنکھ کو سب لوگ خمار زدہ آلودہ باندھتے تھے ۔ اسی مضمون کو خواجہ صاحب نے کس انداز سے کہا ہے

ے حاجت مستیم را   در چشم تو خمار باشد

معشوق کا عاشق کے رنج و غم سے خوش ہونا عام مضمون ہے اس کو کس لطف سے ادا کیا ہے ۔

گل چہ داند کہ درد بلبل چیست   از ہمیں کار رنگ و لو دانند

معشوق سنتا ہے ادائوں کو چھوڑنا چاہتے ہیں ۔ اس کو یوں باندھتے ہیں ۔

عاشقان و دل بیمار جان گردنی دارد — مسلمانی ما چو زنّار زلف و چشم مسلمان را

رخصت کے وقت معشوق کو ٹھہراتے ہیں کہ میرے آنسو تھم جائیں تو جانا ۔

می روی و گریہ می آید مرا — ساعتے بنشیں کہ باران بگذرد

لطف اور بیمی نگاہ کی تاثیر کا فرق ۔

کشتم خلقے می کشی در دیدہ می کنی — از یک نگاہ کشتی و نگاہ دگر بکرد

سعدی کا شعر ہے ۔

دستان منع کنید کہ چیا دل بہ دلبرم — یا دلبرِ ما بگوئید کہ چشم تو سیرانی

پہلو۔ اگرچہ پیرایہ معنی کی حیثیت سے اس قدر اعلیٰ رتبے کا تھا کہ اس پر ترقی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن امیر صاحب نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا ۔

جراحت مگر نمک دان چون پری — زخمہ ترس کہ من سوختی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ بدیع اور پسندیدہ کر دیا ہے ۔

نظیری۔ کہیں اُن کے رستا ناز کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی آمد کی دلفریبی کو اس طریقے سے ادا کرتے ہیں ۔

بے رقیب تقوی و آخراس میدانی — کہ رشتۂ مسلمانان بیاد این چنین آمد

اس مضمون کے ادا کرنے کا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ معشوق کے آنے سے لوگوں کے زہد و تقوی میں فرق آتا ہے۔ بجائے اس کے خود معشوق سے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے شب میں یوں نہیں آیا کرتے۔ گو یا معشوق کا فتنہ انگیز ہونا اس قدر جلد سے بڑھ گیا ہے کہ اپنی حالت کا خیال نہیں۔ بلکہ یہ ڈر ہے کہ اسلام کی حالت خراب نہ ہو جائے

معشوق کی بانکی لطف کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں ۔

دلِ زلف و خراب و ما و رانده بینیش — ما بوئے مست و ساقی مدہوش پیمانہ را

چشمِ شوخ نے اسی خیال سے ایک اور لطف خیال پیدا کیا ۔

شراب لطف و رخام میرزی و مترسم — کہ زود آخر شود این بارہ و من در خمار افتم

الفاظ صرف لفظوں کی الٹ پلٹ سے عجب لطف بات پیدا کر دیے ہیں

چشم بد دور از جیان روئے — کہ از چشم دور نو ان کرد

مرمان ورزش بہ دزدی من خراب شد — من در آن کس کہ ترا شد خراب تو

لعیتم باخوش خبر افی خسرو را — خون کم آن دندان مالا خوش خب

گفتم کہ ترا ہمیں دہ سلام — گر ہست نماز من آن است

دست بیرہ کم از زرد است — رخ زخور بہ سیم درہ کم نیست

ایہام یعنی ذو معنی الفاظ سے عجیب عجیب نئے پیدا کرتے ہیں ۔

ماں محبت من یعنی دِل من ترکی نمی دانم — چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من

چنیں از پیر خود ہم عجب بود — کہ دلم ہیچ دلستان نبرد

تو بری ہمہ لقیں مرا — بلا بلقے کو کس گمان مرد

دی رد سے تو دیدم و نہ مردم — شرمندہ نمایدہ ام زود ب

دیگران بیست کرمن رہبر دزدیم — ساقی قدحے باز کہ زرے نو سم

الفاظ کے جلد حروف باطلاق تحلیہ سے عجیب عجیب لطیفے پیدا کرتے ہیں اور یہ آن کا خاص میدان ہے ۔

بیروانہ بادا وسرر آن باشے — اگر چہ سے تک ہر دہان ہم

عمر تو بوصف سلطان رہ — ورنہ رگی بر دل درویش ہم

رسکم آید کہ بر مرہس تو نام دگران — دگرانصاف تو پرستی تو ہم تواں کہ

لسم از بیچ جا خویش را — بر تو آسان کردم زیر خویش ہم

عمے نزارم کہ باز از دوستان رود — محی دوستی کر دشمنان ہم

واقعہ گوئی اور معاملہ بندی

مولوی غلام علی آزاد خزانہ عامرہ میں لکھتے ہیں ۔

"معلوم باید کہ معاملہ ابنائے سخن بزار شیخ سعدی کہ مروج طرز غزل است حال حالی و وقوع گوئی ہم دارد مثل این بیت

دل دعا ہم تو مشغول و نظر جت و راست — تا ندانید رقیبان کہ تو منظور منی

و انا باشیخ نعت و ماوی امیر خسرو دہلوی کہ معاصر شیخ سعدی است بانی وقوع گوئی گردید و اساس آن را بلند ساخت"۔

عشق و ہوس بازی میں جو حالات پیش آتے ہیں ۔ اُن کے ادا کرنے کو وقوع گوئی کہتے ہیں ۔ اہل لکھنؤ نے اس کا معاملہ بندی نام رکھا ہے بہرحال اس طرز ادا کے موجد صاحب کمال آزادی کے لکھا امیر خسرو ہیں ۔

شرف قزوینی۔ ولی۔ دست غامی اور وحشی یزدی نے اس کو ترقی کی حد تک پہنچا یا۔ آزاد نے وقوع گوئی کی مثال میں امیر خسرو کے اشعار پیش کئے ہیں ۔

خوش آن زمان کہ بہ دلیس اطرہ بہ کہم — جو بینم مرا بگردانہ بطر تکر دام

غلام آن تبسم کہ باہم جو جانانہ — بہ تبسم کہ کہ از در گہ مہ برلبش

تو زلیخا بر در من سیاہ دوران لعل لبت ن — گر بہ را است ساعد کس طرف بیاری آمد

امیر صاحب کے کلام نے زیادہ تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر قسم کے نازک و لطیف اور نئے نئے امر معاملات ادا کئے ہیں ۔

حد نو مید کہ بہ کہہ نہ سیل مکاری — اس مدت سے کہ بہ دل مائل کہ

یعنی لوگ کہتے ہیں امیر خسرو کا مجھ کو کبھی کبھی یاد کرتا ہے لیکن ۔ بات تو لوگ تسلی دینے کے لئے بھی کہہ دیا کرتے ہیں ۔ اس لئے کیوں کر اعتبار آئے ۔

جانا اگر سبب دہن بردہیں ہم — خود را گواب ساز نگوئیں وہاں کسب

معشوق سے کہتے ہیں کہ اگر میں بھی رات کو تیرے منہ پر منہ رکھ دوں تو اپنے آپ کو سوا بنا لیا

یہ نہ کہنا کہ اس نے بوسہ لیا ہے۔

دل میں سب تو رد قصہ دوست — گفتم انجام دگر رآغاز حکایت

اندک اندک گفتہ ما بار بردن جوش بود — درمیہ گریہ وعم صبا بودن ہم جوش است

شیشے کی ساقی بریلوی اشک — کہ ہو جستم مستی برخمار دار

مست آں دو چشم کہ سب وکوی حریم وگرد — گفت اس اگر مستی گدائی مکنند

جان بادفدات آں دم کہ بعد دوسہ تو — گویم کہ کجے دگر گوئی تو کہ تو آئم

وعدہ میکو آہم دد بعد دوبار سیم — عرض آنست کہ بارے بہ تقاضا آئم

روزمرہ اور عام بول چال

عموماً شعراء اور اہل فن اپنے کلام کا عام بول چال سے برتر سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک جداگانہ زبان پیدا ہو گئی ہے جس کا نام علمی زبان ہے۔

سعدی و نظامی وغیرہ کی زبان اگر بولنے کی قلم بند کی جاتی تو بوستان اور سکندر نامہ کی زبان سے صاف الگ نظر آتی۔ لیکن آج اگر اس عہد کی بول چال کی کوئی کتاب ہاتھ آجائے تو ہم کو سمجھنے میں دقت ہو گی۔ لیکن شاعری کا سبب بڑا نقص ہے بے شبہ شاعری اور عام تصنیف میں ایسے بہت سے مضامین اور خیالات ادا کرنے پڑتے ہیں جو عام زبان میں ادا نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان کے لئے علمی الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ضرورت کے علاوہ اور موقعوں پر بھی یہی مصنوعی زبان استعمال کی جائے خصوصاً غزل کی زبان روزمرہ اور عام بول چال ہونی چاہئے کیونکہ عاشق و معشوق علمی زبان میں باتیں نہیں کرتے۔

قدماء میں فرخی اور متوسطین میں سعدی اور امیر خسرو نے خاص اس کا خیال رکھا کہ روزمرہ اور عام بول چال کو زیادہ وسعت دی جائے۔ سعدی اور خسرو کے کلام میں جو روانی سستگی اور صفائی پائی جاتی ہے اس کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔

امیر صاحب کی غزلیں اکثر اس زبان میں ہوتی ہیں کہ گویا دو آدمی آپس میں بیٹھ کر بالکل بے تکلف اور سیدھی سادی باتیں کر رہے ہیں۔ اس میں کہیں کہیں خاص خاص محاورے بھی آجاتے ہیں جو آج ہم کو اس لئے کسی قدر نامانوس معلوم ہوتے ہیں کہ ہم کو اس زمانہ کے روزمرہ کے محاورات سے واقفیت نہیں۔

دل لیسے بردۂ نکوئست باش — آں کہ محروح برابر اوں جی اسد

یعنی تم نے سب سے دل لئے ہیں۔ خوب کر کے رکھو۔ جو سب زخمی ہو ... میرا دل ہے ...

صبح روئے تو بدیشان کہ برآمد امروز — بیسب انکاں کہ جو میں بوقت تا نتا مکسار[1]

لب زدہ یاں درجمہ ہر کجے ملاتے دراہا — نے دلم تدلد۔ جانب کدام تو د

یعنی تیرا لب دونوں اور چہرہ سب مانس میرا دل کیا کرے۔ کدھر کدھر جائے۔

گفتم اے دل مرد آسی اگر بیتا شوی — جانب رزت ہما ں گفت من پیش آمد[2]

حلقے براہ منتظر جاں سپردن آمد — اے ترک یم مست عناں باکشیدہ تر

درہائے روکے ہوئے

بوسہ گفت دو راہاں گرد ابیاد — خود ہمی گوید دہے گرد اہد

بوسہ دینے کو کہا۔ اور پلٹ گیا۔ آپ ہی کہتا ہے اور آپ ہی پلٹ جاتا ہے۔

بوئے خوشم آمد از تو دو رجیب — گل داری یا ہمیں ست بو دست

تیرے بدن سے خوشبو آرہی ہے۔ میری جیب میں پھول ہے یا تیری بو ہے۔

خشک سالیست دریں عہد وفا را اے اشک — راں حوالی کہ توی آی باراں چوں آ

اے گل دہن تنگ مدتنگ تکو چرے — گل بالوی مادر رحس مکر چرے

گویم دو درم ہم گوئی کہ ترخواہم — بسم اللہ اگر خواہی زیں ہر دو ترچرے

چو سبزہ جوش زدخط تو خوا ہد جائے آں باشد — کہ گل از حدہ سر جاک اوفتد عنو تکلم گرد

یعنی سبزہ خط جب سرے خط کی برابری کرے تو یہ زیبا ہے کہ پھول میسے جیسے زمین پر لوٹ جائے اور غنچہ کے سٹ میں مل جائیں۔

دلم میجواسی بر ہم عفاک اللہ چناں دیگی — مرا میخواسی رسوا الحمد اللہ کہ آں ہم شد

لے صبادی کہ دلا لے تکس نے میجوارد — صبح یادِ من گرکتہ زنداں کرد

ارکجا آمدی اے باد کہ دیوانہ شدم — بوئے گل مست کہ می آمدم اس لوے کسے آ

دل من دور زرد رعب مست گرم مدام — بار خو ہمیں جانتے کہ دارکوئی کسی آست

منتظر می شوم قبلہ رو دست جہ کنم — کہ ز ابروے تو چشم بہ محراب افتد

تیرا چہرہ دیکھ کر مجھ کو نماز میں دھوکا سا ہوتا ہے — کیونکہ مجھ کو تیری ابرو سے دو محرابیں نظر آتی ہیں

رخ حلہ را نمود و مرا گفت تو ہمیں — زیں زدوں مست نہ بچم کان تکن چہ بود

سب کو منہ دکھلایا اور مجھ سے کہا کہ تو نہ دیکھ — میں اس بات میں مدہوش ہوں کہ یہ کیا سبب ہے

سالکاں بر کوئے تو ما سیہ پوش — کاں زمینے است کہ آنجا ہمہ محوں خیزد

رحمت کا رزاں مصریں باراج کافر شد — مسلماناں کسے دید مسلمان کا مدرسہ پر راہ افتد

مسلمانوں کسی نے شہر میں بھی ڈاکہ پڑتے دیکھا ہے

بہ بازی مستے میں آمد نستوی دل زمن بستد — بدگمان چہ خواہی کرد کعبا کار می آید

عام محاورہ ہے کارآمد بہ کار می آید۔ امیر صاحب کے سوا اور کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گذرا۔

حسن تو عالمے بخواہد سوخت — ہم زرآ عارضی توان دانست

برخ کرد می بہ بوستہ جائے — ساده بخرید زرائگاں دانست

دلوے ایک بوسہ کی قیمت جان قرار دی — میں نے خریدا اور یہ سمجھا کہ مفت لیا

ارمہرآں کہ لاف جمال دمید زند — صد بار لالہ مرد جی یا ہمیں رکسب

ما جائے بدا سے جسم تسلیم کردہ ایم — خواہی بکش خواہ بکش رائے رائے تست

---

[1] سامنا تمام کشیدیں تمام تک زندہ رہ جاتے [2] یعنی وہی میرا کہنا سامنے آیا۔

ساقی بیا، می کہ جہاں سوخت دل از عشق   گر سوز ایں کباب ہمہ خاک ہو گرفت

راست گردی زاہداں محراب   می نماید نماز خواہی کرد
(زاہد دوتا ہے تو محراب درست کی ہے   معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کا ارادہ ہے)
من آں ترک طناز را می شناسم   من آں بادہ ناز را می شناسم
سرم باوہ تند جاں برو تمام مستی   تو بودی من آواز را می شناسم

با صبا جو از رخ او زلف دور بود   ابر بہ کشادہ شد و آفتاب کرد
تو حال من ہم ازیں زلف زردیدرخ   کہ من بہ ردے تو شد اغی تو ام کرد

سالہا شد کہ نام حرف دو کوئیت   دل دو بال سدرہ را آمد و آں ارکیم

...ار بہ زدہ گر زدم گریہ یار ایک سخن گوئی   تو مدام گوئی لب من گفتار میگویم
(مجھ کو معلوم ہے کہ تم یہ کہو گے لیکن میں بات کہتا ہوں)
دعوائے خوبہائے دل خویش مکن   یک بوسہ بہ ہم زن و بالا کلام کن

امیر صاحب نے ایسے بھی بہت سے محاورے باندھے ہیں جو اُن کے سوا اور اہل زبان کے کلام میں نہیں ملتے۔ مثلاً
ازگرہ او دیہ میرود
آہ از گرہ دن۔ پکارنا۔
گفتار میگویم۔ یوں ہی اک بات کہتا ہوں۔
بالا کلام کردن۔ کسی کو بات اور بند کرنا۔
اس بات نے بدگمانوں کو موقع دیا ہے کہ ہندوستان کی سکونت کا اثر ہے کہ چند ہندی محاورے ان کی زبان سے نکل جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ لیکن چونکہ ہم کو اپنے سمع اور استقرا پر اعتبار نہیں۔ اس لئے ہم اس بدگمانی میں شریک نہیں ہو سکتے

مسلسل غزلیں

غزل کا یہ بڑا عیب تھا کہ کسی مسلسل خیال کو ادا نہیں کر سکتی تھی۔ قصائد کا موضوع مدح ہے، مثنویاں قصے یا اخلاق کے لئے مخصوص ہیں۔ قطعات میں بھی اور اندازاً باتیں ہوتی ہیں۔ عشق اور محبت کے معاملات میں تفصیلی حالات بیان کرنے ہوں تو کیونکر کریں۔ اس کے لئے صرف مسلسل غزل کام دے سکتی ہے۔ لیکن قدما بلکہ متاخرین میں بھی اس کا رواج بہت کم ہوا۔ امیر صاحب نے البتہ اکثر مسلسل غزلیں لکھی ہیں اور خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس خوبی سے لکھا ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

مثلاً عاشق قاصد یا صبا سے بار بار معشوق کا حال پوچھتا ہے کہ کہاں ہے؟ اور کن لوگوں کے ساتھ ہے؟ کیا کرتا ہے؟ میرا بھی کچھ ذکر کرتا ہے کہ نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

دیکھو کس اشتیاق کس حسرت کس انداز سے یہ باتیں پوچھتے ہیں۔

اے صبا بازم بگوی کہ جاناں چوں است   آں گل تازہ و آں غنچہ خنداں چوں شد
باکہ مے میخورد آں ظالم و دور ہے خوردن   آں رخ برفروختہ وآں زلف پریشاں چوں است
چشم بدوش کہ ہشیار نباشد مست است   چشم مکوس کہ بخواب کند آں چوں شد
روے زلف بے عنبر کہ آں برز خوش آمد   دل بے نوا کہ من پہلوی ایشاں چوں شد
روز با شد کہ ہم رفت دوراں زلف بماند   یار ساں یوسف گم گشتہ بہ زنداں چوں است

پوچھتے پوچھتے دفعۃً خیال آتا ہے کہ معشوق کے ذکر میں اتنا تکرار خلاف عاشقی ہے اس لئے ان سب باتوں کو چھوڑ کر کس خوبی سے کہتا ہے۔

ہم کجا ز بر جاناں کہ کم و بیش مگوئے   گو ہمیں یک سخن راست کہ جاناں چوں است

یعنی معشوق کی جان کی قسم اِدھر اُدھر کی باتیں رہنے دے۔ صرف یہ بتا کہ معشوق کس حال میں ہے۔

معشوق نے روزہ رکھا ہے۔ اس پر عاشق کے دل میں جو جو خیالات پیدا ہو سکتے ہیں اُن کو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے۔

ماہ من روزہ بہ ماں سکرستاں دارد   اے خوش آں روزہ کہ جاں در لب جاناں دارد
لب بے آلودہ زباں بر شکر دیگر مست   اے مسلماناں کس روزہ بدیں ساں دارد
خضر گر بر لبش آمد شکند روزہ خویش   کاں لب سر درنہ لب چشمہ حیواں نہار
می خورد آخر رمضاں پنہاں مست   من گرفتم کہ خود او روزہ پنہاں دارد
جاں من گر تو قدم رنجہ کنی مدۃ تو   ندرے آب دو چشم و دل بریاں دارد

معشوق سروساماں کے ساتھ سوار آرہا ہے۔ عاشق پر حسرت طاری ہوتی ہے کہ کیا آسمان سے چاند اتر آیا ہے؟ یہ سرو کیسی چل رہی ہے؟ کیا ہوا پھولوں میں بس کر آ رہی ہے؟ پھر خیال آتا ہے کہ نہیں معشوق آرہا ہے۔ لیکن ان دلفریبیوں کے ہوتے کس کا ایمان سلامت رہے گا۔ اسلامی آبادی میں یوں نہیں آنا چاہئے۔ ان حالات کو مسلسل ادا کرتے ہیں۔

کہ می آید چنیں بار سے مگر مہ بر زمیں آمد   چو گر نیست امکہ مہر دگہ باعاشقی آمد
کہ می راند چست راکہ جاں بسراگیں شد   کداميں بادمی صندکہ بوے یاسمین آمد
بے دانت تقوی دآخر ایں بہ دانی   کہ در شہر مسلماں بیامد ایں چنیں آمد

بہار آئی ہے۔ عاشق باغ میں جاتا ہے مجلس آرائی کے سامان ساتھ نہیں۔ قاصد کو معشوق کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجتا ہے کہ باغ میں عجیب بہار ہے سبزہ لب جو اور عالم آب کی سر حال دیدنی ہے۔ قاصد سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں نہ ٹالنا چاہیے تو نہ آنا۔ جس طرح ہو سکے ساتھ لانا۔ اور اگر مستی میں ہو تو اسی طرح مست اٹھا لانا۔ ان تمام خیالات کو تفصیل کے ساتھ ایک غزل میں ادا کیا۔

آمد بہار و سار چمن و لالہ زار خوش   وقتیے خوش خوش بہار کہ وقت بہار خوش
در باغ بازار مسلسل زرمں ہوا   مستی خوش است و بادہ خوش است و بہار خوش
بانیم و مطربے وستراے و مجرے   جامے زیر سایہ شاخ چنار خوش
اے باد کاہلی مکن بہ رسے دوست زود   بارانکس بہ آمدن آں نگار خوش
چیرے دگر مگوے ہمیں گوکہ در چمن   سرو خوش است و آب خوش و جوئبار خوش

۱ے پیدا کردن۔ ظاہر کرنا۔ ۲ے وقت کے خوش بودن۔ دعائیہ جملہ ہے۔ یعنی خدا ان کو خوش و خرم رکھے۔

گرچوش ہمار را عدستے کہ بار کرد — پیشش کی وبار دشور بہار نوشش
ورپیمیں کرمست نوجستش مدہ — ہم بجا الست مست نہ بر زمیں آروس
می مست خوش برینی او کہ آن حریف — سرخوش خوش مست و مست خوش و ہوشیار خوشی
باانہدران زمان کہ محتسبؒ راہ می زند — باری خوش مست و مست خوش مست و کار خوش
سرپانہ خوش تو نباید رحمی و لیک — آن سرخوش پیانہ خوش مست و سوار خوش

بہار میں کیا کیا چاہئے ۔ اس کو تفصیل سے لکھتے ہیں ۔

ہنگام گل ست بادہ باید — جامی و حریف ساقہ باید
کز غنچہ گرہ زار روانگسد — پیمانی گل گشادہ باید
ساقی ز رخسار در بستان — گل ستہ کہ آن ستادہ باید
وانگاہ حراب بادہ دست — در دنگ می اوفتادہ باید

بہار کا سامان

بوستان جلوہ در گرفت ایک — گل ز رخ پردہ در گرفت ایک
آتش لالہ بر فرحت زباد — دامن کوہ در گرفت ایک
بلبل آمد تسب بر سر گل — نے نوا اودہ ز ر گرفت ایک
غنچہ در پیش صاحب ہد احولؒ — سینے تارہ بر گرفت ایک
ورق غنچہ را کہ تر شدہ بود — در قش یکدگر گرفت ایک

یعنی غنچہ کے ورق چونکہ کم تھے اس لئے چپک کر رہ گئے ۔

آب را گرچہ چشم پاک است — بوستان را نہ گرفت ایک

یعنی پانی گو پاک طینت ہے تاہم اس نے باغ کو سبزہ سے بٹالیا ۔

خار چون تیر کرد پیکان را — گل بصد نوسپر گرفت ایک
طوطی آمار شعر حسرو کرد — روئے گل در شکر گرفت ایک

جدّت

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں ۔ امیر صاحب کا دعوی ہے کہ انھوں نے سیکڑوں نئی تشبیہیں ایجاد کیں ۔ اور یہ دعوی بے جا بھی دعوی ہے ۔ ان کی ایک غزل بھی ایسی مل سکتی جس میں کوئی نہ کوئی نادر تشبیہ نہ ہو ۔ چند مثالیں ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں ۔

بار خون آلود خوش اے دل مسہ با من بر دلے
ان درون جام است تر اردے بر درون لو ابد گداخت

اے دل اپنا بھید مجھ سے نہ کہہ کیوں کہ یہ کاغذ کچا ہے اس میں حرف پھوٹ نکلے گا ۔

زلف او پہلو حال لب او — گوئی از تہید مگس می راند

مدہ دو مہ براوج در دست تار — تا زر لف تو نردبان نہ برد

یعنی چاند ابھی رات میں بلندی پر نہیں چڑھ سکتا جب تک تیری زلفوں کی سیڑھیاں

دکھاتے ہیں ۔ چہرہ کو چاند اور زلف کو رات سے تشبیہ دی ہے ۔

پست صحرا چون کف دست در دار لالہ جام — خوش کف دستے کہ چیدن جام صہبا گرفت

اس مضمون کو داعی مشہدی نے عجیب لطیف پیرایہ میں بدل دیا ہے ۔

دیدہ ام شاخ گلے بر دوش نی ہم کرسا کس — می توانستم یک دست از دو نزد ساغر گرفت

یعنی میں نے ایک ڈالی پھولوں سے بھری دیکھی ۔ اور تڑپ گیا کہ کاش میں ایک ہاتھ میں اسے ہی سالے لے سکتا ہے ۔

جام نرگس ستم کر باد او نگاہ — قدح بدست گرفتہ نخواب رغرد

گلستان نسیم سحر یاد است — صبا صبو لحتہ در یافتہ است
چنان خواب دیدہ است نرگس خواب — کہ گو یا کہ جام زر یافتہ است

نرگس کے پھول میں جو زرد کٹوری ہوتی ہے اس کو جام زر سے تشبیہ دیتے ہیں ۔ اور یہ تشبیہ عام تھی ۔ لیکن اس اسلوب بیان نے کہ نرگس نے خواب میں دیکھا کہ اس کو جام زر ہاتھ آگیا ہے ۔ ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے اور چونکہ نرگس کو محو راز خواب آلود باندھتے ہیں ۔ اس لئے خواب دیکھنے کی توجیہہ واقعہ کا پہلو رکھتی ہے ۔

میرودی دگر نہ ے آید مرا — سا عیے مستی کہ باران بگذرد

آنسو کی جھڑی کو سب بارش سے تشبیہ دیتے آتے ہیں ۔ لیکن یہ بالکل نیا اسلوب ہے کہ معشوق سے کہتے ہیں کہ تیرے جانے کے رنج مجھ کو رونا آتا ہے ذرا ٹھہر جا کہ بارش تھم جائے ۔

مزید لطف یہ ہے کہ معشوق کا جانا ہی اس بارش کی علت ہے اس لئے وہ جانا چاہے گا تو بارش ہوگی ۔ اور وہ اس لئے کبھی نہ جا سکے ۔

مے میان ستینۂ سالی نگر — آلتے گویا نہ آب آلودہ اند

ابر آمد و نہ ساغر لالہ سراب کرد — در گوشہ ہائے باغ پسے در باب کرد
واستن باغ بار گو خود باغ از — وا گہ تر آب ترگہ نسیم ارحباب کرد
نرگس کرفت کف ز رباد ملبلان — جادو مرہ بالش گل میل خواب کرد

مضمون آفرینی

خیال بندی اور مضمون آفرینی کا موجد کمال اسمٰعیل خیال کیا جاتا ہے ۔ لیکن کمال کی جدت قطائد کے ساتھ مخصوص ہے ۔ غزل میں اس نے اس رنگ کی مطلق آمیزش نہیں کی ہے ۔ غزل میں نئے نئے معانی اور نئے نئے اسلوب پیدا کرنا امیر صاحب کی ایجاد ہے اور انھیں پر خاتمہ بھی ہو گیا ۔ متاخرین کی مضمون آفرینیاں گو حد سے بڑھ گئیں لیکن اس کا دوسرا انداز ہے ۔ وہ اور سلسلہ کی چیز ہے جو آگے چل کر اس کی حقیقت کھلے گی ۔

امیر صاحب کی مضمون آفرینیاں مختلف قسم کی ہیں ۔ مثالوں سے اندازہ ہوگا ۔

نہ جانہ تو ہمہ روز ربا مداد بود — کہ آفتاب بیار دتندی لمدا ہما

لہ طبیعت ہے نوسقی ۔

تیرے گھر میں مشک صبح رفتی ہے ۔ گویکہ وہاں آفتاب اونچا نہیں ہو سکتا

زلف تو سیہ چراست ؟ ما نا — سیار در آفتاب گشت است[1]

شتہ می شوم قد راست پیشم — کز ابروے تو چشم دو محراب افتاد

چشم مست تو کہ بی برمن نیاسایم افتاد — تو مگر دری از آلودگی خواب افتاد

ہر آن چیس تاریک باشد عارہ چشم — کہ ہرگز آفتاب من درین روزن می آید

پیش تو آفتاب نتوان گفت — رو در روے چراغ نتوان کرد

می روی دگریہ می آید مرا — ساعتے بنشین کہ باران بگذرد

دل من در زلف و روے تو اسیر دہر بگذرد — شب ماہتاب و دردے کہ بخانہ در آمد

ریخیہ عمر و یار عاشقان گر — شب ہجران حساب عمر گیرند

یعنی اگر شب ہجر کو بھی شامل کر لیا جائے تو عاشقوں کی عمر کس قدر بڑی ہو تی ہے ۔

زلف ایران می برد آن توجہ کہ بتہایت کم — گر شود کوتہ ایران حاجیہ تو بد کشد

یعنی اپنی زلف دراز اس لئے بڑھاتا ہے کہ میرے عمر کی راتیں چھوٹی ہو جائیں تو ان میں جوڑ لگا کر بڑھا دے ۔

راہے است ہرائے برین دل — ابروے تو کہ میان کشاد است

یعنی تیری دونوں ابروؤں کے درمیان جو فاصلہ ہے ۔ اس لئے کہ دل لیجانیکے لئے راستہ ہے ۔

زلفت سرو ما شکستہ ران است — کہ سر در ملہ سب او فتاد است

یک شب رخ خویش چراغم کرم کن — تا قصہ اندوہ تو ہم پیش تو خوانم

یعنی کسی رات کو اپنے چہرہ کا چراغ عطا کر دو کہ میں اس کی روشنی میں اپنا قصۂ غم تمہارے سامنے پڑھ کر سناؤں ۔

خانہ چشم من خراب شد است — کہ بہ یاد خانہ تم رفتہ است

کیسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی — مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

شکرین لعل تو کہ ناں نمک است — گر چہ شکر نہ مکاں نمک است

آب از روے تو ملاحت افزود — گر چہ از آب زیاں نمک است

خواہی اے جان بہ خواہ کہ تم بات کریں — مردنی مستم امروز کہ جاناں آمدہ است

آمد کہ گرد حسن وے از آسمان سوال — برخاست آفتاب و بہ زانو سوال کرد

یعنی اس کے حسن نے آسمان سے آمد مانگا ۔ آفتاب نے ادب سے زانو ٹیک کر کہہ کر حاضر ہے ۔

سر ابروے تو گر دم گرہ بستی باز کشتی — کہ کمان را بدارۂ بازوی کسی است

ہر چند کہ زلف تو سیاہی است جانا[2] — زن گونہ پریشان نتوان کرد سپہ را

رسانہ حصۂ مردم من کہ یار آمد و گفت — چہ حصہ کہ رسد آفتاب در سایہ

اکثر شاعرانہ اجتماع النقیضین نام کرتے ہیں اور وہ طبیعت پر استعجاب کا اثر پیدا کرتا ہے ۔

ع ۔ دردیہ وادی دور دانی ہور ۔

ع ۔ یار یاد آنکہ ہمہ عمر یہ کردی یادم ۔

امیر صاحب نے امحارِ حسرت میں صنائع و بدائع پر اس قدر صرف کی کہ ہم کو ڈر تھا کہ جو حال انہوں نے کہا اس میں خود پھنس جائیں ۔ لیکن یہ محض حسن اتفاق ہے کہ جن جن لوگوں نے صنائع و بدائع کو پسند کیا اور اس پر مستقل کتابیں لکھیں ۔ مثلاً فرخی و انس المعر وغیرہ وہ خود اس بدعت سے محفوظ رہے ۔

امیر صاحب اور دوں کی بہ نسبت کسی قدر آلودہ ہیں ۔ تاہم ان کے صنائع بہت سے بے تکلف بھی ہوتے ہیں اور اس حد تک نہیں پہنچے کہ نکتہ گری کی زد میں آجائیں صنعت طباق یعنی اضداد ان کی خاص مرغوب چیز ہے اور وہ اس کو بڑی خوبی سے باندھتے ہیں ۔ ع

درد یاوادی و درمانی ہور

زندہ و جہان آزاد گردم — اگر تو ہم نفس بندہ باشی

من زلف راکشتی بعمرہ — کرم کردی آنہسی زندہ باشی

گفتیم با خوش خواتی خسرو — چون کنم ؟ آن شکل ذات بالا خوش است

بندہ را در غم تو مست خبر — ہمہ یاران بندہ را خبر است

خردسالے ہمی کند بیداد — اے بزرگان شہر داد دہید

عربیت

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امیر صاحب کو عربی علم ادب میں کمال تھا اور اس فن کی یادگار میں ان کے حافظہ میں محفوظ تھیں ۔ تاہم ان کو اس فن میں دعویٰ نہیں بلکہ کلام کے دیباچہ میں عربی کے چند اشعار لکھے ہیں جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ باوجود اعراب کر

---

[1] علاً ۔ جیسے دھوپ میں پھری ہے ۔ [2] چراغ کردن ۔ چراغ جلانا ۔

گے ان کو اس زبان پر کس قدر قدرت ہے۔ اشعار یہ ہیں۔

ذاب الفؤاد وسال من عینی الدم   وحلی الدوامع کل ما اما اکتم

دل پگھل گیا اور آنکھوں سے خون بہا   اور آنسوؤں نے وہ سب کہہ دیا جو میں چھپاتا تھا

واذا اعب لدی الوری کرب الہوی   شکی الاحبۃ والاعادی ترحم

اور جب میں لوگوں کے سامنے عشق کی تکلیف بیان کرتا ہوں تو دوست روتے ہیں اور دشمنوں کو رحم آتا ہے۔

ما عادل العشاق دعنی باکیا   ان السکوت علی المحب محرم

او ناصح اور مجھے رونے دے   چپ رہنا عاشق پر حرام ہے

من بات مثلی وھو یدرک حیلتی   طول اللیالی کیف بات متیم

جو شخص میری طرح رات گذارے وہ البتہ سمجھ سکتا ہے کہ عاشقوں کی رات کس طرح گذرتی ہے

اکثر حضرت امیر نے عربی زبان میں خطوط لکھے ہیں جن سے اُن کی عربیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ان میں قافیہ بندی اور لونکلفات ہیں لیکن یہ اس زمانہ کا عام انداز تھا۔ یہاں پر الزام نہیں آسکتا۔

وان انا الا من غزیۃ ان غوت   غویت وان ترشد غزیۃ ارشد

میں بہرحال قبیلہ غزیہ کا آدمی ہوں۔ غزیہ گمراہ ہے تو میں بھی گمراہ ہوں اور وہ ٹھیک راستہ پر ہے تو میں بھی ہوں۔

صنائع وبدائع

امیر صاحب نے صنائع وبدائع میں زور دار آوریاں صرف کیں اگرچہ کوہ کندن وکاہ برآوردن ہیں لیکن اس لحاظ سے کہ ان کی محنت بالکل رائیگاں نہ جانے پائے۔ ان کا اجمالی تذکرہ کرنا ضرور ہے۔

ان میں سے بہت سی صنعتیں وہ ہیں جو عربی میں موجود تھیں لیکن فارسی میں ان کا ادا کرنا اس لئے مشکل تھا کہ فارسی زبان کی کم وسعتی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً صنعت منقوط یعنی عبارت میں ایسے الفاظ لانا جن کا ایک ایک حرف نقطہ دار ہو۔ امیر صاحب نے اس قسم کی صنائع میں صفحے کے صفحے لکھے ہیں۔ بعض فارسی میں تھیں لیکن ایک آدھ سطر سے زیادہ کوئی شخص نہ لکھ سکا۔ امیر صاحب نے ورق کے ورق لکھے۔ بعض صنائع میں انہوں نے تصرفات کئے۔ اور بعض بالکل خاص ان کی ایجاد ہیں۔ چنانچہ ہم انھی کو مختصر طور پر لکھتے ہیں۔

ذوجہتین

یعنی ایسی عبارت لکھی کہ نقطوں کے ردوبدل سے دو مختلف زبانوں میں پڑھی جا سکے اور بامعنی ہو۔ امیر صاحب نے اس صنعت میں کئی صفحے لکھے ہیں لیکن کاتبوں کی غلط نویسی سے ان کا صحیح پڑھنا ناممکن ہے اس لئے صرف ایک آدھ سطر پر اکتفا کرتا ہوں۔

رسیدی۔ بدیدی۔ مرادی نمائی   زبانے نباشی۔ بیاری نشانی

اس شعر کو اگر فارسی میں پڑھیں تو اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔ کل تو آیا اور تو نے مجھ کو ایک مکان میں دیکھا ایک ذرا ٹھہرجا تو دوستی کر کے قابل ہے۔ لیکن اگر اسی کو عربی میں پڑھیں تو یوں پڑھ سکتے ہیں۔

رشیدی بندی بمرادی بمعانی   رومانی بنایی بتادی بشانی

تو میرا ہدایت یافتہ ہے۔ یہ سطر ہے میری مراد ہے میری نجات ہے۔ مجھ کو اس بات نے ناامید کیا کہ عورتیں باہم لڑتی ہیں۔

قلب اللسانین

بہت اشعار لکھے ہیں کہ فارسی میں ہیں لیکن اگر ان کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جائے مثلاً

بسی یا کامرانی در جہاں باش

بی باش نکار ساز انی۔

یا بی یار با کہ کاری کیسہ نیم۔

دو دست بیاری۔ نہ باری یا آئی۔

بکن داد و بخشود کامران باش۔

ان تمام مصرعوں کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جاتی ہے۔

وصل الحرفین

یہ وہ صنعت ہے کہ جس قدر الفاظ عبارت میں آئیں ان میں کہیں کوئی حرف الگ نہ آنے پائے۔ بلکہ دو دو۔ یا تین تین حرف کا لفظ ہو مثلاً

چاکر۔ جامہ۔ حاجی تر تابی۔ سرچشمہ۔ بربام می بالد۔ دمی گوید کہ

مدیں جامہ خاطر با فرحت دریں می باشد باید کہ گہہ گہہ جامہ نامہ فراہم

تا ہر جوشی کہ بر راست فرحی کامل باید۔

یہ اس صنعت کا نقیض ہے جس کا ہر لفظ الگ الگ حرفوں میں لکھا جاتا ہے مثلاً

در۔ دور۔ رو داد۔ آورد۔ زرداد۔ داری۔ دراری۔ دلدار۔ دا ۔۔۔

دادر دوران را الخ

امیر صاحب نے اس صنعت پر کئی صفحے کی عبارت لکھی ہے۔

اربعۃ الحروف

اس صنعت پر امیر صاحب کو بہت ناز ہے کئی کئی سطروں کی بامعنی عبارت لکھی ہے اور یہ التزام کیا ہے کہ صرف چار حرف یعنی الف۔ ت۔ واو۔ ے کے سوا اور کوئی حرف نہ آنے پائے۔ یعنی تمام الفاظ صرف انہی حرفوں سے بنے ہیں لیکن جو عبارت لکھی ہے۔ وہ بالکل مہمل معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کا پڑھنا سخت مشکل ہے۔

معجزۃ الالسنۃ والشفا

اس صنعت پر بھی ان کو ناز ہے۔ اس میں ایسے الفاظ جمع کئے ہیں کہ سطروں کی سطریں پڑھتے جاؤ لیکن کہیں ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوگی۔ صرف حلق سے تمام الفاظ نکلیں گے۔

ترجمۃ اللفظ

باقی صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیے

ڈاکٹر تارا چند

امیر خسرو اور ہندوستان

یہ کسی ملک میں یہ کسی زمانہ میں ایسا ہے کہ سب لوگ ایک مذہب رکھتے ہوں، ایک نسل سے ہوں، ایک زبان بولتے ہوں، سب کی رسمیں ایک ہوں اور ان کے خیالات میں کوئی فرق نہ ہو۔ ہر ایک ملک کی آبادی بھانت بھانت کی ملتوں اور قسم قسم کے گروہوں سے مل کر بنی ہے کوئی قوم ایسی نہیں جس کے بارہ میں یہ کہا جا سکے کہ اس میں تنوع نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ قومیت کا تقاضا ہے کہ نسل، مذہب، تمدن، زبان کی کثرت میں سیاسی وحدت کا جذبہ جاری اور ساری ہو۔

آج ہمارے ملک میں قومیت کا احساس پیدا ہو چکا ہے لیکن ابھی پختہ نہیں ہوا ہے۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ ہم ہندی قومیت کو ساجھے کا معمولی مظاہرہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے خاص اہمیت دیتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے اختلافوں کو بنیادی مان کر ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں یقین نہیں ہوتا کہ یہ ضروری نہیں کہ مذہب اور زبان کے فرق قومیت کے راستے میں حائل ہوں۔ اسی شک و شبہ کا نتیجہ ہے کہ ہم ہندوستان کی تاریخ خصوصاً پچھلے زمانہ کی تاریخ کو علم کی شفاف روشنی میں نہیں بلکہ عداوتوں کے گرد و غبار کے دھندلکے سے ڈھکا ہوا دیکھتے ہیں۔ چونکہ قومی احساس کے بننے بگڑنے میں تاریخ کا گہرا اثر ہوتا ہے تاریخ لکھنے والوں نے اس پہلو پر جتنا چاہئے غور نہیں کیا۔ تاریخ قوم کی لمبی اور پیچیدہ سرگذشت کی یاد ہے اور جس طرح کسی آدمی کی انفرادیت اس کے کارناموں کی یاد ہے جو اس کے ذہن میں محفوظ ہیں اسی طرح تاریخ قومی کارناموں کا وہ جداگانہ سلسلہ ہے جس سے قوم اپنی نسلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھتی ہے۔ تاریخ دانوں کی غفلت اور بے راہ روی ملک کو خطرہ میں ڈال سکتی ہے۔ ایسی روایتوں کی غلط تعبیر سماج کے بندھن گڈمڈ کر سکتی ہے اس میں شک نہیں اس معاملہ میں ہمارے برطانوی حکمرانوں نے جوڑ توڑ چلائی اس کے نتیجے ہمارے لئے بدبختی کا باعث ہوتے اور اگر اب بھی ہم نہ چیتے تو آئندہ کے لئے سخت نقصان پہنچانے والے ثابت ہو سکتے ہیں۔

میری خواہش ہے کہ امیر خسرو کی زندگی کے کام سے ہندوستانی تہذیب اور تمدن کی تاریخ اپنے اصلی رنگ میں ملک کے سامنے آئے اور غلط فہمیوں کے دروازے بند ہوں۔ امیر خسرو کی تصنیفوں کا مطالعہ ہندوستان کی تیرہویں اور چودہویں صدی کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس میں ملک کی ملواں جلواں تہذیب کے نقش صاف نظر آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی مسلمان عالم، ماہر ادب اور زاہد اس زمانہ میں کیسے جذبے کیسے خیال رکھتا تھا۔ اسے ہندوستان کے ساتھ کیسی والہانہ محبت تھی اور وہ کس طرح اپنے وطن کو تمام دنیا کے ملکوں پر جن میں اسلامی ملک شامل تھے ترجیح دیتا تھا اس کے دل اور دماغ پر ہندوستان کا کتنا گہرا اثر تھا اور ہندوستانی فضا کس قدر اس کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ قومیت کا وہ جذبہ جو آج نظر آتا ہے اس زمانہ میں موجود تھا۔ آج سے چھ سو سال پہلے سماجی یا فردی زندگی میں اس کی تلاش الٹی گنگا بہانی ہے۔ پچھلے زمانہ میں سماجوں کا نظام آج سے مختلف تھا، رشتہ بندی کے اصول جدا تھے، ان میں سب سے زیادہ اہمیت نسب کو دی جاتی تھی۔ ہر ایک آدمی کسی خاص قبیلہ یا ذات سے وابستہ ہوتا تھا اور قبیلہ یا ذات کے لوگوں کا رشتہ کسی حقیقی یا خیالی مورث اعلیٰ سے جا ملتا تھا، سب فرد اپنے آپ کو اس کی اولاد سمجھتے تھے۔ اس طرح اس زمانہ کے ہندو اور مسلمان قبیلوں اور خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہندوؤں کے سینکڑوں قبیلے اور ذاتیں تھیں اور یہی مسلمانوں کی حالت تھی۔ سیاست کا دارومدار بھی اسی اصول پر تھا، نہ کل ہندوستان کی کوئی ایک ہندو جماعت تھی نہ کوئی ایک اسلامی۔ ہندوستان کے کچھ شمالی حصوں پر جو خاندان حکومت کرتے تھے وہ توران اور خراسان سے آئے تھے ان کا مذہب اسلام تھا مگر ان کی سیاست کی بنیادیں اسلامی نہیں کہی جا سکتیں ان کے کاموں میں اسلامی وحدت کا جذبہ کارفرما نہ تھا ان کی سیاست خاندانی اور عنصری مفاد پر مبنی تھی اور یہی صورت ہندو راجوں مہاراجوں کی تھی۔ یہ بھی غلط عقیدہ ہے کہ جو فاتح باہر سے آئے وہ مذہب اسلام پھیلانے کی غرض سے ہندوستان پر حملہ آور ہوتے اور یہ بھی کہ جن ہندو راجوں نے ان کا مقابلہ کیا وہ ہندو مذہب کی رکھشا کے لئے لڑے۔ دونوں طرف لڑائی زر، زن اور زمین کے واسطے تھی، دونوں طرف مذہب کی دہائی دینے والے وہ مولوی اور پنڈت تھے جنہیں تلوار اٹھانے سے سروکار نہ تھا۔ تاریخ کا ایک ایک صفحہ اس حقیقت کا شاہد ہے۔

محمد بن قاسم نے ۷۱۱ء میں سندھ پر حملہ کیا اس کے لئے غرض کی کون سی حجت تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ سندھ میں بدھ مذہب کا خاندان راج کرتا تھا۔ برہمن وزیر نے اس کے خلاف سازش کی اور تخت سے اتار دیا۔ عربوں کو خانہ جنگی کی خبریں ملیں کچھ شکایتیں لے کر لوگ حجاج تک پہنچے جیسے موقع ہاتھ آیا۔ سمندری ڈاکوؤں کا بہانہ لیا گیا۔ داہر سے معاوضہ طلب کیا گیا۔ اور اس کے انکار پر دھاوا بول دیا گیا۔ رعایا نے جو راجوں کے ظلم سے تنگ تھی حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔ سندھ کے شہر اور قلعے محمد بن قاسم کے ہاتھ آئے۔ دونوں میں سے ایک کے سامنے بھی کوئی مذہبی مقصد معلوم ہوتا ہے اور نہ

اخلاقی۔

محمود غزنوی کے حملوں کو مذہب کے گہرے رنگ میں رنگ دیا گیا ہے مگر تاریخ تلاشی نے یہ تعصب کیا ہے۔ سامانی خاندان کے امیر سبکتگین کے دل میں اپنے آقا کے خلاف آگ بھڑک رہی ہے، سبکتگین کا لڑکا محمود جو ایک جری سپاہی اور نامور سپہ سالار تھا امیروں کو خراسان سے نکال کر سلطنت کا مالک بن جاتا ہے۔ اس کے سامنے آل بویہ اور خلیفہ بغداد کا جھگڑا آتا ہے آل بویہ مذہباً شیعہ تھے خلافت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ خلافت تو خود ہی دم توڑ رہی تھی۔ اس نے اپنی عمر کے کچھ سال بڑھانے کے لئے محمود کا سہارا ڈھونڈھا، محمود کو ایران پر تسلط حاصل کرنے کا موقع مل گیا اور غیر مسلم فوج لے کر شمالی ایران کو فتح کرنا شروع کر دیا، ایلخانیوں اور دیلمیوں سے جنگ چھڑ گئی۔ ادھر مشرق کی سرحد پر ہندوستانی راجے جنہیں سبکتگین نے افغانستان سے باہر کر رکھا تھا اس تاک میں تھے کہ کھوئے ہوئے ملک کو پھر لے لیں۔ محمود نے دو طرفی لشکر کشی شروع کر دی ایک مرتبہ ہندوستان پر حملہ کرتا تھا اور دوسری بار وسط ایشیا یا ایران پر۔ مسلمان ریاستوں نے اس کا مقابلہ کیا، ہندو راجوں نے۔

ادھر اس نے اسلامی علاقوں پر قبضہ کیا ادھر مندروں کو گرایا اور مال و دولت کو لوٹا، نہ مسلمانوں کے ساتھ رعایت کی نہ ہندوؤں کو چھوڑا۔ درباری شاعروں نے تعریف کے پل باندھ دیئے خلیفہ نے یمین الدولہ اور امین الملت کے خطابوں سے نوازا کوئی نہ پوچھے جس شخص نے ایران کے مسلمان حاکم خاندانوں کو تباہ کر دیا اور خلافت کو اسی منصب پر چھوڑ رکھا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ چنگیز اور ہلاکو غیر مسلم سرداروں نے اسلامی مملکتوں اور عباسی خلافت کو خاک میں ملا دیا اسے کس طرح اسلامی دولت کا بانی اور اسلامی ملت کا محسن سمجھا جائے۔ پھر محمود کے جنگ و پیکار کے دوران میں ہندو سماج اور ہندو ریاست کا کہاں نشان تھا۔ محمود آتا ہے متھرا کو، نگر کوٹ کو، قنوج کو، سومنات کو تہ و بالا کر دیتا ہے، کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کس ہندو شخص نے ان پوتر استھانوں کی حفاظت کے لئے کوشش کی۔ غزنی سے پاٹن اور غزنی سے کالنجر تک دھاوے ہوئے ہیں سوائے مقامی راجاؤں کے کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ کیا تعجب ہے ان وحشیانہ خونریزیوں کو ہندو دھرم اور اسلام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ پھر اس کا کیا جواب ہے کیوں محمود نے اپنی فوج میں ہزاروں ہندو سپاہی بھرتی کر رکھے تھے کس طرح محمود نے ہندو سرداروں سوندھ رائے، تلک، سیوند رائے پر اعتماد کیا۔ احمد نیالتگین ہندوستان کا حاکم مقرر ہوتا ہے بغاوت کا جھنڈا اٹھاتا ہے محمود تلک کو اس کی سرکوبی کے لئے ہندوستان بھیجتا ہے تلک اور ہندو جاٹ مل کر نیالتگین کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔ کرمان میں جنگ ہوتی ہے محمود کی فوج کا سپہ سالار توسی تگس دو ہزار ہندو اور ایک ہزار ترک اور ایک ہزار کرد اور عرب سپاہیوں کو لے کر لڑنے جاتا ہے دشمنوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر فوج تتر بتر ہو جاتی ہے ہندوستانی افسر بھاگ کر غزنی پہنچتے ہیں محمود انہیں برخاست کرتا ہے چھ ہندو افسر اتنے شرمندہ ہوتے ہیں کہ خنجر بھونک لیتے ہیں اور جان قربان کر دیتے ہیں۔ وسط ایشیا میں مرو کے مقام پر محمود کے ہندو سپاہی لڑتے نظر آتے ہیں۔ تاویزگاں میں ہندوؤں کی خیموں کی نگہبانی کرتے ہیں، ہزار پیلبان محمود کے جنگی ہاتھیوں کی فیلبانی کرتے ہیں۔ بلخ کے نزدیک ہندو فوج کا کیمپ ہے، دراصل غزنہ کا نام کافروں کا حصار رہ گیا ہے۔ ان واقعات کی کیا تشریح ہے؟ بت شکن بادشاہ اور بت پرست سپاہیوں کا کیا رشتہ تھا؟ ہندو واقعہ کیوں مسلمان امیر کے لئے جان دیتے تھے، مسلمان امیر کیوں ہندوؤں پر بھروسہ کرتا تھا۔ ۹

محمود کی اولاد قریب ایک سو پچاس برس تک پنجاب پر حکومت کرتی ہے اس عرصہ میں ہندوستان میں کہیں ہلچل نہیں ہوتی ہندو سماج میں کوئی ایسا شخص نہیں نکلتا جو مذہب کے نام پر راجاؤں کو جمع کرے اور دشمنوں سے دو دو ہاتھ کرے، مسلکی غزنویوں سے اگر کوئی پنجاب کو خالی کراتا ہے تو وہ غوریوں کا خاندان ہے۔ انہیں کے معرکوں سے ہندوستان کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے، پہلے شمالی ہندوستان اور پھر دکن میں ترکوں کی حکومت قائم ہوتی ہے ایک کے بعد دوسرا خاندان تاج و تخت کا مالک بنتا ہے لیکن کسی بھی خاندان کی سلطنت سو برس سے زیادہ نہیں چلتی

التمش، بلبن، علاؤالدین خلجی، محمد بن تغلق نے بڑے دبدبے کے ساتھ حکومت کی۔ لیکن ان کی کامیابی ان کی ذات تک محدود رہی ان کے مرنے کے ساتھ طوائف الملوکی پھیلی۔ نہ کوئی ایسی ملت قائم ہوتی جو ان میں سے کسی خاندان کی پشت پناہ ہوتی اور نہ کوئی ایسا سماجی طبقہ تھا جو انہیں سنبھالے رکھتا اگر ہندوؤں نے ان سے طاقت چھیننے کی کوشش نہیں کی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کے قبیلوں اور خاندانوں میں کوئی اتحاد نہیں تھا، مذہبی اور سماجی زندگی کو سیاست کے ساتھ کوئی لگاؤ نہیں تھا، اسلامی ملت اور ہندو سماج کے تصور حقیقت سے کوسوں دور تھے۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے مذہبی جنگ و جدل ایک فسانہ ہے جسے انیسویں صدی کے فرنگی تاریخ دانوں نے گھڑا۔ ممکن ہے اسے وہ تاریخی حیثیت سے صحیح سمجھتے ہوں ممکن ہے انہیں سچ مچ یقین ہو کہ واقعات کی نوعیت یہی ہے، لیکن کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تاریخ کے ان گلے سڑے علاقوں کو اتار پھینکا جائے اور ان فرضی نظریوں کی صحت کے ساتھ جانچ پڑتال کی جائے، تاریخ کو مذہب نہیں علم کی روشنی میں پڑھا جائے۔

اس زمانہ کے ہندوستان میں دو مذہب اہمیت رکھتے تھے دونوں مذہب انتہائی لطیف اور پاکیزہ خاصیتوں کے حامل تھے، دونوں اعلیٰ سے اعلیٰ قدروں کے پشت پناہ تھے۔ ان کے وسیلے سے انسان حقیقت میں انسان بنتا ہے اپنی سفلی مصلحتوں اور حیوانی خواہشوں پر غلبہ پاتا ہے لالچ، غصہ، حسد، شہوت، بے رحمی اور تنگ نظری کی غلاظتوں سے دل کو صاف اور دماغ کی کدورتوں کو دور کرتا ہے دونوں وجدان اور نفس میں ہم آہنگی پیدا کرتے اور انصاف اور حق، انسانی محبت اور خلق کی خدمت کی دعوت دیتے ہیں۔ کس طرح ان مذہبوں کو قتل و غارت دشمنی اور آزار کا جواز بنا لیا جاتا۔ بات یہ ہے جنگ اور جدل کی وحشیانہ حرکت کے لئے ہر زمانہ میں لوگ عذر ڈھونڈتے رہتے ہیں اپنے بہیمانہ اعمال کو مذہب کے سر تھوپتے ہیں۔ گیارہویں صدی یورپ کی دونوں لڑائیوں میں دونوں طرف کے عیسائی پادری اپنی قوم کو حق بجانب اور دوسری کو شیطان کے

ہوا۔ وہ میں کھولا مانتے تھے خدا اور پیر سے دعا مانگتے تھے کہ مذہب کے دشمنوں کو شکست نصیب ہو۔ ایسی ہی کچھ کیفیت ہندوستان کے حملے زمانہ کی تھی۔ سچ پوچھئے تو مذہب اور دھرم کی ٹٹی کے پیچھے ملک اور دولت کے لالچی تیر کا شکار کھیلتے تھے ملک اور سماج کا جو تصور ہے وہ اس وقت کسی کے ذہن میں نہ تھا۔ تاریخ دانوں کی غلطی ضرور تھی اور غیر تاریخی کوشش ہے جو اس زمانہ کے کارناموں میں آج کل کے محرکات کو کارفرما سمجھتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ تاریخ کی تصویر کے دو رخ ہیں ایک طرف امن اور شانتی کا نقشہ ہے جس میں انسانیت کے ارتقا ہمدردی اور رواداری کی وسیع اور ماورائیت کے پھیلاؤ کی جھانکی ہے، دوسرا رخ لال خون سے رنگا ہوا ہے۔ اس رخ میں انسانی خون کے پیاسے جاہ و دولت کے لالچی اور زبردستی کے دیوانے گھمنڈ کے گھوڑوں پر سوار ادھر ادھر دوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ مذہب کا پہلے رخ سے واسطہ ہے اسے تاریخ کے دوسرے رخ سے وابستہ کرنا مذہب کی توہین ہے انسانیت اور اخلاق کو نہ سمجھنا ہے۔

مجھے اس لمبی تمہید کی ضرورت اس لئے معلوم ہوتی کہ امیر خسرو کے خیالات کو سمجھنے کے لئے ان کے پس منظر کا جاننا ضروری ہے۔ جس زمانہ میں امیر خسرو نے زندگی بسر کی اس زمانے کے ذہنی ماحول کا اثر ان پر بھی ضرور تھا۔ ان کے قلم سے کبھی کبھی ایسے فقرے نکل جاتے ہیں جن سے غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ وہ اسلام کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں اور دوسرے مذہبوں پر اس کی برتری کے قائل ہیں کبھی ایسے لفظ بھی استعمال کرتے ہیں جو رواداری کی راہ میں رکاوٹیں لگاتے ہیں۔ باوجود اس کے گہری نظر سے دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کس قدر ان کا دل اور دماغ ہندوستان سے لبریز تھا۔

اصل یہ ہے کہ خسرو کی ذات قرآن السعدین تھی جس میں دو تمدنوں کا سنگم نظر آتا ہے۔ ان کے والد لاچین قبیلہ کے ترک تھے ماں نسل سے ہندوستانی اور عماد الملک راوت عرض کی بیٹی تھیں۔ خسرو اپنے بارہ میں خود لکھتے ہیں "رسل عارض آسود مہم" یعنی مانا رنگ کے سانولے تھے۔ باپ بے پڑھے تھے لیکن امیر آدمی تھے پیشہ سپاہی کا تھا۔ مگر خسرو آٹھ برس کے ہوتے تو سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا بوڑھے نانا کی سرپرستی میں دہلی میں تعلیم ہوئی مہربان نانا کی لاڈلی گود میں پلے اور بڑے ہوتے مکتبوں اور استادوں کی شاگردی سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ خسرو تلمیذ الرحمن تھے، قدرت نے ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، شاعری کو طبیعت سے فطری مناسبت تھی، ابھی دودھ کے دانت نہیں ٹوٹے تھے کہ شعر کہنا شروع کر دیا۔ کہتے ہیں "دو دوران بود صرس کہ دندان میافتاد سخن میگفتم"۔ خواجہ عزیز الدین سے جو بڑے عالم تھے خسرو تخلص کا لقب ملا، انیسویں سال میں اپنے بچپن کے کلام کا دیوان "تحفۃ الصغر" تیار کر دیا۔ امیر خاندان کے تھے شروع ہی سے امیروں کے درباروں سے تعلق ہو گیا۔ خسرو نے اپنی بہتر برس کی عمر میں سات سلطانوں کا زمانہ دیکھا۔ اکثر نے ان پر عنایت کی اپنے خاص ندیموں میں جگہ دی عزت اور اکرام کی نگاہ سے پرورش کی۔ کچھ حاسدوں کو پسند نہ آیا لیکن ان کی ریشہ دوانیوں سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ خسرو کو ابتدائی جوانی میں محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کی خدمت کا فیضان حاصل ہوا۔ ان کی صحبت میں دنیا کے علائق سے تیاگ و قناعت کی برکت سے بیزاری سیکھی۔ اقرار کرتے ہیں۔

ست ان دارم از بی لیس نہ دار
کو در سر میر تو م بے سار

اس کے بعد سے خاص طور پر میری یہ منت ہو گئی ہے کہ میں شاہی دربار سے بھی بے نیاز ہو جاؤں۔

بیتے نہ جو کم نہ پناہی زکس
جز بہ خدا و نہ کنم روی و بس

قرآن السعدین

نہ مجھے کسی کی پشت پناہی کی ضرورت ہے نہ امان کی میں نے تو اپنے آقا و مالک کی طرف اپنا منہ کر لیا ہے۔

استغنا کا یہ عالم تھا ؎

من کہ نہادم ز سخن گنج پاک
گنج زر اندر نظرم ہست خاک

قرآن السعدین

میں نے شاعری کی دولت اور خزانہ جمع کیا ہے روپے کا خزانہ میری نظر میں ہیچ ہے۔

ان کے کردار و صفات کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

دست طمع پیش کسان چون مکن دراز
پل بستہ ای کہ بگذری از آبروی خویش

اگر حرص اور لالچ کا ہاتھ تو نے کسی کے سامنے پھیلایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تو نے پل باندھ لیا ہے جس پر ہو کر تو اپنی عزت و آبرو سے گذر جاتا ہے یعنی اپنی عزت کھو بیٹھتا ہے۔

خسرو صوفی مشرب درد مند انسان تھے ان کی نگاہ بلند تھی اور ان کے دل میں وسعت تھی شاعری میں ان کا مرتبہ بلند ہے۔ شاعروں میں ان کا پایہ اونچا ہے ہندوستان میں کوئی ان کا مثل پیدا نہیں ہوا، زندگی میں خراسان اور ایران سے خراج تحسین حاصل کیا اور آج بھی ایران میں چوٹی کے شاعروں میں گنے جاتے ہیں۔

شاعر کے بارہ میں کہا جاتا ہے اپنے زمانہ کا آئینہ ہوتا ہے۔ خسرو اس قول کے بہترین نمونوں میں سے ہیں۔ ان کے کلام میں تیرہویں اور چودھویں صدی کے ہندوستان کی دھندلی تصویر کا عکس دکھائی دیتا ہے، سیاسیات کی زندہ تصویریں ہیں، اخلاقی تمدن کا کامل نقشہ ہے، زندگی کی رنگارنگ جھلکیاں ہیں، شاہی جشنوں کے دلوں کو گرمانے والے نظارے ہیں۔ راہ عشق کے پیچ و خم محبت کے متوالوں کے راز و نیاز کے تذکرے ہیں آرزوؤں کی سنہری دنیا کی سیر ہے، اور ناکامیوں کا الم۔ پند و نصیحت، حکمت فلسفہ تصوف و معرفت کیا کچھ ہے جو خسرو سخن کی قلمرو کے باہر ہے۔

کلام کا حجم اتنا ہے کہ ایک مقالہ میں اس کا احاطہ غیر ممکن ہے۔ میں آج اس کے صرف چند پہلوؤں کی طرف آپ کا دھیان دلانا چاہتا ہوں۔ میرے مضمون کا عنوان ہے "خسرو اور ہندوستان" پہلی چیز تو یہ ہے کہ خسرو کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان دنیا کے تمام ملکوں سے بہتر اور برتر ہے۔ کہتے ہیں "کشور ہند است بہشتی بزمین" اور اس کے ثبوت میں ایک نہیں سات دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ ثبوتوں کو جانے دیجئے۔ ان کے پیچھے جو جذبہ ہے دیکھئے کہتے ہیں اس وجہ سے ہند کو ترجیح دیتا ہوں۔

جنت بگو کہ ہست زمیں از دو رو زمین
ہست مرا مولد و مادی و دو وطن

… ان میں سے ایک یہ ہے کہ اتفاق زمانہ سے یہ ملک میرے سابقہ کی جگہ اور پیدائش پانے کا مقام اور وطن ہے ۔

دین رسول آمدہ کای زمرہ دین
حب وطن ہست ز ایمان بہ یقین

اور یہ رسول کی حدیث ہے کہ اپنے دین و الوطن سے الفت رکھنا ایمان کا تقاضا ہے ۔

پھر دوسری دلیل اس بات کی دیتے ہیں کہ کیوں ہندکو روم ، عراق ، خراسان اور قندھار پر فوقیت حاصل ہے کہی دلیل اس بات کی دی ہیں کہ ہندوستان کی ہوا خراسان سے بہتر ہے

بی تو خراسان کہ بن از برف فزون
سرد پیارست بدہ سقف درون

وہ خراسان کی طرح نہیں ہے جہاں ہم سردی کی زیادتی کی وجہ سے ٹھنڈا اور اندر پیاز کی طرح ہو ۔ دس جولوں والا ہو جاتا ہے ۔

پھر کہا ہے ۔

جا ارم ستان کہیں طرف از سرہ و گل
ہست ہمہ سال بہار و گل و مل

چوتھی دلیل ہندوستان کی خوبی کی یہ ہے کہ اس کے گرد چاروں طرف سبزہ اور پھولوں کی فراوانی کی وجہ سے پورے سال بہار اور کھلے ہوئے پھولوں اور شراب کا منظر دکھائی دیتا ہے ۔

اور ہندوستان کے خوشبودار پھولوں ، قسم قسم کے میووں ، پان ، گٹھلی کیلے اور پان کی تعریف میں شعر کہتے ہیں پان کا ذکر یوں کرتے ہیں ۔

ہست دھم آن کہ چو میوہ گزین
میوہ ساشد بہ ہمہ روی زمین

دسویں یہ کہ پان جیسا منتخب میوہ ساری دنیا میں نہیں ملتا ۔

آم اور انجیر کا مقابلہ کرتے ہیں ۔ ان لوگوں کو جو انجیر کے سامنے آم کی قدر کرتے ہیں لاف زن کا لقب دیتے ہیں پھولوں پر اس قدر فریفتہ ہیں کہ ایک ایک کا نام لے کے تعریف کرتے ہیں گل کوزہ ، صد برگ ، بیل ، جوہی ، کیوڑا ، رات کی رانی ، چمپا ، مولسری ، دونہ ، کرنا ، سیوتی سب کا نام ذکر کر کے بعد خراسانی پھولوں سے برتری کا سبب بتاتے ہیں ۔

چو بمی ارغوان و لالہ خندان
کہ رنگی ہست بوی نیست چندان

اگر ارغوانی لالہ کو ہنستا ہوا دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے رنگ تو خوب ہیں لیکن خوشبو نام کو بھی نہیں ۔

گل مارا نہ ہندی نام زشت است
وگر نہ ہر گلی باغ بہشت است

ہمارے پھولوں کے نام ہندی ہونے کی وجہ سے خراب ہیں ورنہ حقیقت میں ہمارے باغ کا ہر پھول باغ جنت کی طرح ہے ۔

گر این گل جا ہے در روم و شام
کہ بودی پارسی یا تازیش نام

اگر یہ پھول روم اور شام میں اگتا تو اس کو فارسی یا عربی نام ملتا

شدے معلوم نامرغان ان بوم
جہان مشغول زو در زرے و روم

اور جب اس سرزمین کے پرندے کو پتہ چلتا تو وہ زرے اور روم کے شہروں میں اس طرح غلغلہ مچاتے ۔

کہ اینک گل چنین باشد کہ سالی
دہد بوی دور ماندہ از نہالی

کہ یہ پھول اس سال اس طرح کا ہو گیا ہے کہ درخت سے دور دور تک خوشبو پھیلاتا ہے ۔

کپڑوں کی تعریف میں فرماتے ہیں ۔

نکو دانند خوبان پری کیش
کہ لطف دیوگیری از کتان بیش

پری وش حسن رکھنے والے حسین اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوگیری کا کپڑا کتان سے باریک ہوتا ہے ۔

ز لطف آن جامہ گوئی آفتابست
ز باریکی سایہ یا ماہتابست

لطافت میں جو کپڑا آفتاب کی طرح معلوم ہوتا ہے اور یہ کہنے کہ وہ خود سایہ ہے یا چاندنی ہے ورنگل سے جو تھان آتے ہیں ان میں ایک قسم کا کپڑا ہے

ہمیں جامہ ابریشمین ہندوانہ
کہ یک گز شود دہ گشتہ از دوانہ

ہندوستان کے ریشم کا بنا ہوا کپڑا اتنا مہین اور باریک ہوتا ہے کہ ظاہری طور پر تو وہ ایک گز معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے دس حصے ایسا وہ کئے جا سکتے ہیں ۔

ز بس لطف وہ گز بدیدہ گنجند
کہ دیدہ ز گنجیدن آن نرنجد

اس کا دس گز کپڑا آنکھوں میں سما سکتا ہے اور اس کے سما جانے سے آنکھوں کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی ۔

نہ زو بگذرد ہم نہ آبی نہ چربی
نہ چون قطرۂ آب پیکان چربی

نہ اس میں سے پانی نکل سکتا ہے اور نہ کسی طرح کی چکنائی گذر سکتی ہے اور نہ حنگی تیر اس طرح پار ہو سکتا ہے جس طرح پانی کا قطرہ نہیں نکل سکتا ۔

اور ایک کپڑے کے بارے میں کہتے ہیں ۔

جامہ بندی کہ بداسد نام
از تنگی تن ہمایہ بنام

ہندوستان کا ایک کپڑا ہے جس کا نام لوگ نہیں جانتے وہ اتنا باریک بتایا جاتا ہے کہ اگر اسے کوئی پہنے تو سارا جسم نظر آتا ہے ۔

مانند حباب ساخ نہان
نازک تنیش ہویدا جہان

اگر اس کو پانی میں بھی پست لیا جاتے تو پوشیدہ ہی رہے حالانکہ اگر اس کو کھولیں تو ساری دنیا ڈھانپ لے ۔
یہ جامہ کا "آب رواں" تو نہیں جس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ پورا تھان ایک انگوٹھی کے حلقہ میں سے نکل جاتا تھا ۔)

ہندوستان کے پرندوں کا بیان سن لیجئے ۔ طوطے کے بارہ میں کہتے ہیں جانور نہیں آدمی ہے ۔

فاتحہ و اخلاص و دعا ورد ہنش
با من و تو ہم چو من و تو سخنش

اس کی زبان پر سورۂ فاتحہ اخلاص اور دعاؤں کا ورد رہتا ہے اور ہمارے تمہارے ساتھ تمہاری ہماری طرح باتیں کرتا ہے ۔
پھر شارک کا ذکر کرتے ہیں کہ دنیا پرندہ نہ عجم میں ہے نہ عرب میں ۔ کوئے کی کائیں کائیں میں بھی خاص اثر ہے اس کی بولیوں سے شگون لیتے ہیں اور جدائی کو بتانا اس کا زبردست ہے ۔ لیکن مور کے لئے شعروں کے دریا بہا دئے ہیں پوچھتے ہیں ۔

گر نہ بہشت است ہمیں ہند چرا
ار پے طاؤس جنان گشت جرا

اگر ہندوستان بہشت نہیں ہے تو پھر مور کی وجہ سے میرے لئے جنت بن گیا ہے ۔
یہیں اسے طائر فردوسی کہا ہے کہیں بتایا ہے کہ ہد ہد جو مرغ سلیمان ہے اس کے زرین بال کو دیکھ کر انگلی کاٹتا ہے اور آخر میں قصیدہ دے دیتا ہے ۔

ہمہ دانسد کہ پیدا و نہان
نیست چنیں مرغ زر اطراف جہان

پوشیدہ اور ظاہر طور پر سب جانتے ہیں کہ اطراف عالم میں اس طرح کا پرندہ کوئی نہیں ۔
ہرن کی چال ، گینڈے کے زیر و بم ، گھوڑے کے ناچ ، بندر کی نقل ، بکرے کا لکڑی پر چاروں طرف سم رکھ کر کھڑا ہونا اور ہاتھی کا آدمیوں کے سے کام کرنا سب مزے لے لے کر سناتے ہیں ۔ لیکن ہندی حسینوں کو دیکھ کر تو بے تاب ہو جاتے ہیں ۔ سو ملک چین بھی ہندوستان کے ایک بال کے برابر نہیں ، ختا اور طغاج کے خوبرویوں کی آنکھیں وہ دلکش ہیں لیکن چہروں پر بے رونقی ہوتی ہے ، خراسانی سرخ و سفید ہیں لیکن خراسانی پھولوں کی طرح بے بو ہیں ، روم اور روس . . . . . کا حال مت پوچھیے ۔

سپید و سرد ہم چون کسد: یخ
کہ بیتان دم خورد جانون دوزخ

برف کی سل کی طرح سفید اور ٹھنڈے ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر دوزخی عورتوں کی سانس کھڑ جاتے ۔
تاتاریوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور حبشی والیوں میں ملاحت نہیں ، سمرقندی اور قندھاریوں میں شیرینی کی کمی ہے تو مصریوں میں چستی اور رعنائی کی غرض کہیں بھی وہ خوبروئی اور دلربائی نہیں جو ہند کی حسیناؤں میں ہے ۔
ہندوستان میں جو جگہ سب سے زیادہ پسند تھی وہ یہی آپ کا شہر دہلی ہے کہتے ہیں ۔

حضرت دہلی کنف دین و داد
جنت عدن است کہ آباد باد

دہلی کے دین اور انصاف کی شہرت اطراف میں پھیلی ہوئی ہے یہ عدن کی جنت ہے خدا اس کو آباد رکھے ۔

ہست چو ذات ارم اندر صفات
حرسہا اللہ عن الحادثات

یہ اپنی صفات اور خصوصیات کی بنا پر باغ ارم کی طرح ہے خدا اس کو زمانے کے حوادث سے محفوظ رکھے ۔
پھر اس کی عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے تاب کو ملک تاسہ کا نمونہ بتاتے ہیں جامع مسجد کو کعبہ سے ملا دیتے ہیں ، قطب مینار کو آسمان تک پہونچانے والی سیڑھی اور آسمان کو سنبھالنے والے ستون سے ، حوض خاص کے پانی کو نور سے جس میں آسمان کا عکس نظر آتا ہے جس کی زمین ریت کے دانوں کو اندھا آدمی رات کی اندھیاری میں گن سکتا ہے ۔ دہلی بلند مرتبہ تاجداروں کا پایۂ تخت ہے جہاں ملک کے بزرگ اور مملکت کے رکن رہتے ہیں ۔ اس کے باشندے ویسے سیرت اہل جنت کی مانند خوش دل اور خوش خو ہیں ۔ صنعت میں علم زادب میں گانے بجانے اور کرتبوں میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں ۔
ہند کے موسموں کا بیان کس آب و تاب کے ساتھ کرتے ہیں جاڑا آتا ہے تو ہندوستان جنت نشان ہو جاتا ہے گھر اور باہر ۔ بادشاہ اور رندان سرو نازنین جاتے ہیں ۔ بہار میں پھول بستے میں ململ کی بنی ہیں ، عاشق اور معشوق گھروں سے باہر سیر کو نکل آتے ہیں دریا اور دریا کا حسن ملتی ہے گرمی تو اس ملک کا خاصہ ہے لیکن یہ اس لئے ہے کہ

مہر فلک گرم شد اندر ہواش
گرم از آن گشتہ جہان را ہواش

اس سے دلداری کے عشق میں آسمانی سورج گرم ہو گیا ہے یعنی اس میں گرمی ہندوستان سے عشق کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اور پھر اس سے سارے عالم کی ہوا گرم ہوتی ہے ۔
برسات کا موسم آیا تو آسمان پر بادلوں کا شامیانہ چھا گیا ، جنگل میں ہر طرف سبزہ کی

صحن تار ہو گئیں، دھان کے پودوں کے سر پانی میں ڈوب گئے، باغوں میں پھلوں کے درخت موتیوں سے لد گئے، نالے اور ندی چڑھ گئے، بطخیں اچھلتی ہوئی گھومنے لگیں۔ پھر خزاں کی فصل نے ہوا کے کھٹولوں کو کلیوں کی بربادی کے لئے چھوڑ دیا۔ پیپل ہو کر پیلی پڑ گئیں، مصیبت نے سلایا ان کو نہیں لیا۔ سوسن، صد برگ، سیوتی کے پھولوں کی پتیاں گر گئیں اور درخت ننگے ہو گئے، بلبلیں گھٹ گئیں اور طوطے گونگے ہو گئے۔

اپنے دیس کے چرندوں پرندوں، ہوا، پانی، گرما، جنگل، پھولوں، پودوں کے رنگ روپ سے خسرو اس قدر متاثر تھے کہ بار بار ان کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے گن گانے سے تھکتے نہیں لیکن یہ تو پھر بھی سطحی چیزیں ہیں اور شاعروں کا بھی دھیان اس طرف گیا ہے جواب کم ملتی ہے۔ وہ ہندوستانی تہذیب، زبان اور مذہب سے تعلق رکھتی ہے جس طرح سے خسرو نے ان پر گہری نظر ڈالی ہے اور ایک بے لاگ مگر ہمدردی سے بھری ہوئی تنقید کی ہے اس کا جواب ملنا مشکل ہے۔

زبان کا مسئلہ آج بیسویں صدی میں جھگڑوں کی جڑ ہے، ایک تیرہویں صدی کا دل پرست شاعر زبانوں کو کس طرح سے مقابلہ کر رہا ہے دیکھنے کے قابل ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ خسرو ہندوستان کی سب عوامی بولیوں سے واقف تھے کم سے کم نام کی حد تک۔ گو ان کے اپنے لفظ یہ ہیں۔

من بہ رہا نہ کساں بیشتری
کردہ ام از طبع تماشا گذری

میں لوگوں کی اکثر بولیوں سے واقفیت رکھتا ہوں اور اپنی تجربے والی طبیعت کے ذریعہ ان سے واقفیت حاصل کی ہے۔

دانم و دریافتہ و گفتہ ہم
جستہ و روشن شدہ زاں بیش و کم

ان میں سے کچھ کو جانتا ہوں کچھ سے یوں ہی آگاہ ہوں کچھ میں ماہری کرتا ہوں اور زبانیں سے اکثر دیکھتے سے مجھ کو روشنی اور دانش حاصل ہوئی ہے۔

سندھی، لاہوری (پنجابی)، کشمیری، کوبی (کبر)، دھور سمندری (تامل)، معبری (آندھرا)، گوڑی (بہاری)، بنگالی، اودھی، دہلوی کے نام گناتے ہیں یہ زبانیں آج بھی رائج ہیں اور ہندوستان کے آئین میں درج ہیں مگر ہندوستان کی ان بولیوں کے علاوہ سنسکرت زبان ہے جو پرانے زمانے سے برہمنوں کے نزدیک متبرک ہے لیکن عوام کو اس کی خبر نہیں اور نہ ایک برہمن بھی اس کی حدوں سے واقف نہیں۔ اس زبان میں چار وید ہیں علم و دانش کے آئین ہیں اور قصے افسانے سنسکرت زبان کا سبق پڑھاتی ہے اور دوسروں کو سکھلاتی ہے صرف و نحو و علم و ادب میں سنسکرت عربی کے مثل ہے اور فارسی سے برتر۔

فارسی اور عربی کا معاملہ خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں کیا ہے اور فیصلہ دیا ہے۔ پس اور بھی خوب معقول ضرور است کہ فارسی بر عربی راجح باشد، ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ رائے پسند نہ ہو اس شعر سے بحث ختم کرتی ہے۔

مرا ہر حجتی کامد بسوی خویشتن گفتم
تو ہم گر حجتی داری بسوی بیرون کش

من تو بھی دلیل پیش کرتا ہوں وہ میری اپنی ہے تیرے پاس بھی اگر کوئی دلیل ہے تو بھی اس کو سامنے لا۔

زمانہ تحسین اس لئے نہیں دیں کہ "منصفان بی غرض و تعصب برون خواہند آمد" فارسی عربی کی بحث میں یہ پایا ہے کہ عربی کی فضیلت محض شرعی ہے اس لئے اس نے اشعار میں سے استشہاد کیا ہے لیکن شعری نہیں۔ بات کیا ہے کہ تین وجہوں سے فارسی عربی پر سبقت لے جاتی ہے اول میزان فارسی میزان عربی سے بہتر ہے دوم عربی میں لفظوں کے معنی کئی ہیں اور ایک معنی میں کئی کئی لفظ ایسا فارسی میں نہیں۔ تیسرے عربی میں حرف قافیہ چار فارسی میں قافیہ بھی ہے ردیف بھی کہتے ہیں۔

"پس چون شعر فارسی بی‌شمار درر و لطائف معنی دار و بار ردیف از باد طبع باید راند ازین جہت نادر زادہ را کجا اندازہ باشد"

پس فارسی عربی سے بعض شعری لحاظ سے بہتر ہے اور سنسکرت "نہ سپہر" میں کہتے ہیں اگرچہ دری شیریں و شکر ہے لیکن سنسکرت میں ذوق بار اس سے کم نہیں" زبانوں کے موازنہ میں بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں عربی فارسی اور ترکی کے دنیا میں پھیلنے کا سبب بیان کرتے ہیں۔

وز روش ہست کس کاں سخنی
کس نہ ز ارتاجوراں کس سخنی

یہی پرانا قاعدہ چلا آ رہا ہے کہ بادشاہوں کے فرمانوں کے جاری کرنے یا ان کی آمد ہی کی وجہ سے زبان پھیلتی ہے۔

چونکہ ز دمہ رسد از کف شہاں
عام شود در ہمہ اطراف جہاں

جب وہ بادشاہوں کی گفتگو سے ہو کر چھوٹے بڑے لوگوں تک پہنچتی ہے تو پھر ساری دنیا میں عام ہو جاتی ہے۔

مثالیں دی ہیں جب خلافت بغداد سے چلی تو پارسیوں کا زور ہوا اور سب عرب آئین پارسی ہو گئے غوری اور ترک جن کی زبان فارسی تھی ہندوستان میں نمودار ہوئے تو ہم سب نے فارسی سیکھ لی۔ چونکہ عربی قرآن کے لئے چن لی گئی تھی اس لئے اس کی جگہ جماعت کی دنیا میں نادر ہو گئی۔ اصل یہ ہے زبانیں بہت ہیں اور ہر ایک زبان میں اپنا نمک ہے۔ پھر نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ تو ذرا کہ میری زبان اوروں سے بہتر ہے یا یہ کہ ایک ترب قند ہے اور دوسری سرکہ یہ بیہودہ گفتگو ہے۔

زبانوں کے ساتھ علم بھی آ جاتا ہے۔ جب یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ہند کی ہوا تمام دنیا سے بہتر ہے اور صرف باغ جنت سے ایک درجہ کم تو ہمارے حکمت و دانش کا جائزہ لیتے ہیں۔ خسرو کے نزدیک یونان کا فلسفہ مشہور ہے لیکن ہندوستان نہ صرف تہی نہیں بلکہ ہر علم میں بہتر فکر کا مالک ہے۔ یہاں منطق ہے نجوم ہے اور معقولات میں برہمنوں نے ارسطو کے دفتر والوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا ہے علم طبیعی ریاضی، ہیئت، سب ہی ان کے یہاں ہیں مثلاً ابو معشر جو دنیا میں سب سے زیادہ مشہور ستارہ شناس تھا دس برس بنارس میں رہا اور اس نے بنارس میں علم نجوم سیکھا وہ خود قبول کرتا ہے جو کچھ اس نے سیکھا وہ سب ہند کی ساحری کی بدولت تھا۔

ہندسہ کا علم بھی ہندوستان کا وضع کیا ہوا ہے۔ صرف ان کی ایک صفر کی ایجاد سے ریاضی کی تحقیق علم نے ذرہ دیر سے پہچانی۔ صفر کی رقم دریافت کرنے کا سہرا آسا نامی عالم کے سر پر ہے اور اس کے نام کے ساتھ ہمارا جوڑ رہے سے ہندسہ کی اصطلاح ہی ہے۔ یونانی اور دوسرے حکما آسا ہی کے شاگرد ہیں۔

ہندوستان کی برتری یہاں ختم نہیں ہو جاتی کلیلہ دمنہ کی کتاب جو ہندی حکمت کی کتاب ہے یہیں کی پیداوار ہے، شطرنج کا کھیل ہے جو ہند ہی کی ایجاد ہے جس سے طبیعت کھلتی ہے اور سوچنے سمجھنے کی قوت بڑھتی ہے۔

زوحدت اندازہ بجستند کسی
غایت و پایانش ندانست کسی

خدا اور اندازے سے بڑھ کر اس کی حقیقت کو پانے کی کوشش کی لیکن کوئی
بھی اس کی غایت اور انتہا کو نہ سمجھ سکا۔

ہندی سنگیت سارے جہاں میں اپنا ثانی نہیں رکھتا دنیا بھر کے لوگوں نے اسے یہاں سے سیکھا ہے لیکن بہرا یہ ہے کہ تیس چالیس سال ریاضت کرنے پر بھی اس کی ٹھیک آواز کو ادا کرنا مشکل ہے۔ اس سنگیت میں ایسی کشش ہے کہ ہرن سن کر بے ہوش ہو جاتا ہے تیر و کمان کے سنگیت کا طبلہ اس کے دل میں پیوست ہو جاتا ہے اور بے چارہ جان دے دیتا ہے فرق دیکھیے عرب کا اونٹ حدی خواں کی آواز سنتا ہے تو اور تیز چلتا ہے لیکن ہرن ہندی گانے سے ایسے کھو جاتا ہے کہ مرنے کی نوبت آ جاتی ہے۔

ہندوستان کے علم و فن سے مذہب کی طرف آتے ہیں کہتے ہیں یہ ٹھیک ہے ہندو ہماری طرح دیندار نہیں ہیں پھر بھی ہمارے اکثر مسئلوں کا اقرار کرتے ہیں۔ جن اصولوں پر اتفاق ہے وہ یہ ہیں: وحدت، ہستی، قدامت، عدم سے ایجاد کی قدرت رزق دینے والے کا وجود جو ہر ذرہ اور ہر ایک کو رزق دیتا ہے ہر ایک جان کو جان دیتا ہے اور واپس لیتا ہے وہ خالق ہے اور اس کی حکمت اور علم ازلی اور ابدی ہے وہ اپنے قانون پر اختیار رکھتا ہے اور عملوں کے کرنے نہ کرنے کا مختار۔

ہندو مذہب کا اور دوسروں سے موازنہ یوں کرتے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو خدا پر یقین نہیں رکھتے ہندو ان سے کہیں بہتر اور نیک تر ہیں، دوسرے وہ ہیں جو توحید کی ہستی کے قائل نہیں لیکن برہمن اس کی ہستی کا یقین رکھتے ہیں، تیسرے دوئی میں یقین رکھنے والے ہیں لیکن ہندوؤں کو اس قسم کے نظریوں سے کوئی تعلق نہیں، پھر ایک فرقہ جسم کو حقیقی سمجھتا ہے مگر برہمن ان کا ساتھ نہیں دیتے، آخری فرقہ صفات الٰہی کو مانتا ہے لیکن ہندو توحید کا قائل ہے اور صفات سے انکار کرتا ہے عنصری فرقہ چار خداؤں کا گمان رکھتا ہے مگر ہندو کہتا ہے ایک حق ہے اور اس پر قائم ہے ستاروں کا فرقہ تشبیہ کی طرف مائل ہے ہندو تنزیہ کی طرف۔ ایک فرقہ نور اور تاریکی کی تخلیق میں الجھا ہے لیکن ہندوؤں کو ان سے کوئی لگاؤ نہیں۔ برہمن اعتراف کرتا ہے کہ اس کا معبود ایسا ہے کہ اس کا مثل ممکن نہیں کچھ ہندو پتھروں اور جانوروں سورج اور درختوں کو پوجتے ہیں تو وہ ان کو مخلوق سمجھتے ہیں اور دیوی دیوتا کی مورت کی پرستش کرتے ہیں لیکن ان کی پرستش اپنے بزرگوں کی تقلید ہے جسے وہ آسانی سے نہیں چھوڑ سکتے۔ آخر میں ان اشعار پر بحث ختم کر دیتے ہیں۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

ہر ایک قوم کا ایک مسلک اور مذہب اور قبلہ ہوتا ہے لیکن میں نے بھی اپنا قبلہ ٹیڑھی ٹوپی والے کی طرف سیدھا کر دیا ہے (مراد معشوق یا مرشد سے ہے)

اپنے ذاتی مذہب کے بارے میں صاف صاف بتا دیتے ہیں۔

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

میں تو عشق کا کافر ہوں مجھ کو مسلمانی کی ضرورت نہیں ہے میری ہر ایک رگ تار بن گئی ہے مجھ کو زنار کی ضرورت نہیں ہے۔

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

لوگ کہتے ہیں کہ خسرو بتوں کی پوجا کرتا ہے۔ ہاں ہاں کرتا ہوں مجھ کو مخلوق سے کچھ واسطہ نہیں۔

یہاں تک تو میں نے خسرو کے کلام کے اس حصے پر توجہ دلانے کی کوشش کی جس کا براہ راست ہند اور ہند کی تہذیب کے ساتھ تعلق ہے، اب اس مقالے کے دوسرے حصے میں کچھ اور موضوع پر بحث ہے۔ خسرو کی شاعری کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مجھے ڈر ہے اگر میں اس پر کچھ لکھوں تو مضمون اتنا لمبا ہو جائے گا کہ آپ کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگے گا۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ خسرو کے یہاں شعریت کی تمام خوبیاں درجہ کمال پر ملتی ہیں۔ خسرو صنائع و بدائع کے استاد اور نئی صنعتوں کے موجد ہیں۔ تشبیہ اور استعارہ میں مشکل سے کوئی ان کا مقابلہ کر سکتا ہے انھوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا اور اسے اس خوبصورتی کے ساتھ نبھایا کہ باید و شاید۔ رزم کے بیان میں انتہائی جوش و حرارت ہے، بزم کی تصویروں میں دلوں کو موہنے والے رنگ، حمد و نعت اور پند و نصیحت کو نظم میں ایسا باندھا ہے جیسے لڑیوں میں آبدار موتی پرو دیتے ہوں۔ عشق و محبت کی داستانیں ہجر اور ملن کی کہانیاں ہر دکھ بھرے لطف کے ساتھ سناتے ہیں اور دلوں کو بے چین کر دیتے ہیں۔ غرض غزلوں کے اتار چڑھاؤ کا رتن ملتا ہے۔ کوئی پردہ کلاوت سرگم کے راگ سنوار رہا ہے۔ خسرو کی شاعری ہندوستانی فضا میں پروان چڑھی اس میں ہندوستانی رنگ چوکھا آیا۔ لیکن اس وقت موقع نہیں کہ اس طرف زیادہ دھیان دیا جائے۔

میں اس صحبت میں بتانا چاہتا ہوں کہ خسرو کے کلام میں حکمت سیاست اور تصوف کے کیسے کیسے بے بہا رتن ہیں، اس زمانے کے ہندوستانیوں کا اخلاق کن بنیادی قدروں پر قائم تھا۔ سیاست کے کون سے اصول تھے جن پر حکومت کا دارومدار تھا، کس قسم کے عالمگیر نظریے تھے جو زندگی کو معمول کی سطح سے اونچا اٹھاتے تھے اور انسانی ذہنیت کو جلا دیتے تھے، کون سے اعتقاد تھے جو جیون کی ناؤ کو لہروں کے تھپیڑوں اور ہواؤں کے جھونکوں کے باوجود کنارے کی طرف رہنمائی کرتے تھے۔

قصوی تیر بن سرد میں سب اثروں کے معانی انگیز ان کے سامنے پڑھے دفعہ آنکھیں جھک جاتی ہیں، اور زبان لڑکھڑاتی ہے۔ رفتہ کلام کا رخ بدلتا ہے اور حکمت و بینش کی مجلس آراستہ ہوتی ہے۔ عشق اور کامرانی کے بعد سراب کی گرما گرمی سے طبیعت بھری ہے، علم و دانش کا ترجمان ہوتے لگتا ہے۔ مدعوؤں میں ایک صاحب بزرگ امید نام ہیں جن سے خسرو سوال کرتا ہے اور وہ جواب دیتے ہیں، اس زمانہ کے فلسفہ اور سائنس کا خلاصہ دیتے ہیں جو بڑی دلچسپ ہے۔ سوال و جواب جن سے تعلق رکھتے ہیں سب کے لئے میرے پاس وقت نہیں چند پر اکتفا کرتا ہوں۔

سب سے پہلا سوال تو وہی پرانا مسئلہ ہے جو انسانی تاریخ کی ابتدا سے آج تک ہمارے دماغوں کو پریشان کر رہا ہے یعنی دنیا جہان کی پیدائش کا مسئلہ۔ خسرو نے اس زمانہ کے فلسفہ کی روشنی میں جواب دیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ حقیقت اولیٰ سے عقل اول ظہور میں آئی اور اس سے دو مسائل واجب اور ممکن، واجب سے ترتیب وار دس عقلیں ظاہر ہوئیں جن میں دسویں عقل فعال ہے جس سے امکانی نو آسمان یعنی زحل، کیوان، برجیس، مریخ، خورشید، زہرہ، سیاروں اور چاند کی سیر کے مدار ہیں۔ ارسطو کے وقت سے عالم کی پیدائش کا یہی نظریہ تھا جسے یورپ کے سولھویں صدی کے سائنسدانوں نے بدلا اور نئی سائنس کی بنیاد ڈالی۔ اسی طرز پر چار عنصروں کا سوال حل کیا ہے۔ لیکن تو جبیعت یہ عنصر کس اصلی مادہ سے نکلے ہیں تو کہتے ہیں کہ عقل اس کے سمجھنے سے معذور ہے۔ پھر چاروں عنصروں کا ذکر کرتے ہیں یعنی مٹی، ہوا، پانی، آگ اور پھر ان کی صفتیں بتاتے ہیں۔ ان میں آگ اور ہوا کا مرتبہ باپ کا اور پانی اور مٹی کا ماں کا ہے ان سے موالید ثلاثہ وجود میں آئے ہیں، جن کے نام معدن، نبات، اور حیوان ہیں اور ان کی بہترین اولاد آدمی ہے۔ آدمی سے کیا مراد ہے؟ جواب سنیے:

غرض گر ہست وجود دو آسام
حواں را ہم تواں کرد آدمی نام

اگر شہوانی خواہشات اور کھانے پینے کو مقصد قرار دیا جاتے تو پھر لوگ گدھوں کو بھی آدمی کہہ سکتے ہیں۔

اگر سونے اور چاندی کے معاملے میں اس کو حاصل کرنے کے لئے کوئی چابک دستی سے کام کرتا ہے تو سمجھو کہ لنگڑا گھوڑا ہے جو بوجھ کی وجہ سے لنگڑا ہو گیا ہے۔

گرش گنج و درم باشد جہانی
چو درمی بود محتاج نانی

اگر خزانہ اور روپیہ پیسہ ہی کسی کے لئے دنیا ہے تو اگر تم غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی روٹی کا محتاج ہے۔

چو این سرمایہ بود با ترو خشت
نشاید بے خرد را آدمی گفت

غرض یہ کہ عقل سے مجرد کیا جائے تو بے عقل کو انسان کہنا ضرور نہیں

پس آنکس مردم آمد در آفرینش
کہ ہستش بہرہ زو فتادون بینش

یعنی روز ازل سے صحیح معنوں میں مرد وہی ہے جس کی نگاہ عقل سے منور ہو۔

یعنی اگر آدمیت سے مراد محض کھانا پینا اور اولاد پیدا کرنا ہے تو گدھے کو بھی آدمی کہہ سکتے ہیں۔ اگر کوئی سونے چاندی جمع کرنے میں تیز ہے تو وہ اس جانور کی مثال ہے جو ٹانگ سے لنگڑا ہے اور اگر روپیہ پیسہ ہی دنیا ہے تو اس کے اندر آدمی روٹی سے محتاج ہے جو کہ بے چارہ کا عقل سے جوڑ نہیں اس لئے بے عقل کو آدمی کہا نہیں دیتا اس کو اس عالم میں آدمی کا مرتبہ دے سکتے ہیں جس کی زندگی کے معیار عقل کے دائروں سے بندھے ہیں۔

اس مضمون کو سکندر کا شاعر اس طرح باندھتا ہے۔

یعنی جن کے پاس نور نہیں ہے، بے ترتیب و رنگ ہے اور بے نور ان رنگوں ہے بے شکل بے رنگ ہے اور بے دھرم وہ لوگ اس دنیا میں کالبوتھ ہیں آدمی کے روپ میں چلتے پھرتے جانور ہیں۔

عقل کیا چیز ہے؟ وہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ جو چیز انسان کو عاقبت یعنی آئندہ کی طرف مائل کرے اور اسے ازلی معبود کی یاد دلائے۔ پھر اور سوالات کے بعد سوال ہوتا ہے کہ روحانی کیا حقیقت ہے؟ جواب یہ ہے کہ روح چھپا ہوا راز ہے اسے کوئی جانتا نہیں لیکن دنیا معنی کا آئینہ ہے جس میں یہی اور روحانی طاقت ہے۔ یہ آئینہ بالکل صاف اور بے رنگ ہے اور اس میں روح کے نقش سے عکس پیدا ہوتے ہیں۔ موجود اور غیر موجود غرض اس پر تصویریں باقی ہیں جیسے موم پر نقش اور زمین آسمان سورج اور ستارے نمونوں کی طرح اس سماوی سمندر کو بھر دیتے ہیں۔ لیکن یہ سب اصلی معنی کی تصویریں ہیں جو آئینہ میں منعکس ہیں۔

بادشاہ کا بزرگ امید سے آخری سوال ہے حکومت کے متعلق، بادشاہوں کا کیا دستور ہونا چاہئے؟ یہیں سے خسرو کے سیاسی نظریوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو خسرو شیریں تک محدود نہیں اکثر مثنویوں میں پھیلا ہوا ہے۔

خسرو کے فکر کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ سیاسی مخالفوں کے ساتھ سخت دشمنی کا سلوک کرتے ہیں خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں، لیکن ہم وطنوں کے مذہب اور تمدن کا لامذہبی مذہب احترام کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے مذہب سنسکرت اور ہندی زبانوں اور ہندو رسموں اور روایتوں کا بیان محض رواداری سے نہیں طرفداری کے نقطہ نظر سے کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر منگولوں کا بیان دیکھئے۔ ان کے چہرے ایسے کھونے جیسے ہیں جن میں جھریاں اور سلوٹیں پڑی ہیں، ناک اتنی چوڑی ہے کہ چہرے کے ایک طرف سے دوسری طرف تک پھیلی ہیں، نرگی طرح گندی اور بھٹی کی طرح پانی سے بھری ہیں منہ چھپے ہیں اور ان سے رال بہتی ہے۔ ناک کے بال ہونٹوں تک لٹکتے ہیں اور مونچھیں بہا

لیکن اس میں ذرا سی تھوڑی سی کمی ہے کیوں کہ ان کے رومانی ہیرو پرستی میں اگ سکتا ہے جیسا تمام تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے اور ترجمہ میں پرکاش ملا دیتے ہیں بیٹھے کی کھال کھینچی جیسی سیپ اور گندگی کا ٹکڑا جو ترتوں کے قابل ہے آج علاؤ الدین خلجی کے پاس سے عمل کیا ہے اور آنکھ سرخ ہو کر ڈرتے گھونٹ رہا ہے۔ ان کی تو راکھ ہے ہے مگر وہ اس کے بدن جوڑ، ہڈی کے کنویں نا سا ہیں۔ غرض مغول مذہب اور سب سے زیادہ جو شکوہ ہیں ملکوں کی جیسی درگت کی ہے اس حد تک نہیں لیکن حکومت نے جیسے دشمن کے لئے لعن اور سمع کے کلمے استعمال کئے ہیں گجرات کے راجا کو راجا بد بخت کے نام رکھا ہے، ورنگل کے راجا کو ابلیس دریا کا کوڑا کے گمراہ اور کر بعض اس طرح متنفع تمام کولیوں کا ذکر کیا ہے۔ بعض موقعوں پر لکھا ہے کہ دنیا ہندوؤں سے خالی ہوگئی ظاہر ہے یہاں مراد یہ نہیں ہے کہ سب ہندوؤں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس جگہ کا مطلب یہ ہے کہ ہندو راجے جا راجے مطیع اور فرماں بردار ہوگئے اور دہلی کے بادشاہ کو باج اور خراج دینے لگے۔ جہاں تک ہندو مذہب کی طرف اشارہ ہے وہاں مذہبی رواداری اور حقیقت نگاری ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن السعدین کی ایک مشہور غزل کے چند شعر لکھنے سے خالی نہیں۔

اے دہلی و اے بتان سادہ
پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

اے دہلی اور اس کے سادہ لوح خوبصورتوں نے پگڑی باندھ رکھی ہے اور ٹوپی ٹیڑھا ہیرہ لگائے ہوئے ہیں۔

مسرمان بر بد ارانکہ ہستند
ازعاشق بار خود بر افتادہ

وہ کسی حکم کی تعمیل نہیں کرتے کیوں کہ خود اپنے ناز و انداز کی سواری ہی پاس چلاتے ہیں۔

خورشید پرست شد مسلمان
زین ہندوگان شوخ و سادہ

اس شوخ اور سادہ حسین ہندو محبوبوں کی وجہ سے مسلمان بھی سورج کو پوجنے والے ہوگئے ہیں۔

ہندو رسموں کی بھی رعایت ملحوظ رکھی چنانچہ ستی کے بارہ میں کہتے ہیں۔

گرچہ در اسلام رواہیست چنیں
لیک چوبس کار بزرگست ببیں

اگرچہ اسلام میں یہ جائز نہیں ہے لیکن اگر تو غور کرے تو بہت بڑا کارنامہ ہے۔

گر بہ شریعت بود این نوع روا
جان بدہند اہل سعادت ہمہ

اگر شریعت میں اس قسم کی چیز جائز ہوتی تو سعادت مند زیادہ جان دینے کی کوشش کرتے۔

خسرو کے سیاسی خیالات کے اور پہلو بھی غور طلب ہیں۔ حکومت کے متعلق ان کا نظریہ ہندوستانی اور ایرانی عقیدوں سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان میں راجا کا درجہ بہت ہی اونچا مانا جاتا ہے، راجا سے اگر کوئی اونچا ہے تو ایشور۔ کالی داس نے رگھو خاندان کا سورج دیوتا سے رشتہ ملایا ہے اور تعریف میں ایسے بلند آہنگ اور پرشکوہ لفظ استعمال کئے ہیں کہ ان پر عجب اثر پیدا کرتے ہیں۔

یعنی یہ خاندان نسب سے صحیح اور پاک دامن اور اپنے کاموں میں ہمیشہ کامیاب ہے سمندر کے کناروں تک زمین کا حاکم ہے اور آسمان کے افق تک اس کی سواری کا میدان پھیلا ہے۔ عبادت میں شرع کا پابند، حیرات میں آرزوؤں کا پورا کرنے والا، مجرموں کو سزا دینے میں اور دوست کی پاسداری میں سچی سے کارفرما ہے۔ دولت اس غرض سے جمع کرتا ہے کہ احتیاج مندوں میں تقسیم کردے۔ کم گو اس لئے ہے کہ سچائی ہاتھ سے نہ جائے۔ ملکوں کو شہرت کی خاطر فتح کرتا ہے اور اولاد کے لئے خانہ داری کے فرض ادا کرتا ہے۔

کالیداس اس کے ساتھ ساتھ خسرو کے شاعرانہ تخیل کے شعروں پر کان لگائیے۔ علاء الدین کو جن لفظوں سے مخاطب کرتے ہیں ان میں وہی تان ہے جو سنسکرت میں سنائی دیتی ہے۔ سنسکرت اور فارسی کے آہنگ میں الف ممدودہ نے جو سماں پیدا کر دی ہے وہ بیان سے باہر ہے فرماتے ہیں۔

سپہا گنج بخشا کرم گسترا
معانی شناسا سخن داورا

اے خزانہ بخشنے والے اور مہربان شہنشاہ اور حقائق کو سمجھنے والے اور شعر و ادب کے مربی۔

مرا عمر کز شصت بالا گذشت
ہمہ پیش سایات والا گذشت

میری عمر جو ساٹھ سے اوپر ہو چکی ہے۔ ساری کی ساری بلند مرتبہ شاہان کے ساتھ گزری۔

ازاں پس کہ در شہ ستانی شدم
تو گر گنج علائی شدم

اس کے بعد سے میں مستقل طور پر بادشاہوں کا مداح رہا ہوا اور علاء الدین کی بخششوں سے دولت مند ہو گیا ہوں اور پھر تعریف یوں کرتے ہیں۔

کہ ہست از عون و عدل و احسان شہ عالم
جہان معمور امان محکم طرب بیحد خوشی بے غم

امیر خسرو مؤرخ کی حیثیت سے

خلیق احمد نظامی

امیر خسرو کے معاصر اور دوست ضیاء الدین برنی کا بیان ہے۔
"امیر خسرو در نظم و نثر پارسی کتب خانہ تصنیف کردہ است"[1]
(امیر خسرو نے فارسی نظم و نثر میں ایک کتب خانہ تصنیف کیا ہے) ایک اور ہم عصر تذکرہ نویس میر خورد نے اس کی تصدیق اس طرح کی ہے۔
"از کتبے کہ انشا نمودہ یک کتب خانہ پُر گشت"[2]
(ان کی تصنیف کی ہوئی کتابوں سے ایک کتب خانہ بھر گیا) لیکن ان دونوں میں سے کسی نے یہ وضاحت نہیں کی کہ یہ کتابیں کن کن اور موضوع سے تعلق رکھتی تھیں۔ برنی نے علاء الدین خلجی کے عہد کے مشاہیر صوفیہ، علماء، شعراء، مؤرخین اور دیگر علوم و فنون کے ماہرین کے نام گنائے ہیں اور لکھا ہے کہ چشم روزگار نے باکمال لوگوں کا ایسا مجمع پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس فہرست میں امیر خسرو کا نام شعراء کے زمرہ میں آتا ہے۔ مؤرخین میں امیر ارسلان کلاہی، کبیر الدین پسر تاج الدین عراقی کا ذکر کیا گیا ہے لیکن امیر خسرو کا نام نہیں لیا گیا۔ کیا برنی کی نظر میں امیر خسرو کا مؤرخ کی حیثیت سے کوئی امتیازی مقام نہیں تھا؟ لندن یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر پیٹر ہارڈی نے امیر خسرو کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ شاعر تھے، مؤرخ نہ تھے۔[3] اگر اس رائے کی بنیاد صرف یہ خیال ہے کہ ان کی ادبی کاوشوں کا حقیقی مرکز اور محور شاعری تھی، تو اس سے اختلاف کی گنجائش نہیں، لیکن اگر اس کا مقصد امیر خسرو کی تصانیف کی تاریخی اہمیت اور افادیت کو کم کرنا ہے تو یہ رائے غلط ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی ہے۔ اگر تاریخ نام ہے صرف سیاسی واقعات کی کھتونی کا، تو امیر خسرو یقیناً مؤرخ نہیں تھے، لیکن اگر تاریخ عبارت ہے انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تصویر و تعبیر سے، تو امیر خسرو کی تصانیف ہمارے تاریخی ورثہ کا بہترین سرمایہ، اور قرونِ وسطیٰ کی تہذیب کی بہترین آئینہ دار ہیں۔ عصرِ حاضر کا مؤرخ جب ہندی قرونِ وسطیٰ کی تہذیب اور اس کے جلوۂ صد رنگ کا جائزہ لینا چاہتا ہے تو اس کو اپنی معلومات کا سب سے بڑا سرچشمہ امیر خسرو ہی کی تصانیف میں نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنی ان مثنویوں میں بھی جن کا بظاہر ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہندوستانی تہذیب کے رنگ و بو ہی سے اپنے مرقعے سجا رکھے ہیں۔ اس عہد کی روح، جس کو سمجھے بغیر تاریخی عوامل کا تجزیہ ممکن نہیں، ان کی تصانیف کے ہر صفحے پر متحرک نظر آتی ہے۔ امیر خسرو نے ماضی کی داستانیں نہیں لکھیں، اپنے مشاہدات بیان کیے ہیں۔ خود کہتے ہیں ؎

من از دیدہ خویش گویم سخن
نہ از افسانۂ داستان کہن[4]

اور ان مشاہدات کا تنوع، ان کے ذہن اور نظر کی وسعت کا رہین منت ہے۔ تماشا گاہِ عالم کو انہوں نے ہر ہر پہلو سے دیکھا تھا۔ کبھی دربارِ شاہی سے اس پر نظر ڈالی، کبھی خانقاہوں میں بیٹھ کر اس کی حقیقت کو سمجھنے کی جستجو کی۔ زمانہ سازی کی نیرنگیوں کو جو حاصلِ زیست سمجھتے تھے، ان کو بھی قریب سے دیکھا، جنھوں نے اس سے منہ موڑ لیا تھا، ان کے پاس بھی بیٹھے۔ "ذرے ورامش و رنگ و بو" کی دنیا کا بھی جائزہ لیا اور زہد و تقویٰ اور ریاضت و مجاہدہ کی زندگی کا بھی مزہ چکھا۔ لڑائی کے میدان میں انسانی جسموں کو پارہ پارہ ہوتے اور خانقاہوں میں انسانی دلوں کو جوڑتے ہوئے بھی دیکھا۔ بادشاہوں کی ہوس ملک گیری کے تماشے بھی دیکھے اور زبان سنبل سے محتاج مفلسوں کے دل کی دھڑکنوں کو بھی سنا۔ وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل بھی کہی اور خاک کے آغوش میں راتوں کو مناجات بھی کی۔ دہلی سے ارنگل اور ملتان سے لکھنوتی تک ہندوستان کے ہر ہر گوشے میں پہنچے۔ یہاں کے پہاڑ، دریا، صحرا، موسم، پھل پھول، جانور، زبانیں، رسم و رواج ایک ایک چیز کا مشاہدہ کیا۔ ہندوستانی زندگی کے اس وسیع اور بھرپور تجربہ نے جو بصیرت ان میں پیدا کر دی تھی، وہ ان کی تاریخی تصانیف میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔

امیر خسرو کا تاریخی مطمحِ نظر دربار تک محدود نہیں تھا۔ وہ دربار میں رہتے ہوئے بھی دربار کے نہیں تھے۔ دربار میں ملازم ہونے کے باوجود جنگ و جدال سے نفرت کرتے تھے۔ کوکبۂ شاہی کی چمک دمک ان کی آنکھوں کو کبھی خیرہ نہ کر سکی اور عوام کی زندگی ہی ان کی دلچسپیوں کا مرکز رہی۔ ایسا خیال ہوتا ہے کہ امیر خسرو کی جو تصانیف ہم تک نہ پہنچ سکیں اور ضائع ہو گئیں وہ غالباً وہ تھیں جن کا تعلق بادشاہوں سے نہیں تھا بلکہ جو عوام سے متعلق تھیں۔ بادشاہوں سے متعلق لٹریچر کے تحفظ کا اہتمام تو شاہی کاتب اور مصوروں نے کر دیا، دوسرے لٹریچر کو یہ سہولت میسر نہ آ سکی اور دست بُردِ زمانہ

1. تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۹ 2. سیر الاولیاء ص ۳۰۲ 3. HISTORIANS OF MEDIEVAL INDIA ص ۹۳ 4. نہ سپہر صفحہ ۹۳

ند، ہوگیا عالم سیدہ سی کر رہ گیا۔

[illegible] کہ انھوں نے اپنی مثنویوں میں بادشاہوں کی انا پر لکھی تھیں لیکن [illegible] حال تھی اُن کے تصور کی ہمہ گیری کو مات نہ کر سکی تھی۔ انھوں نے جواہر کی [illegible] کشی اور بزم و رزم کی داستانیں بیان کرتے کرتے جب طبیعت اُکتا جاتی ہے تو ان کا ذہن ایسے گوشوں کی طرف لے جاتا ہے جو عوامی زندگی سے متعلق ہیں اور وہ کچھ دیر عام لوگوں، صحراؤں، جنگلوں، رہن سہن اور رسوم و رواج کا ذکر کر کے اپنے منہ کا ذائقہ بدلتے ہیں۔ یہاں وہ زندگی کی حقیقتوں سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں اور اُن کی شاعری انسانی فطرت سے سرگوشیاں کرتی نظر آتی ہے۔ ذیل میں علاء الدین خلجی کی حیات کا نقشہ کھینچنے پر پورا زورِ قلم صرف کر رہے ہیں لیکن ایک مصرع سے جملے میں اس سارے کارنامے پر اپنی ناشناس اس طرح ظاہر کر دیتے ہیں۔ ثم ردی العظام فی الارض۔

علاء الدین خلجی کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے اس میں ملک گیری کی ہوس کے خلاف اُن کے حقیقی جذبات متحرک ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور سلطان کی روح سے مخاطب ہو کر کہا۔

چو ہر کہ خاک، آمد بار خاک ست 123738

خوش آں کس کہ در عم بودہ پاک ست 20-3-95

جہاں بادگرم آں کشور و سپہر

کراں بد بہدمتش ارجار گر سپہر

قرونِ وسطیٰ کے لٹریچر کو صحیح پس منظر میں سمجھنے اور صحیح نتائج اخذ کرنے کے لئے مصنف کی نفسیات، اس کے ذہنی محرکات، ماحول اور اندازِ بیان کا تجزیہ کرنا از بس ضروری ہے۔ اس طرح نہ صرف مصنف کی تعصب نے نقاب سامنے آجاتی ہے بلکہ اس کی فکر اور اس کے جذبات کی بہ یک رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔ امیر خسرو کی ہر تصنیف ایک علیحدہ ذہنی اور جذباتی کیفیت کا نتیجہ ہے۔ کیقباد کے ہنگامہ ہائے ناؤ نوش سے طبیعت متنفر ہے، لیکن سلطان کی زندگی اس کے علاوہ اور ہے کیا، وہیں دوسرے مناظر اور رکھ رکھاؤ کی نقش گری کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جلال الدین خلجی کی تخت نشینی اُس عہد کے خاتمہ کا اعلان کرتی ہے جس میں اُن کے باپ امیر سیف الدین محمود نے عزت اور شہرت حاصل کی تھی اور التتمش کی فتوحات کا دائرہ بڑھانے میں معاون ہوتے تھے۔ ان ترک امراء کے سایہ میں خود امیر خسرو کے دورِ بچپن نے پرورش پائی تھی، اب وہ عہد ختم ہوتا ہے اور اس کے بعض آثار پارہ پارہ نظر آتے ہیں اس منظر سے ان کا دل روتا ہے لیکن چہرہ پر مسکراہٹ نظر آتی ہے۔ علاء الدین خلجی کے عزم ملک گیری میں ان کو التتمش کے ادھورے خواب کی تعبیر دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کی فتوحات میں تباہی و بربادی کے مناظر اُن سے برداشت نہیں ہوئے۔ وہ "ملک گیری" کے معاملہ میں "نظم و نسق" کو ترجیح دے کر سلطان کی ان کوششوں کا ذکر کرنے لگتے ہیں جن کا مقصد اخلاق کی درستگی اور ایک بہتر معاشرہ کی تشکیل تھا۔ مبارک خلجی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں لیکن نظر اس کے معائب سے نہیں ہٹتی اور جگہ جگہ

ایسے مخصوص انداز میں اس پر گرفت کرتے جاتے ہیں۔ امیر خسرو کی تاریخی تصانیف کے سرسری مطالعہ سے تاثر یہ گمان ہو کہ وہ سب بادشاہوں کی ایک سی ہی تعریف کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، لیکن اگر ذرا گہرائی میں اُترا جائے تو نقصان کے نازک تار و پود نظر آنے لگتے ہیں۔

تاریخی اہمیت کے پیش نظر اگر امیر خسرو کی تصانیف پر نظر ڈالی جائے تو پورے لٹریچر کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) پانچ دیوان "تحفۃ الصغر" "وسط الحیوٰۃ" "غرۃ الکمال" "بقیہ نقیہ" "نہایت الکمال" جن کی بنیادی نوعیت ادبی ہے لیکن ان میں ایسے قصائد شامل ہیں جن سے اس عہد کی بعض اہم شخصیتوں اور اہم واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۲) خمسہ "مطلع الانوار" "شیریں خسرو" "آئینہ سکندری" "ہشت بہشت" "مجنوں لیلیٰ" ان مثنویوں کا موضوع تحت ہندوستان سے تعلق نہیں رکھتا لیکن ان میں جگہ جگہ ہندوستانی تہذیب اور معاشرت سے متعلق بہت سی دلچسپ معلومات فراہم کر دی گئی ہیں۔ اسی وجہ سے امیر خسرو کی مثنوی نگاری کو "تاریخی ثقافتی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳) "اعجازِ خسروی" ضخیم نثری کارنامہ ہے جس میں انشاء کے نمونے درج ہیں بعض اہم تاریخی دستاویزات بھی اس میں شامل ہیں جن سے تاریخی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۴) تاریخی مثنویاں اور تاریخ ("قران السعدین" "مفتاح الفتوح" "دولرانی خضر خاں" "تغلق نامہ" اور "خزائن الفتوح") ان سب کا موضوع تاریخی ہے اور اس عہد کے مختلف سیاسی اور تہذیبی حالات کے لئے متن کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس لٹریچر کی تاریخی اہمیت کو سمجھنے کے لئے بعض حقائق کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

(۱) ادب کی ہر صنف خواہ وہ قصیدہ ہو یا مثنوی، تاریخ ہو یا تذکرہ ایک علیحدہ اندازِ بیان ہوتا ہے جس کی پابندی مروجہ اصولوں کے مطابق ہر شاعر اور انشاء پرداز کو کرنی پڑتی ہے۔ قصائد کے بہت سے حصے محض زیبائش کے لئے ہوتے ہیں اس طرح کی اصنافِ سخن سے تمام حشو و زوائد کو علیحدہ کر کے ہی تاریخی حقائق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ خود امیر خسرو کا خیال تھا ؎

کار آرائش کرد بی زعد میں

رخسارۂ قصہ را کند زریں

(۲) یہ سب لٹریچر بادشاہوں کے ملاحظہ کے لئے اکثر اُن کی ایماء پر وجود میں آتا تھا۔ شاعری اور پھر درباری آداب، دونوں کا تقاضہ تھا کہ عبارت آرائی اور زورِ قلم میں پوری کوشش کی جائے۔ قرونِ وسطیٰ میں جب کوئی نیا علاقہ فتح ہوتا تھا تو "فتح نامے" لکھوا کر دوسرے ممالک کو بھیجے جاتے تھے اور ان میں پورا زورِ بیان صرف کیا جاتا تھا۔ یہی انداز تاریخوں کے لئے بھی اختیار کر لیا گیا تھا۔ اس لٹریچر میں مبالغہ آرائی کی حیثیت بالکل زرق برق لباس کی ہے جس کے اندر اصل جسم پوشیدہ ہوتا ہے۔ کارلائل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مصنف کا اندازِ بیان اس کا جسم ہے۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔ لباس ہیں اگر مبالغہ آرائی کا لبادہ اتار دیا جائے تو حقیقت بالکل واضح نظر آجاتی ہے۔ مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی نے صحیح لکھا ہے کہ امیر داستان کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ شاعری کے ساغر میں حقیقت ہیستِ عریاں نظر آتی ہے:

(۳) تاریخی اعتبار سے ان تصانیف کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ امیر خسرو خود ان واقعات کے شاہد ہیں۔ اس لئے جزئیات اور تفصیل کو اتنے کو مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ عمارتوں کی تصویر، موسموں کی تفصیل، لباس کی جزئیات سے وہ ایسی فضا پیدا کر دیتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ دور زندہ ہو جاتی ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ زمان و مکان کی ساری بندشیں ٹوٹ چکی ہیں اور ہم اسی ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔

(۴) امیر خسرو نے اکثر جگہ واقعات کی تاریخی ترتیب کا خیال رکھا ہے اور اس کی پابندی کی ہے ضیاء الدین برنی کے یہاں تاریخوں کا فقدان ہے۔ معاصر مورخین کی اس کوتاہی کو امیر خسرو نے بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔ جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی، مبارک خلجی اور غیاث الدین تغلق کے عہد کے بہت سے واقعات کی تاریخی ترتیب، امیر خسرو کی تصانیف ہی کی بنا پر کی گئی ہے۔

(۵) ہندوستان کے مختلف مقامات سے ذاتی واقفیت کی بنا پر انھوں نے شہروں اور قصبات کا جو حال لکھا ہے وہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر ہے "مفتاح الفتوح" اور "خزائن الفتوح" میں مختلف مہمات کے سلسلہ میں جن مقامات کا ذکر آیا ہے اس سے تاریخی واقعات کو صحیح پس منظر میں سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

(۶) امیر خسرو نے مختلف موقعوں پر اپنے جذبات کو خاموش لیکن مضبوط طریقہ پر ظاہر کر دیا ہے۔ بعض جگہ واقعات کی تفصیل اس انداز سے دی ہے کہ ایک تاریخی ذہن اُن میں زوال کے اثرات کا صاف اندازہ لگا سکتا ہے "نُہ سپہر" میں مبارک خلجی کی شکار میں دلچسپی اور بزم آرائیوں کا نقشہ، خلجیوں کی بربادی کی پیش گوئی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ "قران السعدین" میں کیقباد کے دربار کے ہنگامہ ہائے نا و نوش شاہی خاندان کی تباہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

"تحفۃ الصغر" امیر خسرو کے ۱۶ سال سے ۱۹ سال کی عمر تک کے کلام پر مشتمل ہے اس میں بلبن، شہزادہ محمد، حاتم خاں، اختیار الدین کشلو خاں، قوام الملک، عزیز الدین کے نام قصائد شامل ہیں جن سے اس دور کے امراء کے حالات کی ترتیب میں بڑی مدد ملتی ہے "وسط الحیوٰۃ" میں ۲۲ سال کی عمر کا کلام ہے۔ اس میں ۸۵ قصائد شامل ہیں۔ جن کا تاریخی مواد تیرہویں صدی کی تاریخ کی ترتیب و تدوین کے لئے ایک بیش قیمت ذخیرہ ہے۔ منگولوں کے حملوں، شہزادہ محمد کی شہادت اور طغرل کی ہزیمت کا تفصیلی حال اس میں موجود ہے۔ منگولوں نے ایک جنگ میں امیر خسرو کو بھی قید کر لیا تھا۔ اسی پریشانی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

اسیر گشتم و ریہم آں کہ خون ریزد
نمی نماند رگوں در تنم ز بیم وزار

جو منگول اُن کو گرفتار کرکے لے جا رہا تھا اس کا حلیہ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

فرو شدہ کمر اس کردہ رہ می رفت | نشستہ بر فرسے چو پلنگ در کہسار
کشادہ از دہنش بُوئے چو لوتے بغل | فتادہ بر زنخش سبلے چو موئے زہار
زماندگی ندمے گر نماندے تشنہ | گہے طلایہ کشندے بخشم گر تکرار

منگولوں کی جو تصویر انھوں نے پیش کی ہے وہ اس دور کے تاریخی لٹریچر میں سب سے زیادہ مکمل نظر آتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی نیلی آنکھیں، موٹا تھپا تھا چہرہ چپٹی ناک پھیلے تھے، داڑھی کے دو چار بال ٹھوڑی سے لٹکے ہوتے، لمبی لمبی مونچھیں، گھٹا ہوا سر۔ تاتاری زبان میں نعرے لگاتے ہوئے۔ یہ تھے منگول جنھوں نے تیرھویں صدی کے ہندوستان میں آگ اور خون کا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔

"غرۃ الکمال" میں امیر خسرو کا ۳۴ سال سے ۴۳ سال کی عمر تک کا کلام شامل ہے۔ دیباچہ میں مختصراً اپنے حالات بیان کرتے ہوئے اس عصر کے ادبی رجحانات کی طرف بلیغ اشارے کئے ہیں فارسی اور عربی شاعری کی بنیادی خصوصیات بیان کی ہیں۔ ان کے بیان سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فارسی کے ذریعہ ملک میں ایک انتظامی یکسانیت پیدا ہو گئی تھی "غرۃ الکمال" میں ۹ سے زیادہ قصیدے ہیں جن میں خلجی سلاطین اور شہزادوں مثلاً ارکلی خاں، الماس بیگ، الغ خاں کے سب نحسب حالات درج ہیں۔ علاء الدین خلجی کے ایک بیٹے کی پیدائش پر جو قصیدہ لکھا ہے اس میں دہلی کی زینت و آرائش اور اس کی تمدنی زندگی کی ایک دلآویز تصویر پیش کی ہے "بقیہ نقیہ" میں علاء الدین خلجی کے انتقال کے بعد کا کلام ہے۔ اس میں ۴۲ قصیدے ہیں جو قطب الدین مبارک خلجی، الماس بیگ، تاج الدین وغیرہ کے نام ہیں۔ رمضان اور عید پر بھی نظمیں شامل ہیں جن میں اس دور کی مذہبی زندگی کی جھلک ملتی ہے "نہایت الکمال" امیر خسرو کا آخری دیوان ہے جس میں تغلق سلاطین، غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق کے نام قصائد ہیں۔ ایک مثنوی "در تعریف تغلق آباد" ہے جس میں دورِ تغلق کی اس نئی آبادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثنوی "مجمع الاوصاف" میں قتلغ آباد (دیوگیر) کا حال لکھا ہے یہ مثنوی تاریخی اعتبار سے بے حد اہم ہے الغ خاں جو بعد کو محمد بن تغلق کے نام سے تخت نشین ہوا، ۲۲، ۱۳۲۱ء میں دیوگیر کی مہم پر بھیجا گیا تھا۔ اس زمانے میں دیوگیر کا نام قطب آباد تھا امیر خسرو بھی اس کے ساتھ گئے تھے۔ انھوں نے جس طرح اس شہر کی آبادی جغرافیائی خوبیوں اور موسم کی دلکشی کا ذکر کیا ہے اس کے پیش نظر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ محمد بن تغلق نے دیوگیر کو ایک جنوبی دارالسلطنت کی شکل دینی چاہی تو امیر خسرو کے خیالات کا اثر بھی اس کے ذہن پر کام کر رہا تھا۔

"خمسہ" ایک ادبی شاہکار ہے جس میں امیر خسرو نے نظامی گنجوی کے مشہور ادبی کارنامے کا جواب دے کر ہندوستان کی علمی سربلندی کا سامان مہیا کیا ہے۔ لیکن اس میں ہندوستان کی معاشرت اور تہذیب کے متعلق نہایت اہم اور دلچسپ حوالے ملتے ہیں۔ یہاں کے جانوروں، پھل پھول، کپڑوں، فنون، سنگتراشی، مذہبی رسوم، شطرنج، ساز و موسیقی وغیرہ کے متعلق جو تفصیلات اس میں بکھری ہوئی ہیں اگر ان کو یکجا کر دیا جائے تو ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی تمدنی زندگی کے بہت سے گوشے روشن ہو جائیں گے۔

...ہ احوال خسروی کو امیر خسرو نے ۔ سال کی عمر میں مکمل کیا تھا۔ اس میں اُن کی ابتدائی تصانیف اور ابتدائی دور کے کچھ رسائل بھی شامل ہیں۔ گو اس تصنیف کا مقصد ایسی انشا پردازی کا سکہ بٹھانا ہے لیکن اس عہد کے واقعات پر جگہ جگہ اشارات بھی آگئے ہیں جس سے اُس دور کی بھی ادبی، سماجی اور سیاسی تاریخ کی تدوین میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اگر ایک طرف سرکاری تاجروں کی سرگرمیاں اور غیر سماجی عناصر کی ریشہ دوانیاں دکھائی گئی ہیں تو دوسری طرف موسیقی کے مختلف طرز، اسلحہ کے مختلف اسالیب اور زبان و بیان کے مختلف زاویوں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ موسیقی کی ایک ماہر ترقی خانوں کو دکھا کر یہاں کی خوبیوں کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں۔ سیاسی حالات کے سلسلہ میں بلبن کا فتح نامۂ لکھنوتی اور علاء الدین خلجی کا وہ فرمان جو بغاوت کے فوراً بعد جاری کیا گیا تھا ایسی دستاویزیں ہیں جن کو تاریخ کا کوئی طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اس لٹریچر سے قطع نظر جس کی حیثیت ادبی ہے، امیر خسرو کی دیگر تصانیف تاریخی معلومات کا ایک گنجینہ ہیں جن کے مطالعہ سے تاریخ کے طالب علم کو صرف سیاسی واقعات ہی سے آگاہی نہیں ہوتی بلکہ اس دور کے فوجی نظام، ادبی ماحول، سماجی اور تمدنی حالات کے متعلق بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

تاریخی مثنویوں میں سرفہرست "قران السعدین" کا نام آتا ہے۔ یہ مثنوی کیقباد کی فرمائش پر رمضان ۶۸۸ھ مطابق ستمبر ۱۲۸۹ء کو مکمل ہوئی۔ بلبن کا جب انتقال ہوا تو اس کا بیٹا بغرا خاں بنگال کا گورنر تھا۔ دہلی میں امرا نے اس کے بیٹے کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا۔ باپ نے بنگال میں آزاد حکومت کا اعلان کر دیا جس پر سیاسی کشمکش کا آغاز ہوا اور فوج کشی تک نوبت پہنچ گئی۔ پھر کچھ دنوں تک نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اودھ میں دونوں کی ملاقات ہو۔ امیر خسرو اس موقع پر کیقباد کے ساتھ اودھ گئے تھے اور سلطان کی دہلی واپسی کے بعد بھی دو سال تک وہاں رہے تھے۔ جب دہلی واپس آئے تو سلطان نے انہیں اپنا ندیم بنایا اور مثنوی لکھنے کا حکم دیا۔ "قران السعدین" امیر خسرو کے ابتدائی زمانہ کا کارنامہ ہے لیکن زبان و بیان کی خوبی، دہلی اور اودھ کے سماجی ماحول کی تصویر کشی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ بعض ناقدین نے اعتراض کیا ہے کہ اس میں اصل مضمون کے متعلق بہت کم لکھا ہے۔ دوسرے مباحث زیادہ ہیں۔ امیر خسرو کو اس بات کا احساس تھا۔ اس کا سبب بتاتے ہیں ؎

چون نبود ز لطف شاہ بداست	کالبدش صورت حالے نداشت
وصف بزرگان گرہ بند زبان	کرد غرض قصہ فرو ماندہ ام

کہتے ہیں کہ میں نے صلہ کی طمع میں یہ مثنوی نہیں لکھی، میرا سخن بجائے خود ایک خزانہ ہے۔ اس کے سامنے گنج زر کی کیا حقیقت ہے۔ شاعری کی بدولت مجھ کو جو صلہ ملتا ہے اس کو دو چند کر کے مستحقین میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ اگر سلطان مجھ کو فریدوں و جمشید کا سا خزانہ بھی عطا کرے تو میرے ایک حرف کا بھی صلہ نہ ہوگا۔

من کہ نہادم ز سخن گنج پاک	گنج زر اندر نظرم چیست خاک
در نہدم گنج فریدون و جم	بر یک حرف او بود بلکہ کم

مثنوی میں ایسی بہت سی تفصیلات ہیں جن سے اس دور کے تمدنی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً دہلی کی تمدنی حالت، جامع مسجد، منارہ، حوض، شہر لو، قصر لو وغیرہ کا حال کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملتا۔

کیقباد، عیش و عشرت کا دلدادہ اور شاہد و شراب کا متوالا تھا۔ امیر خسرو نے اس کو مصور کرنے اور اس کے کردار کے ان پہلوؤں پر تبصرہ کرنے میں بڑی جرأت اور بے باکی کا ثبوت دیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

ترک طمع گیر ز خود دشمن دار	تا نشوی چون مگسان شرمسار
گر سر زانی کہ درین تنگنائے	باز رسی کی طلبی برد ہائے
عزہ بہ بر دیگی سلطان مشو	بلبل باغی مگس خوان مشو
ہست دے از حرم ہستی جہے	بالوجہ باشی کہ کمی رو لہے

اس کے بعد امیر خسرو نے ایک مختصر مثنوی "مفتاح الفتوح" لکھی۔ اس میں جلال الدین خلجی کی تخت نشینی اور ابتدائی مہمات کا حال درج ہے۔ یہ تفصیل کسی دوسری معاصر تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس مثنوی میں امیر خسرو کے لئے ایک مشکل مقام وہ آیا ہے جہاں ملک چھجو کو باغی کی حیثیت سے پیش کرنا پڑا ہے۔ ملک چھجو ان کے بالکل ابتدائی محسنوں میں تھا اور ایک زمانہ میں اس کے متعلق انہوں نے لکھا تھا ؎

صبح را گفتم کہ خورشید کجا است | آسمان بد تے ملک چھجو بود

لیکن اس مثنوی میں ایک باغی کی حیثیت سے اس کی مذمت کرنی پڑ رہی تھی۔ قدیم تعلقات نے اُن کا قلم روک لیا اور انہوں نے چھجو کو صرف "بد عہد" کہنے پر اکتفا کیا۔

"دولرانی خضر خاں" جو "عشیقہ" کے نام سے بھی مشہور ہے، اُن کی مثنویوں میں اس اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے اور اس کی بنیاد شاعرانہ تخیل سے زیادہ واقعات پر ہے۔ خضر خاں نے ایک دن امیر خسرو کو بلایا اور دولرانی سے اپنے عشق کی داستان جس میں لکھی ہوئی دے کر درخواست کی کہ اس کو نظم میں منتقل کر دیں۔ امیر خسرو نے اس کام کو بڑے خلوص اور مستعدی سے انجام دیا اور ۷۱۵ھ کو یہ مثنوی پوری ہو گئی۔ بعد کو جن دردناک حالات میں خضر خاں کا خاتمہ ہوا ان سے امیر خسرو کے جذبات میں ہیجان پیدا ہو گیا اور انہوں نے غیاث الدین تغلق کے زمانہ میں اس میں اضافہ کیا اور علاء الدین خلجی کی بیماری، ملک کافور کی احسان فراموشی اور خضر خاں کے قتل کی پوری داستان اس میں شامل کر دی۔ امیر خسرو کو خضر خاں سے خاص تعلق خاطر تھا۔ غالباً اس کی ایک وجہ اس کی حضرت محبوب الٰہی سے عقیدت بھی تھی۔ مثنوی کے شروع میں امیر خسرو نے نہایت جرأت اور دلیری کے ساتھ علاء الدین خلجی کو نصیحتیں کی ہیں اور ظلم کے نتائج اور شراب نوشی کی تباہی سے آگاہ کیا ہے۔ مثنوی میں ایک جگہ سلاطین دہلی کا فرداً فرداً ذکر کیا ہے۔ اور ہر ایک سلطان کے متعلق جو رائے دی ہے وہ اُس کی سیرت اور کارناموں کا بہترین خلاصہ ہے۔ رضیہ کے

متعلق لکھتے ہیں ؎

چناں میراند زور بادہ شیراں　　کہ حالی می‌شدند از دہ دلیراں

ناصر الدین محمود کے متعلق لکھتے ہیں ؎

خود او مسعود کار الٰہی　　ناصر بندگان درگاہ شاہی

علاء الدین خلجی کی فتوحات جن کے متعلق امیر خسرو نے "خزائن الفتوح" لکھی یہ نثر میں ان کی پہلی تصنیف تھی۔ لکھتے ہیں۔

"در درگوہر نظم زداں گوہر نمودہ بودم و انبار ہائی
لالی گرد آوردہ، خواستم کہ برائے سودہ والا
نثری بر بیارایم"

لیکن جیسا کہ پروفیسر محمد حبیب نے لکھا ہے نظم امیر خسرو کی مادری زبان تھی، نثر لکھنے میں ان کو تکلف کرنا پڑتا تھا۔ گو امیر خسرو نے صاحب "تاج المآثر" کا ذکر نہیں کیا لیکن انداز بیان میں اسی کا اتباع کیا ہے۔

"خزائن الفتوح" میں فتح دیوگیر سے لے کر "فتح ارنگل" تک کا ذکر ہے اور کتاب کا دو تہائی حصہ اسی سے متعلق ہے۔ لیکن اور بہت سے دلچسپ مباحث بھی اس میں آگئے ہیں، مثلاً اسلام کے رخ کا نقش، شراب نوشی کا انسداد، ابا حتوں کی سرائش، دارالعدل کا قیام، مسجدوں، حوضوں اور فصیلوں کی تعمیر، علاوہ ازیں منگولوں کے حملوں کی تفصیل اور فتح گجرات کا حال بھی اس میں درج ہے بعض مقامات پر اختصار سے کام لیا گیا ہے جس کا سبب غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین خلجی کے درباری مورخ کبیر الدین نے اپنے فتح نامہ میں جن مباحث پر تفصیلی گفتگو کی تھی اس کو دہرانا غیر ضروری تھا۔ قرون وسطیٰ کے فوجی نظام کے متعلق جو مواد اس تصنیف میں ملتا ہے وہ گراں قدر ہے۔ امیر خسرو سپاہی تھے، اس لئے فوجوں کی ترتیب، نقل و حرکت کی تفصیلات خوب خوبی سے بیان کرتے ہیں۔

مثنوی "نہ سپہر" مبارک شاہ خلجی کے حکم پر لکھی گئی تھی۔ سلطان کی تخت نشینی، دیوگیر کی مہم، تعمیر کی تکمیل، جامع مسجد کی تعمیر کے علاوہ دہلی سے متعلق ایک حصہ ہے جس میں دنیا کے مشہور شہروں سے دہلی کا مقابلہ کیا گیا ہے اور اس کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قدیم ہندوستان کے تہذیبی کارناموں کے ساتھ ساتھ یہاں کی آب و ہوا، پھل پھول، پرند چرند، مذاہب، رسوم اور زبانوں کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ ایک باب میں بادشاہ اور امراء کے لئے کچھ نصائح ہیں جن سے امیر خسرو کی سیاسی افکار و نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔

ایک شہزادہ کی سالگرہ پر شاہی محل میں جشن کی تفصیل ہے یہ ساری معلومات ہندوستانی کی تمدنی تاریخ کا نہایت اہم اور قابل قدر ذخیرہ ہے۔

ہر چند کہ سلطان مبارک خلجی کے تعلقات امیر خسرو کے شیخ حضرت محبوب الٰہیؒ سے اچھے نہ تھے اور بقول ضیاء الدین برنی وہ کھلے دربار میں ان کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہا کرتا تھا۔ امیر خسرو نے نہایت دلیری اور رہب کے ساتھ "نہ سپہر" میں اپنے مرشد کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

من ازوے لعاب دہاں یافتم
کہ زیں گونہ آب دہاں تافتم

"تغلق نامہ" میں امیر خسرو نے خلجیوں کی بربادی اور تغلق خاندان کی سریر آرائی کی پوری داستان بیان کی ہے۔ غازی ملک نے کس طرح خسرو خاں سے خاندان علائی کو بے دست و پا کر دینے کا بدلہ لیا اور کن نامساعد حالات میں علم بغاوت بلند کیا۔ اس کی تفصیل "تغلق نامہ" کے علاوہ اس عہد کی کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ امیر خسرو کی آخری تصنیف تھی۔ اس کے ساتھ تاریخی مثنویوں کا وہ سلسلہ ختم ہو گیا جس کی ابتدا "قران السعدین" سے ہوتی تھی۔ اگر امیر خسرو کی یہ تصانیف میسر نہ ہوتیں تو قرون وسطیٰ کی تاریخ اور تمدن کے کتنے گوشے تشنہ و معبر تذکرہ ملتے۔

بقیہ ۔ امیر خسرو کے عہد کا دہلی

ڈاک کا انتظام

ڈاک دو قسم کی ہوتی تھی۔ ایک گھوڑے کی دوسری پیادوں کی۔ گھوڑے کی ڈاک کو اولاق کہتے تھے مقررہ فاصلہ کے بعد گھوڑا بدلا جاتا تھا۔ لیکن سوار ڈاک لے کر سفر جاری رکھتا تھا گھوڑوں کا انتظام حکومت کی جانب سے زمینداران دیہی کے توسط سے ہوتا تھا۔ گھوڑا بدلنے اور تازہ دم گھوڑوں کو مہیا اور تیار رکھنے کی وجہ سے تیز رفتاری کو قائم رکھا جا سکتا تھا۔ پیدل ڈاک کا یہ انتظام تھا کہ ہر گاؤں کے باہر ہرکاروں کی چوکیاں ہوتی تھیں جن کو داوہ کہتے تھے۔ یہاں ہر جانب سی ہوتی تھیں اور ہرکارہ کر کے بیٹھے رہتے تھے جب شہر سے ڈاک چلتی تو ہرکارہ ایک ہاتھ میں ڈاک رکھتا اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھڑی دو گز لمبی ہوتی جس کے سرے پر گھنگرو بندھے ہوتے　　مقررہ فاصلہ پر دوسرا ہرکارہ گھنگرو کی آواز سن کر تیار ہو جاتا۔ اور جب ہرکارہ پہلی چوکی تک پہنچ جاتا تو اس سے ڈاک لے کر فوری روانہ ہو جاتا اس طرح ڈاک مسلسل حرکت میں رہتی۔ کبھی اس ڈاک کے ذریعہ دور دراز کے تازہ میوے اور کبھی کسی خاص مقام کا خاص کس پانی بھی بادشاہ کو پہنچایا جاتا خبریں بھی اسی ذریعہ سے بھیجی جاتی تھیں۔

بقیہ ۔ "امیر خسرو کی حب الوطنی"

مسلمان ہو یا ہندو، جو بھی خلوص سے دل سے اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ اپنے اس عمل میں حق بجانب ہے۔ ہر ایک پجاری اللہ کی عبادت محبت سے کرتا ہے محبت اسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے جس شخص کو پوری باطنی نظر حاصل ہے وہ ہر چیز میں اللہ کا جلوہ دیکھتا ہے چاہے وہ یہ عبادت کسی وسیلے سے ہی کیوں نہ کرتا ہو۔

عمیق حنفی

امیر خسرو اور عصرِ جدید

ہم نے سمجھنے سمجھانے کے کام کو آسان بنانے کے لئے بعض تصورات کی تخصیص و تحدید کے لئے اور تمیز و شناخت کے مدارج طے کرنے کے لئے چند مفروضات وضع کئے اور انہیں تعریف و تسمیہ کے احاطے میں گھیر لیا۔ انسانی معاشرے کی ستم ظریفیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان اپنی سہولیت اور ضرورت کے لئے اسما، صفات، اصطلاحات و تعریفات کی تخلیق کرتا رہا ہے اور پھر اپنی ہی مخلوق کا تابع ہوتا چلا جاتا ہے۔ پہلے تصورِ عصر ہی کو لے لیجئے۔ زمین کا اپنے محور پر گردش کرتے رہنا یا اپنے مدار پر سورج کے طواف کے مسلسل عمل پر قائم رہنا ایک مستقل آہنگ کا حامل مرور ہے۔ بے تکلف شب و روز کا تعداد، بہار و خزاں کا تبادل ایک جمی ہوئی گھڑی ہوتی، بندھے والی لے کا اثرہ بنا تا ہے جسے ہم عصر، زمان یا وقت کہتے ہیں۔ گھڑیاں، جنتریاں، تقویمیں، صدیاں اسی بنیادی لے کو تال میں بانٹ کر اس کی خالی بھری ماترائیں گنتی رہی ہیں۔ یہ انسانی بات ہے جس نے قصۂ جدید و قدیم کا طول اختیار کر لیا اور لاانتہا بحث کی بنیاد ڈال دی۔ اساطیر، داستانیں، تاریخ، سوانح، روزنامچے اسی بحث کے مختلف ابواب ہیں۔ انسانی تجربے کی اس ایک جہت نے دوسری تمام جہات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ کائنات کے نبض کی یہ لے جسے ہم عصر یا زمان یا وقت کہتے ہیں اس کے مرکزی تصور اور بنیادی لمحے سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے۔

دراصل زیرِ قلم مضمون دو طرفی ہے اور اس کے عنوان کے ترکیبی الفاظ نے مجھے اس پر آمادہ کیا کہ میں سوچ بچار کرنے کی ترغیب دی ہے عصر، دوران یا وقت تقدم و تاخر تسلسل، تواتر اور حقائق کے ترتیبی سانچے اور آہنگ کا نام ہے۔ زمان کا تصور مکان سے علیحدہ اور الگ ایک نقطۂ موہوم بن کر رہ جاتا ہے۔ کوئی عہد بالکلیہ ماضی بن جاتا ہے حال مستقل حرکت و رفتار خواہ اجسام کی ہو خواہ اذہان و افکار کی، فاصلے ہی کی طرح فصلِ زمانی کو بھی کم کرتی چلی جاتی ہے۔ قدامت میرے نزدیک محض تعطل کا نام ہے تو جدت حرکت و ارتقا کا۔ فاصلوں کو مکانی اکائیوں سے ناپنے کے بجائے اگر زمانی اکائیوں سے ناپ کر دیکھا جائے تو یہ تجربہ صرف دلچسپ ہی نہیں مفید بھی ہوگا۔ مثلاً دہلی سے بمبئی کتنے گھنٹے کا فاصلہ ہے؟ یا زمین سے چاند کتنے دنوں کی دوری پر ہے؟

عمرانی مظاہر، معاشی وسائل، سیاسی نظام اور تصورات جرم و سزا اور دوا ہے تاریخ کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے میں لیکن یہ اختصاص زمان و مکاں آدم تا امروز

کی داستان کے کلی تناظر میں محض تدریجی اور تطوری نوعیت رکھتے ہیں۔ خطوطِ طول و عرض نقشوں ہی پر نظر آتے ہیں، کائنات میں نہیں سیکنڈوں اور منٹوں اور گھنٹوں کے نشانات گھڑیوں پر ہی ملتے ہیں سورج کے ڈائل پر نہیں۔ زمان و مکاں کی مغائرت کا انحصار اس پر زیادہ ہے کہ محسوس کرنے والے کا احساس کس حد تک زمان و مکاں کے کسی خاص نقطے پر ساکت و جامد ہو گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ میر و میرزا کے اکثر و بیشتر اشعار ہمیں کسی مغائرت یا اجنبیت کا احساس نہیں دلاتے بلکہ ہمیں اپنے عہد کے محسوس ہوتے ہیں بعکس ناسخ یا داغ کے اکثر و بیشتر اشعار گھٹتے کھنڈروں کا احساس دلاتے ہیں۔ انسان اور اس کی معاشرت کی کلیت اور رنگا رنگی ارتقاء کی مادی وعقلی کائنات و شعور جن شعراء کو حاصل ہے انہیں میں کلی شاعر TOTAL POETS قرار دیتا ہوں اور ان کے باسی پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

امیر خسرو اور ہمارے درمیان ساڑھے چھ صدیاں حائل ہیں لیکن دراصل یہ فاصلہ اتنا ہے جتنا ہمارے اور الماری تک جانے یا کتب فروش کی دکان کے درمیان ہے۔ اور جب کلامِ خسرو کا سحرِ حلال مسامات جاں تک اتر جاتا ہے تو پھر نہ صرف یہ کہ اجنبیت یا مغائرت کی قدامت اس قلبی اور روحانی ارتباط میں حائل نہیں ہوتی جسے ہمارا استغراق، زمان و مکاں کے فاصلوں کو یک لخت طے کر کے پیدا کر لیتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم احساس کی سطح پر امیر خسرو کا قرب حاصل کریں، شعور کی سطح پر تاریخ اور معاشرت کے علمی اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے تعامل ادوار سے استفادہ کریں۔ امیر خسرو کی جامع الصفات شخصیت تاریخ ہند کے ایک ایسے دور میں طلوع ہوئی تھی جو کئی اعتبار سے عبوری نوعیت رکھتا تھا۔ ہند کی سیاست، عمرانیات، اقتصادیات، فکری اور ذہنی اعتقادات ایک نئی صورت اختیار کر رہی تھیں۔ تخت اور تختے کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ بھی رہا زندگی کا شمس تاج آ ہو رہا انتشار کے سمٹنے اور پھیلنے پر اس دور کی تاریخ کے ورق بدلتے تھے۔ عیش و عشرت کے ادوار خواب خرگوش کی طرح جب لمحۂ موسں کی گرفت میں آ جاتے تھے تو تباہی خاندان کے معصوم افراد کے حرفِ ناحق کا مسطر سامنے ہوتا تھا شمال مغربی سرحدوں سے قتل و غارت کے خوگر غول کے غول پنجاب اور دہلی کی طرف تباہی کی آندھی بن کر لپک رہے تھے مغل

کے جنگل میواتیوں نے لوٹ مار اور قتلِ عام کی ترغیب دے دے کر دہلی کی طرف آنکل سے تھے۔ سیاست میں مرکزیت اور لامرکزیت کی کشمکش نمایاں تھی۔ دہلی کا سلطان ترک کے زیادہ سے زیادہ حصوں کو اپنے زیرِ اقتدار کے سائے میں لانا چاہتا تھا اور علاقائی سردار، امیر اور راجگان آزادی اور خود مختاری کے ... خواہاں تھے۔ علمائے شریعت جاتے سلطنت کے مطیع و فرمانبردار تھے تو اولیائے طریقت عوام الناس کی اخلاقی، روحانی اور انسانی قدروں کے نقاب احتیاج کو اپنے ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ ملتان کے مسلمان سود خوری میں ہندو سود خوروں سے کم نہ تھے۔ اجناس کی قیمتوں کا گھٹنا بڑھنا، ساہوکاروں کے اشارۂ ابرو کا تابع تھا۔ ملاوٹ اور کم تولنے کا رواج بھی عام تھا۔ علاء الدین خلجی کی اصلاحات کا باعث یہی سب تھا۔ ملکِ "بالا" سے آنے والے ترک سرزمینِ ہند کی اجنبی آب و ہوا اور تہذیبی فضا میں اپنے آپ کو الگ تھلگ پاتے تھے۔ ان کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو اس سرزمین کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہو کر اپنے آپ کو گم کر دیں یا نعلی دھرتی کی ہواؤں میں لئے ہوئے اپنے شیرازی، سمرقندی، بخاری اور ماوراء النہری ہونے پر فخر کرتے رہیں اور اپنے محدود حلقے میں مدار رہیں۔ پھلنے پھولنے والے درختوں کی طرح اپنی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں اتار دیں یا بے برگ و ثمر آکاس بیل کی طرح سایہ دار درختوں کا خون چوسنے کے لئے ان کی پھنگیوں پر اپنے وجود کے جال پھیلا دیں۔

امیر خسرو نے ۱۲۵۳ء سے ۱۳۲۵ء تک کئی اتار چڑھاؤ دیکھے۔ ان کے حساس ذہن نے اپنے سامنے بدلتے ہوئے رنگ و آہنگ کا بہت قریب سے ادراک کیا اور ان تبدیلیوں کو صفحۂ تحریر میں لاکر آنے والی کئی پیڑھیوں کے لئے محفوظ کر دیا۔ ایک مورخ کی حیثیت سے امیر خسرو ہمہ زمانی اہمیت رکھتے ہیں۔ عہدِ بلبن سے لے کر عہدِ غیاث الدین تغلق تک کے بہت سے واقعات اور ان کے سن و سال کی معلومات کے واحد، مستند اور معتبر راوی امیر خسرو ہی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بعض بے لطف واقعات کے سلسلے میں وہ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک ایسی خاموشی جسے آج کے بعض مورخین مجرمانہ قرار دیتے ہیں۔ مثلاً جلال الدین خلجی کا قتل۔ نظامی خانقاہ اور سیری اور تغلق آباد کے درباروں میں بیک وقت یکساں سرفرازی اور دل نوازی کا حاصل کرنا بھی آج کے بعض مورخوں کے لئے ایک عقدۂ لاینحل ہے اور اس حقیقت کو وہ امیر خسرو کے حق میں نہیں سمجھے۔ امیر خسرو کے اطوار و احوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں "نا وابستگی" کے قائل تھے اور جسم و دامن کے رشتے کو قلب و روح کا رشتہ نہیں مانتے تھے۔ ملازمت کے باوجود ذہنی وابستگی اور فکری تلوث سے اوپر رہنا پسند کرتے تھے۔ یوں دیکھا جائے تو تیرہویں چودہویں صدی کے مورخین نقد و تبصرہ کے فرائض سے کم آشنا ہوتے تھے اور احوال واقعی کے اظہار کا انحصار ہی اپنے فرائضِ منصبی کا دار و مدار رکھتے تھے۔

امیر خسرو کا رویہ ایک محبِ وطن کا رویہ ہے۔ وہ اپنے ہندی ہونے پر فخر کرتے ہیں اور اپنے ہم عصر ترک دانشوروں کے برعکس ایک خوش گوار استثناء بن جاتے ہیں۔ وہ سرزمینِ ہند کے بارے میں صرف یہی نہیں کہتے کہ "ہست مرا مولد و ماوی و وطن" بلکہ یہ بھی کہتے ہیں ـــ

دیں ز رسول آمدہ کای زرہ دیں   حبِ وطن ہست ز ایماں یقیں

مثنوی "نہ سپہر" میں ملکِ ہند اور اہلِ ہند کی فضیلت و افضلیت کی مفصل بحث کرتے ہیں اور کھلے دل سے ہند کی برتری کے راگ الاپتے ہیں۔ اس مثنوی کے ایک پارہ اشعار میں وہ عجم پر ہند کی برتری کے دلائل پیش کرتے ہیں۔ ان کے اشیاء و اسباب، ناموس، اعتدالِ آب و ہوا، طائر و وحش یعنی طاؤس کا کمالِ رقص اور طاؤس و مار کا ایک ساتھ رہنا، ہندی پھولوں کی دلآویز رنگ اور خوشبو، اہلِ ہند کی دانشوری اور مسلمانانِ ہند کا راہِ حق پر ہونا، ان دلائل کے علاوہ امیر خسرو دس عقلی حجتیں بھی پیش کرتے ہیں ـــ

ترجیح اہلِ ہند بر اہلِ عجم ہم   در زیرکی و دانش و دہقانی ہوشیار الخ

ہندوستانی زبانوں بالخصوص سنسکرت کو امیر خسرو دری و عربی کے درمیان مقام فضیلت عطا کرتے ہیں۔ ہماری علمِ ریاضی و ہیئت، نجوم، وید مقدس وغیرہ کی تقدیس و تعریف سے امیر خسرو کا کلام پرہیز نہیں کرتا۔ امیر خسرو دوآبے کو "ہندوستان" کہتے ہیں اور سارے ملک کو یعنی برصغیر کو "ہند" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ "ہند" کے اس کلی تصور رکھنے کے سلسلے میں بھی انہیں داد ملنی چاہئے۔

امیر خسرو کے ذہنی اور فکری مسائل میں سے کئی ایک ہمارے مسائل سے مماثلت رکھتے ہیں۔ وہ اس برصغیر اور اس کی آب و ہوا اور تہذیبی فضا میں اپنی شخصیت کی جڑیں اتار رہے تھے اور ہم ان جڑوں کی تلاش کر رہے ہیں۔ یعنی امیر خسرو کے سامنے مکانی سطح پر جو سوال تھا وہی سوال زمانی سطح پر ہمارے سامنے ہے۔ دہلی، ملتان، اودھ، لکھنوتی، دیوگیری، وارنگل، دوارسمدر وغیرہ کی تہذیبی معاشرت انہیں بے حد پرکشش معلوم ہوتی ہے۔ ہند کے تیوہار اور شادیاں، تقریبات انہیں دلکش نظر آتی ہیں۔ محب ہنرمندی، فن کاری کے وہ مداح ہیں اور ہندی مصنوعات کی عظمت اور افادیت کے قائل۔ اس طرح امیر خسرو ہمیں ایک سیکولر اور متحد ہمہ رنگ ہندوستان کے وطنِ واحد کے تصور کی ابتدائی شکل دکھاتے ہیں، جو ان کے عہد کی اصلی اور تحفظات کی محدود فضا سے اوپر اٹھا ہوا ہے۔ ان کی شاعری کی فضا ایرانی تورانی سے زیادہ ہندوستانی ہے۔ ہندی الفاظ اور محاورے کا بے تکلف استعمال ان کی "دو دری" کو "سبکِ ہندی" کا بے مثال نمونہ بنا دیتا ہے۔

"اعجازِ خسروی" کے رسائل اور "غرۃ الکمال" کا دیباچہ امیر خسرو کی شعریات اور جمالیات سے ہمیں روشناس کراتا ہے۔ ان کے اسالیب کا مطالعہ آج بھی دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ "نثرِ رنگین" کا اسلوب تیرہویں چودہویں صدی میں بھی ناپسندیدہ تھا۔ طنز و مزاح میں ابتذال کو گوارا کیا جاتا تھا اور طنز و تمسخر میں طبع آزمائی کرنا امیر خسرو جیسے سربلند ادیبوں کے لئے بھی ہیٹی کی بات نہ تھی۔ "اعجازِ خسروی" کے رسائل میں ہمیں امیر خسرو کی ذات سے ملنے کا موقع ملتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امیر خسرو شاعری کی زبان و اسلوب کو حقیقی، ہماری

ساتھ ادبی راست رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اس زبان و اسلوب کو مرصّع و مسجّع
امیر خسرو کی شاعری میں تدبّر، تعقل اور تحقیق کے رویئے نمایاں ہیں اور جذبہ و
احساس کی معقول صورت زیادہ نظر آتی ہے۔ ان کی مثنویوں کا تانا بانا تاریخی
تجربات اور ماحول پر ہے اور ان کا تخیل حقیقت سے دامن کشاں نہیں ہوا۔

شاعری میں ہیئت و اسالیب کے تجربوں کے سلسلے میں بھی امیر خسرو کا
مطالعہ تہی دامن نہیں لوٹاتا۔ استعمالِ قوافی اور صنعت معنٰی کے علاوہ مثنوی
"نُہ سپہر" میں نو بحروں کا تجربہ قابلِ غور ہے۔ آپ کی مطلع الانوار اور [illegible]
نظموں کا سب نامہ سات صورتیں پہلے سے سر دیغ کیا جا سکتا ہے۔ ملوکیت اور
تصوف سے قریبی تعلق کے باوصف امیر خسرو کی شاعری کا مرکزی کردار انسان ہے
انسانی وجود کا احاطہ کرنے والے رنج و غم اور انبساط و مسرت کے لمحات ان کی شاعری
میں کثرت سے ملتے ہیں۔ مطرب اور مغنّی دونوں سے ایک وقت لطف اندوز
اور مستفید ہونے والی طبیعت امیر خسرو کو ملی ہے۔ "جدید" شاعر کی بہت سی مشکلات
امیر خسرو کو بھی درپیش تھیں، جن میں سے ایک بہت بڑی مہم یہ تھی کہ اس زمانے کے
سیاسی ESTABLISHMENT سے روزی اور جالقاہ سے تحرو حاصل کرکے
بھی اپنی انفرادیت اور ذات کی سالمیت کو کیسے قائم رکھا جائے۔ وہ ہر محفل
اور ہر منصب میں گھل مل کر جاتے ہیں۔ بالکل پانی کی طرح کہ جس میں مل جاتا ہے
ویسا ہی رنگ اختیار کر لیتا ہے لیکن اپنی روانی کو نہیں کھوتا۔

امیر خسرو کی ہشت پہلو اور جامع صفات شخصیت کے کئی پہلو ہر زمانے کے
لوگوں کے لئے دلچسپی، افادیت اور معنویت رکھتے ہیں۔ ایک ذہین اور حساس
انسان کی حیثیت سے جس نے اپنے عہد کے معروف تمام علوم کی آگاہی حاصل کی،
ایک مؤرخ جس نے منظوم پیرائے میں اپنے عہد کے واقعات و حالات اور مظاہر و
مناظر کو شاعرانہ حسن و خوبی کے ساتھ بیان کر دیا اور اپنے عہد کی سماجی، معاشی اور
معاشرتی حقیقتوں کو عمرانی نقطۂ نگاہ سے گرفت کرنے کی کوشش کی، اور ایک شاعر جس
نے فارسی کو "ہندیا" لیا اور ترک ہونے کے باوجود مقامی زبانوں اور اسالیب
کو اپنایا اور برتا۔ امیر خسرو کی موسیقی دانی پر تو کوئی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا
لیکن ان کا اس میں ذاتی دخل اور تجربہ کسی اندرونی یا ہم عصر شہادت کے بغیر مشکوک
ضرور ہے۔ اسی طرح ان کی ہندی شاعری کے نمونے بھی تا حال مستند و معتبر قرار
نہیں دئے جا سکے۔ عصرِ حاضر میں امیر خسرو کے متعلق عقیدتوں کے بنے ہوئے جالوں
سے گزر کر امیر خسرو کی ذات تک رسائی حاصل کرنا ہوگی۔ ان کے دواوین کے
دیباچے اور "اعجازِ خسروی" کے رسائل کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ نہ صرف سبک
ہندی کی فارسی بلکہ تیرھویں چودھویں صدی کی ہندوستانی لسانیات، معنویات
اور اسلوبیات کے تدریجی ارتقاء پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ مثلاً "غرۃ الکمال" کے
دیباچے میں عربی اور فارسی شاعری کا تقابلی مطالعہ تنقیدی شعور کا ثبوت دیتا ہے
اسی دیباچے میں شعر میں چار اشکال کا ذکر ملتا ہے۔ یابس، معتدل، رطب اور
محرن۔ یابس میں صنعت لفظی کا غلبہ ہوتا ہے جو نظم میں عیب اور نثر میں ہنر ہے۔ معتدل
وہ شکل ہے جس میں صنعت لفظی موجود تو رہتی ہے مگر سلاست نہیں کھوتی اور طراوت

بھی رکھتی ہے۔ رطب میں سلاست و صفائی غالب رہتی ہے اور رعایتِ لفظی
بہ تکلف نہیں برتی جاتی، ان میں رعایت بے ارادہ طریقے سے آجائے تو آجائے ورنہ
یہ شکل ایسی ہے کہ آگ کی طرح مئے دل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ نہ وہ
روحانی شراب ہے جو کاسۂ سر شاعر میں کھینچی جاتی ہے اور نہ جدائی لذت رکھتی ہے
اسی دیباچے میں شاعری کی پانچ قسمیں بتائی گئی ہیں۔ فاضلانہ، حکیمانہ، نیکو
طبعانہ، عاشقانہ اور شاعرانہ۔ فاضلانہ وہ ہے جس میں صنعت لفظی کا بھی کھل
کر استعمال کیا گیا ہو اور فارسی میں عربی کی (غیر مانوس و غیر متناسب) آمیزش
کی گئی ہو۔ حکیمانہ یعنی وہ جسے سنائی، ناصر خسرو وغیرہ نے برتا اور اسد کیا
"دردِ تنگ سودش از من رہا جوش رند" نیکو طبعانہ طرز کی شاعری غزلوں میں
سب ملتی ہے یہ اچھا اسپ کہ بیچے گرہ یا بعض غزلہا ی تر بد آید و سعی سایارد و
ازاں تو اندگر شتت۔ عاشقانہ وہ جس میں زلف، عتاب، سوزش و شورش
ہو۔ شاعرانہ وہ جس میں جملہ طرزوں کا معتدلانہ امتزاج پایا جاتا ہو۔
ناشی جو تعلیم سے بے بہرہ   شاعر ناشی ولی نہ استاد
کیا ہی مقام ظاہر و درمیں نہیں کیا گیا؟ کیا ہمارے دور میں جدید شعراء و ناقدین اسی
بنیادی تعارف کو لے کر اپنی شعریات کی عمارت نہیں اٹھا رہے ہیں۔؟

خسرو اپنی حقیقت پسندی کے باعث ہمارے اور قریب آجاتے ہیں
اپنی مثنویوں میں وہ جس واقعات نگاری، منظرکشی اور خاکہ نگاری کی مثالیں
پیش کرتے ہیں اس کی وجہ سے وہ اپنے عہد کے تجزیے کے علمی اور معروضی مگر
حساس شاہد بن جاتے ہیں۔ یہ وہی رویہ ہے جسے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے
شاعری کے لئے تجویز کیا کہ شاعر کی شخصیت اس کے شعری اور تخلیقی تجربے میں ملوث
نہ ہو بلکہ محض CATALYTIC AGENT کی حیثیت رکھے۔

"اعجاز خسروی" میں اسالیب کا ذکر آج کے معلّمین اور ادیبوں کے لئے بہت
اہم ثابت ہو سکتا ہے۔ علمائے محقق کا اسلوب، داستان نگاروں کا اسلوب
فضلا کا اسلوب، خطیبوں کا اسلوب، مدرسوں کا اسلوب، عوام کا اسلوب، اہل
حرفہ (کارگزاروں) کا اسلوب، مزاح نگاروں، مسخروں اور نقالوں کا
اسلوب۔ ان تمام اسالیب میں قابل مذمت ٹھہرا ہے۔ مدرسوں کا اسلوب
اور آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ شاعری میں بھی خسرو "استادی" کے قائل نہیں۔
ان گزارشات سے مقصود یہ ہے کہ آپ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کریں کہ امیر خسرو
محض شاعر یا وقائع نویس نہیں ہیں بلکہ باشعور اور صاحبِ علم متکلم جمالیات
و شعریات بھی ہیں۔

امیر خسرو کی شخصیت کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ جس تالاب میں
بھی رہے کنول کی طرح رہے۔ بیشتر مقامات پر انہوں نے آنکھیں اور کان کھلے رکھے
مگر زبان و لب کو جنبش نہ دی۔ وہ معروضی حقیقت کا مثالی کردار ہیں۔ ان کی تحریر
میں روشن ترین عبارتیں وہ ہیں جن میں ان کی اپنی دھرتی کا حسن، رنگ، دلاویز
سایہ و نور موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا تعلق غالب اور فاتح طبقے سے تھا۔ لیکن
ان کا شعری اور فکری رویہ کسی احساس برتری اور عصبیت کی مد نہیں رکھتا

حسن الدین احمد

خسرویات

جب کسی ادیب یا شاعر کے فن، فکری جہات اور اس کی قائم کی ہوئی راہوں اور روایات پر مختلف انداز سے اور مختلف پہلوؤں سے لکھا جاتا ہے اور بحثیں کی جاتی ہیں تب یہ سب ذخیرہ ایک باضابطہ علم کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ ہمارے ملک میں قریبی زمانہ میں دو عظیم شاعروں غالب اور اقبال کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا۔ ان تمام تحریرات کو علی الترتیب "غالبیات" اور "اقبالیات" کا نام دیا جاتا ہے۔ "غالبیات" میں غالب کے کلام پر تبصروں اور تنقیدی تحقیقوں کے علاوہ غالب نے اپنی شاعری میں جو روایات قائم کیں، عام روش کے خلاف جو بغاوت کی اور حیات و کائنات کا جو مخصوص تصور پیش کیا ان سب کو شامل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح "اقبالیات" میں اقبال کے کلام پر تنقیدوں اور ان کے فلسفہ اور پیام کی تشریحات و توضیحات کو شریک کیا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے "خسرویات" حضرت امیر خسرو دہلوی کی عظیم شاعرانہ صلاحیتوں، ان کی جامع الکمال زندگی سے ان کے گوناگوں تجربوں اور ان کی فکر و نظر کی وسعت سے متعلق ساری بحثوں کے مجموعہ کو سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب ہم اس افسوسناک حقیقت پر نظر کرتے ہیں کہ عوام میں اس بلند پایہ شخصیت کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود ادبی اور علمی حیثیت سے اس بارے میں گزشتہ سات سو سال کے عرصہ میں بہت ہی کم لکھا گیا ہے تو نہ صرف حسرت ہوتی ہے بلکہ ایک بڑی کمی کا احساس ہوتا ہے۔

لیکن وقت نے حضرت امیر خسرو کے نام کے مقابلہ میں ہار مان لی ہے۔ امتداد زمانہ سے ان کے کلام کا بڑا حصہ ضائع تو ہوا لیکن ان کا مجموعی تاثر اور عنصر آج بھی اہل ادب کے لئے شمع ہدایت ہے اور سات سو سال کے بعد پہلی دفعہ ان کی یاد منظم طور پر عالمگیر پیمانہ پر منائی جا رہی ہے۔ ایک سے زیادہ ملکوں کی جانب سے ان کی خدمت میں خراج ہائے عقیدت پیش کئے جا رہے ہیں۔

اب وقت آگیا ہے کہ "خسرویات" کو ایک سوچے ہوئے منصوبہ کے تحت اور علم کی حیثیت سے ترقی دی جائے اور اس کی افادیت کو پوری طرح واضح کیا جائے۔

آج "خسرویات" کی اس لئے ضرورت ہے کہ آج سے پہلے اس طرف کم دھیان دیا گیا۔ "خسرویات" کی اس لئے ضرورت ہے کہ آج دنیا کو زیست کی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے خسرو کا خاص کر پیام یاد کرنا ہے وہ پیام جو انسان دوستی، [illegible] اور محبت و اخوت کا پیام ہے۔ آج بھی خسرو کی اختیار کی ہوئی راہیں دانشوروں کے لئے مشعل راہ بن سکتی ہیں۔ "خسرویات" کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ ان کی تصانیف میں علم و دانش اور ادبی شاہکاروں کا ایک عظیم خزانہ محققین و جستجو کی نظروں سے بڑی حد تک اوجھل رہا ہے۔ اس بارے میں اختلافی امور کی حد تک باقاعدہ جانچ پڑتال کی ضرورت ہے تاکہ بحث و مباحثہ کے بعد کسی معقول نتیجہ کو سامنے لایا جا سکے۔

ہندوستان کی ثقافتی تاریخ میں نواب عماد الملک (۱۸۴۴ء تا ۱۹۲۵ء) کے دور کو علمی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے زریں دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کا شمار حیدرآباد کی ایسی شخصیتوں میں کیا جا سکتا ہے جن کی بلند پایہ علمی خدمات اور تعلیمی کارناموں پر دکن ہی نہیں سارا ہندوستان بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ اگر اس دور میں دائرۃ المعارف کا قیام عمل میں آیا (۱۸۸۸ء) جس کی جانب سے سیکڑوں عربی اور فارسی مخطوطات کی اشاعت عمل میں آئی۔ کتب خانہ آصفیہ قائم کیا گیا جہاں ملک بھر میں اسے مشرقی کا اہم اور بیش قیمت ذخیرہ ہے، جامعہ عثمانیہ کی بنیاد رکھی گئی جہاں اسی نوعیت کا ایک انوکھا منفرد اور تاریخی تجربہ کیا گیا تو اس کے ساتھ ساتھ نواب عماد الملک کی دور رس نگاہوں نے آج سے ٹھیک ۶۲ سال قبل ہی خسرویات کی ضرورت اور اہمیت کو حیدرآباد میں محسوس فرمایا اور مئی ۱۹۱۴ء میں علی گڑھ سے متعلق نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے فرزند نواب اسحاق خاں صاحب سے (جب کہ وہ نواب وقار الملک کے بعد علی گڑھ کے آنریری سکریٹری تھے) جو مراسلت ہوئی تھی اس میں ارشاد فرمایا کہ ۔

"بہ ہمہ وثوق کے ساتھ بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ہندوستان میں کوئی مصنف ایسا نہیں گزرا جس کی تصنیفات اس درجہ لائق حفاظت و اشاعت ہوں جیسا کہ امیر خسرو۔ لہذا اگر آپ کی کوشش سے مشہور زمانہ عدیم النظیر مصنف کا پورا کلام نظم، نثر جو جملہ اصناف سخن میں زبان فارسی، ہندی اور عربی میں موجود ہو یا بیان کیا جاتا ہے جمع ہو کر چھپ گیا تو یہ قوم کی ایک بڑی عظیم الشان خدمت ہوگی جس کا نفع غیر محدود ہوگا، جو سعی کرنے والوں کے نام کو بھی زندہ جاوید بنا دے گی اور مجھے یقین ہے کہ یورپ میں خسرویات کے ساتھ امیر خسرو کی بہت مانگ ہوگی اور تمام نسخے ہاتھوں ہاتھ ٹھکانے لگ جائیں گے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

وہ میں دولت مند نہیں ہوں۔ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں اس کام کے لئے اس کو وقف کر دیتا۔ بایں ہمہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اس کام میں مالی مدد دوں گا اور اپنے احباب سے بھی کچھ رقم وصول کر کے بھیجوں گا کام شروع کرنے کے لئے فوراً ایک ہزار روپیہ اس وقت دیتا ہوں اور بوقت ضرورت ایک ہزار اور دوں گا۔

اس کے بعد نواب اسحاق خاں صاحب بالکل آمادہ ہو گئے۔ نواب عماد الملک نے دو ہزار روپے، سرکار عالی سے ساڑھے سات ہزار، نواب سر سالار جنگ سے ایک ہزار، مولوی انوار اللہ خاں صاحب (فضیلت جنگ) سے پانچ سو کل گیارہ ہزار جمع کر کے بھیجے۔

اس تحریک کو حقیقی معنوں میں خسرویات کی بنیاد کہا جا سکتا ہے اس تحریک اور بروقت مالی امداد پر نواب اسحاق خاں صاحب نے اس دشوار کام کی ذمہ داری قبول کر لی اور ۲۳ ستمبر ۱۹۱۱ء کو اپنی رپورٹ پیش فرما دی۔ اسی رپورٹ کے نتیجے کے طور پر ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۷ء کے درمیان علی گڑھ سے امیر خسرو کی حسب ذیل کتابوں کی اشاعت کا کام ہوا۔

نام تصنیف	نام مرتب	سال اشاعت
۱۔ آئینہ سکندری	سید احمد فاروقی	۱۹۱۷ء
۲۔ دول رانی خضر خاں	رشید احمد سالم	۱۹۱۷ء
۳۔ مجنوں لیلیٰ	حبیب الرحمٰن شیروانی	۱۹۱۷ء
۴۔ ہشت بہشت	سلیمان اشرف	۱۹۱۸ء
۵۔ قران السعدین	ایم۔ اسماعیل	۱۹۱۸ء
۶۔ جواہر خسروی	ایم امین چریا کوٹی	۱۹۱۸ء
۷۔ دیوان وسط الحیات	فضل احمد حافظ	۱۹۲ء
۸۔ مطلع الانوار	مقتدیٰ خاں شیروانی	۱۹۲۶ء
۹۔ شیریں خسرو	علی احمد اسیر	۱۹۲۷ء

اس طرح ۱۹۱۴ء میں نہ صرف شعوری طور پر خسرویات کی بنیاد رکھی گئی بلکہ امیر خسرو کی تمام تصانیف کو حاصل کرنے اور طباعت کے ذریعہ محفوظ کرنے کا مبارک اور مستحسن اقدام کیا گیا۔

امیر خسرو کا ذکر مورخوں نے کیا ہے جو امیر خسرو کے ہم عصر تھے۔ جامی نے ان کی تصانیف کی تعداد ۹۲ ظاہر کی ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ امیر خسرو نے اپنی تصانیف کی حفاظت کا کافی اہتمام کیا تھا۔ وہ ان خوش قسمت انسانوں میں سے تھے جن کا شہرہ ان کی زندگی ہی میں دور دور تک پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتابوں کے نسخے کتابت کروا کر تقسیم کئے تھے جن کی مانگ بڑھتی گئی۔ اور نقلیں دور دور تک پھیل گئیں۔ خود حافظ شیرازی نے ان کی بعض تصانیف کو اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ تاشقند کے علوم مشرقیہ کے انسٹی ٹیوٹ موسوم بہ البیرونی میں حافظ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی تین مثنویاں شیریں خسرو، ہشت بہشت اور آئینہ سکندری موجود ہیں۔ پھر بھی سات سو سال کا عرصہ کافی طویل ہوتا ہے۔ کتابت کے ذریعہ محدود تعداد ہی میں اشاعت ہو سکتی ہے انقلابات زمانہ کے باعث اور خصوصاً مغلیہ

سلطنت کے زوال کے بعد کتابوں کا پتہ نہ ملا کہ کہاں کہاں ہیں اور تمام کتابیں ہیں بھی یا نہیں مشکل مسئلہ ہو گیا فارسی دانی میں کمی کی وجہ سے یہ مشکل بڑھ گئی۔ بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں اگر ان تمام معلومات کو اکٹھا کرنے کی قابل قدر کوشش نہ کی جاتی اور تصانیف کا احاطہ کرنے کا مستحسن اقدام نہ کیا جاتا تو آج خسرویات پر کام کرنا مشکل بلکہ قریب ناممکن ہو جاتا۔

۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۷ء کے درمیان مختصر سی مدت میں خسرویات پر جو بنیادی کام ہوا وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ اس کام سے جو لوگ وابستہ رہے وہ بلند پایہ عالم تھے اور انھوں نے نہایت محنت سے اپنے اس کام کو انجام دیا۔ نہ اتنا بڑا کام ۱۹۱۴ء سے پہلے کبھی ہوا نہ ۱۹۲۷ء سے آج تک ہوا۔ البتہ ۱۹۱۴ء سے قبل کے سناٹے کے مقابلہ میں ۱۹۲۷ء کے بعد وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ کام ہوتے رہے چنانچہ جہاں تک امیر خسرو کی تصانیف کا تعلق ہے حسب ذیل کتابیں شائع ہوئیں۔

نام تصنیف	نام مرتب	مقام و سال اشاعت	
۱۔ تغلق نامہ	ہاشمی فرید آبادی	حیدرآباد	۱۹۳۳ء
۲۔ نہ سپہر	ڈاکٹر وحید مرزا	کلکتہ	۱۹۴۸ء
۳۔ خزائن الفتوح	〃	〃	۱۹۵۳ء
۴۔ لیلیٰ مجنوں	طاہر احمد محرماف	ماسکو	۱۹۶۵ء
۵۔ ہشت بہشت	ط انصاری عصمر علیف	〃	۱۹۷۲ء

ان کے علاوہ حسب ذیل کتب بعد تصحیح و مقابلہ تیار رکھی ہیں اور اشاعت کے لئے تیار ہیں۔

نام تصنیف	نام مرتب	مقام
۱۔ بقیہ نقیہ	سید مسال شاہ القادری	کلکتہ
۲۔ تحفۃ الصغر	〃	〃
۳۔ غرۃ الکمال	ڈاکٹر غلام دستگیر رشید	حیدرآباد
۴۔ اعجاز خسروی	سنٹر آف ایشین اسٹڈیز	علی گڑھ

ان ہسٹری

حضرت امیر خسرو پر جو قابل لحاظ کام ہوتے ہیں ان میں ڈاکٹر اسپرنگر کے مقالہ کو شامل کیا جا سکتا ہے جو جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں بھی خسرو کے کلام کا ذکر دلکش انداز میں کیا ہے۔ منشی سید احمد مارہروی کی حیات خسرو (۱۹۰۹ء) خاص اہمیت کی حامل ہے۔ مولانا شبلی کی حیات خسرو بھی بیش بہا معلومات کتاب ہے۔ پروفیسر محمد حبیب کا انگریزی مقالہ بھی علمی انداز کا حامل اور قابل قدر کام ہے۔ ۱۹۳۴ء میں ڈاکٹر وحید مرزا نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے اپنا مقالہ امیر خسرو زندگی اور کام لکھنؤ سے شائع کیا۔ یہ نہایت جامع کتاب ہے ڈاکٹر وحید مرزا کا کام خسرویات میں اپنا خاص مقام رکھتا ہے۔ اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا جانے کا مستحق ہے۔ محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو میں اور حفظ اللسان معروف بہ خالق باری میں خالق باری کو ضیاء الدین خسرو کی تصنیف قرار دے کر خسرویات میں اہم بحث چھیڑ دی ہے۔ علی عباس حسینی صاحب نے امیر خسرو کا علمی ڈھنگ کی ایک کہانی لکھی

ہے۔ ڈاکٹر صفدر آہ کی کتاب امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر میں اہم مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔ علام سامانی نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے جس کو پٹیالہ یونیورسٹی نے شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پر از معلومات ہے۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری اور ڈاکٹر صباحت علی سندیلوی ایک مفید کام ہے۔ ادارہ تعلیم ترقی مکتبہ جامعہ سے ایک مختصر رسالہ امیر خسرو کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے شائع ہوا ہے۔ ہندوستان ایجوکیشنل پی نظر میں صباح الدین عبدالرحمن صاحب کا علمی مقالہ ہے جس میں بڑی محنت سے بیش بہا مواد جمع کیا گیا ہے اور امیر خسرو کے کلام کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ اسی موضوع پر ڈاکٹر تاراچند کا ایک مضمون کتابچہ کی شکل میں امیر خسرو اکیڈمی سے شائع ہوا ہے "انڈو ایرانیکا" کے امیر خسرو نمبر (۱۹۷۱ء) میں امیر خسرو پر آٹھ نہایت پر از معلومات مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف رسالوں میں علمی اور تحقیقاتی مضامین شائع ہوتے ہیں ضرورت ہے کہ ان کی تفصیلی فہرست شائع کی جائے۔

روس میں بھی خسرویات پر کام ہوا ہے۔ خمسہ کی پانچوں مثنویوں کی ایڈیٹنگ کا کام ہوا ہے جس سے ہندوستان کے اسکالر ڈاکٹر ظ۔ انصاری بحیثیت ایڈیٹر وابستہ رہے ہیں۔ ایران سے انتخاب کلام امیر خسرو نہایت آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔

یہ سب کوششیں جو اس وقت تک ہوئی ہیں اس ضرورت کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں جو خسرویات کے متعلق سے محسوس کی جاتی ہے۔

خسرویات کے سلسلہ میں جو کام ہونے ضروری ہیں ان میں امیر خسرو کی ان کتابوں کی اشاعت کو ترجیح دی جانی چاہیے جو اس وقت شائع نہیں ہوتی ہیں ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور سب کی ایڈیٹنگ ہو چکی ہے یعنی بقیہ غرۃ الکمال تحفۃ الصغر اور اعجاز خسروی۔ یہ کام قومی کمیٹی کے پیش نظر ہے۔

اس کے علاوہ جو کتابیں قبل ازیں شائع ہو چکی ہیں لیکن دستیاب نہیں ہوتیں ان کی مکرر اشاعت کی ضرورت ہے اس پراجکٹ کو بھی قومی کمیٹی نے منظور کیا ہے۔

جو کتابیں امیر خسرو کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں ان میں سے بعض ان کی نہیں ہیں مثلاً ڈاکٹر وحید مرزا نے یہ دلائل ثابت کیا ہے کہ چہار درویش انشائے خسروی، جہاندانا امیر خسرو مشتمل بہ داستان، ساہنامہ امیر خسرو کی تصانیف نہیں ہیں۔ اسی طرح خسرو کے ہندی کلام پر شک کیا جاتا ہے۔ مخطوطات کی عدم موجودگی میں یہ قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا کہ جو ہندی کلام امیر خسرو سے موسوم ہے اس میں کتنا کلام ان کا ہے اور کتنا الحاقی۔ اس سلسلے میں اندرونی شواہد سے مدد لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب امیر خسرو نے ہندی میں بھی شاعری کی ہے۔ اور صراحت سے اس کا ذکر کیا ہے تو پھر ان کا ہندی کلام کیوں ضائع ہوا اور مخطوطات کی شکل میں کیوں ہم تک نہیں پہنچا خسرویات کے سلسلے میں ان تمام سوالات کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور اس بات کا تعین بھی ضروری ہے کہ کونسی کتابیں امیر خسرو کی ہیں اور کون سی نہیں۔

قوال ستار وغیرہ کو بھی عام طور پر امیر خسرو کی ایجاد و اختراع خیال کیا جاتا ہے اس سلسلہ میں بھی قطعی شواہد کی عدم موجودگی میں بعض گوشوں سے اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں رسالہ نقوش لاہور اکتوبر، نومبر ۱۹۶۴ء میں رشید ملک نے ایک دلچسپ اور پر از معلومات مقالہ موسیقی اور امیر خسرو لکھا ہے۔ اور طویل بحث کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قوالی اور ستار امیر خسرو سے پہلے کی چیزیں ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس سلسلے میں تحقیق کر کے ان اختلافی مباحث کا حل تلاش کیا جائے۔

امیر خسرو کے کلام میں بعض الفاظ اصطلاحات۔ برائے استعارے ہندوستانی ملبوسات لباس۔ سامان آرائش کے نام استعمال ہوتے ہیں جو امیر خسرو کے زمانہ میں مستعمل تھے۔ یہ یا تو متروک ہو گئے ہیں یا ان کا تلفظ اور معنی بدل گئے ہیں ایسی فرہنگ کی ضرورت ہے جو ان تمام الفاظ پر حاوی ہو۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری۔ فرہنگ تیار کر رہے ہیں۔ ان تشریحات کی مدد سے معلمہ بدرجہ پہلے تک کی فارسی ادبیات کی مشکلات حل کی جا سکیں گی۔

حضرت امیر خسرو نے چونکہ بادشاہوں کے دربار میں رہ کر شاعری کی اس لئے ان کی شاعری میں اکثر و بیشتر وقائع نگاری بھی ملتی ہے۔ بقول مولانا شبلی قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائف نظم کی ما سدین کے ساتھ تاریخی حیثیت تمام ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ اس طرح کہ کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھ کر ان باتوں کو نہ لکھتا یہی حال دول رانی، خضر خاں، خزائن الفتوح (مفتاح الفتوح) کا بھی ہے۔ دنیا کے کسی اور ادب میں یہ خصوصیت شاذ ہی ملے گی کہ شاعری تاریخ کا اتنا اہم ماخذ قرار پاتے۔

اس سلسلے میں ان کے کلام کا ایسا استفادہ نہیں کیا گیا جیسا کہ اس کا حق تھا اس ضرورت ہے کہ ان کے کلام کا خاطر خواہ ترجمہ اور علمی تجزیہ کیا جائے اور اس مواد پر تحقیقی نظر ڈالی جائے ایسا کرنے سے تاریخ ہند کے نئے گوشے سامنے آنے کا امکان ہے۔

امیر خسرو بنیادی طور پر ہندوستانی ہیں لیکن ان کا کلام وسیع خطہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو ایک سے زیادہ ملکوں پر مشتمل ہے۔ ان روس کے علاقوں، افغانستان اور ایران میں مقبولیت حاصل ہے۔ اس لئے خسرویات کی صرف قومی نہیں بین الاقوامی اہمیت بھی ہے۔ اور اس کو اہم عنصر کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے

خسرویات کے ذریعہ ہم ایک بڑے خطہ کے طرز عمل کو تشکیل دے سکتے ہیں اور خسرو کے پیام کو عام کر سکتے ہیں اور اس سے دنیا کی بھلائی کے لئے بہتر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔

نثار احمد فاروقی

حضرت امیر خسرو کی تصانیف کا جائزہ ۲



حضرت امیر خسرو کی قلمی تصانیف اب تک معلوم ہو سکی ہیں اُن کی تعداد (۱۸) ہے
ں کے فارسی کلام کا مجموعہ باعتبار ترتیب زمانی پانچ حصوں میں ہے لہ

۱۔ تحفۃ الصغر (۶۶۹ھ) جس میں (۱۹) برس کی عمر تک کہا ہوا کلام شامل ہے
۲۔ وسط الحیات (۶۸۲ھ) اس میں ۳۲ سال کی عمر تک کی شعری تخلیقات ہیں
۳۔ غرۃ الکمال (۶۹۲ھ) اس میں ۴۲ سال کی عمر تک کہا ہوا کلام ہے اس کے
یل دیباچے سے امیر خسرو کی سوانح حیات کے کچھ اشارے بھی ملتے ہیں۔
۴۔ بقیہ نقیہ۔ (۷۱۴ھ)
۵۔ نہایت الکمال (۷۲۵ھ)

ان کے علاوہ امیر خسرو کی ۹ مثنویاں ملتی ہیں جو سب چھپ چکی ہیں۔

۱۔ قران السعدین (۶۸۸ھ) گہ
۲۔ پنج گنج (در جواب خمسۂ نظامی) اس میں یہ پانچ مثنویاں ہیں۔
(۱) مطلع الانوار (۲) شیریں خسرو (۳) لیلیٰ مجنوں (۴) آئینہ سکندری
(۵) ہشت بہشت
۳۔ نہ سپہر (۷۱۸ھ) یہ قطب الدین مبارک شاہ کی فرمائش پر لکھی گئی۔ وحید مرزا
نے اسے ایڈٹ کرکے چھاپ دیا ہے سہ
۴۔ دول رانی خضر خاں (۷۲۵ھ) اس کا نام عشقیہ یا عشقہ۔ آغاز عشق
اور سوز شاہی بھی ہے۔
۵۔ تغلق نامہ۔ (۷۲۵ھ)

فارسی نثر میں ان سے چار کتابیں منسوب ہیں۔

(۱) خزائن الفتوح یہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سلسلہ تاریخ سے چھپ چکی ہے اسے
ڈاکٹر سید معین الحق نے ایڈٹ کیا تھا اور پروفیسر محمد حبیب نے مقدمہ لکھا تھا۔
(۲) اعجاز خسروی۔ اس کا دوسرا نام رسائل الاعجاز بھی ہے اور بعض کتب
خانوں کی فہرست میں مکتوبات امیر خسرو کے نام سے درج ہوئی ہے۔
۳۔ افضل الفوائد۔ ایک ہی کتاب کے دو حصے ہیں۔ دونوں چھپ چکے ہیں۔

لہ ڈاکٹر وحید مرزا کی کتاب میں تصانیف امیر خسرو کا تفصیلی جائزہ موجود ہے انھوں نے تصانیف کی ایک طویل فہرست تیار کی ہے۔ لیکن ہم۔ یہاں صرف (۱۸) کتابوں کے نام درج کر رہے ہیں تفصیلی بحث
وہ مضمون کے دائرے سے خارج ہے اسی طرح وحید مرزا نے امیر خسرو کی تصانیف کی ترتیب کا جو راستہ متعین کیا ہے اس سے متعدد مواقع پر راقم الحروف کو اختلاف ہے اس سلسلہ کی بحث کسی دوسرے مضمون
باستثنا ہوگی

گہ قران السعدین میں کیقباد اور اس کے باپ بغرا خاں کی ملاقات کا حال ہے تاریخی پس منظر میں اس کی شرح مولوی عبدالحق حقانی دہلوی (مفسر قرآن) متوفی ۱۳۴۲ھ کے فرزند مولوی
الحق دہلوی متوفی ۱۲۲۲ھ نے نور العینین فی شرح قران السعدین کے نام سے کی تھی اس کا اصل کہ امیر خسرو کے کسی معنف نے تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ انڈیا آفس لندن میں ہے
دوسرا نسخہ ۱۴۰۰ھ کا لکھا ہوا ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری میں ملتا ہے۔ تیسرا نسخہ ۱۲۰۰ھ کا لکھا ہوا آستانہ مشرقیہ پٹنہ میں اور چوتھا انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے کتب خانے میں ہے۔

PUBLISHED FOR THE ISLAMIC RESEARCH ASSOCIATOIN BY GEOFFREY CUMBERLEGE, OXFORD UNIVERSITY PRESS 1950

سہ اس کا ایک بہت نفیس اور خوشخط قلمی نسخہ ہندوستان کے کتب خانے میں رہ چکا ہے نیشنل میوزیم نئی دہلی میں محفوظ ہے اسے ۱۰۰۹ھ میں
درس میر علام نے لکھا تھا۔ دیکھئے (NO L 53 2/7)

شہ امیر خسرو کی تصانیف میں سب سے کمیاب یہی ہے اب تک اس کا صرف ایک نسخہ ملا ہے جو کہ حافظ حبیب گنج (علی گڑھ) میں ہے پروفیسر محمد حبیب کا خیال ہے کہ اسے معلوں کے زمانہ میں قصداً
ضائع کیا گیا ہوگا۔ فرشتہ نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے کمیاب ہونے کی شکایت کی ہے اب حیدرآباد دکن سے چھپ چکا ہے (۱۹۳۳ء)

۴۔ راحت المحبین: اس کے نسخے بھی مل جاتے ہیں۔ راحت المحبین کے قلمی نسخے کم ملتے ہیں۔ افضل الفوائد کے قلمی نسخے پٹنہ، اعظم گڑھ، ٹونک، شبلی سدوم اور علی گڑھ میں موجود ہیں۔ اس مضمون میں انہیں دونوں کتابوں کا تحلیلی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

ان کے علاوہ ایک مسمر قات کا مجموعہ لالی معانی معروف به جواهر خسروی کے نام سے چھپا تھا (۱۹۱۸ء) جس میں ان کا ہندی کلام اور لطائف، مکتی، وصالق، ماری وغیرہ شامل ہیں مگر ان سب کا اسناد مشتبہ ہے۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم نے حالق باری کا تفصیلی مطالعہ کر کے ثابت کیا ہے کہ عہد جہانگیری کے ایک شاعر ضیاء الدین خسرو شاہ کی تصنیف ہے۔ امیر خسرو سے منسوب ہندی کلام اور پہیلیوں وغیرہ کی بھی کوئی قدیم سند نہیں ملی۔ اس کے علاوہ بعض اور کتابوں کا انتساب بھی امیر خسرو سے ہوا ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ قصہ چہار درویش فارسی ان کی تصنیف ہے۔[۷] اور کہا کہ انہوں نے اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی علالت کے زمانے میں یہ داستان انہیں سنائی تھی ہم نے یہاں مشکوک یا غیر مستند تصانیف کو شامل نہیں کیا ہے۔

(۲)

سر دست ہمیں صرف آخری دو کتابوں کا جائزہ لینا ہے کہا جاتا ہے کہ حضرت امیر خسرو نے اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء (وصال ۲۵، ھ/۱۳۲۵ء) کے ملفوظات دو جلدوں میں فراہم کئے تھے پہلی جلد کا نام افضل الفوائد اور دوسری کا راحت المحبین ہے[۴] ملفوظات صوفیا کے بعض اور مجموعوں کی طرح ان دونوں کتابوں کا بھی، تصنیف امیر خسرو ہونا مشتبہ سمجھا گیا ہے۔ پروفیسر محمد حبیب نے اپنی کتاب[۵] میں ان کا کہیں نام تک نہیں لیا لیکن وحید مرزا نے افضل الفوائد کو امیر خسرو کی تالیف مانا ہے[۶] اور اس سے استفادہ بھی کیا ہے ایسا گمان ہوتا ہے کہ اس وقت پروفیسر محمد حبیب ان کتابوں کے وجود سے بے خبر تھے ورنہ انہوں نے راحت المحبین کو بطور ماخذ کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔ بعد کو انہوں نے خواجگان چشت کے ملفوظات کا تنقیدی مطالعہ کیا[۷] تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان میں سے بیشتر جعلی ہیں۔ راحت القلوب، فوائد السالکین اور اسرار الاولیاء کا ایک تنقیدی جائزہ راقم الحروف نے بھی رسالہ "منادی" دہلی کے بابا فرید نمبر (۱۹۷۴ء) میں پیش کیا ہے۔

پروفیسر محمد حبیب نے ان ملفوظات کے جعلی ہونے کی جو دلیلیں دی ہیں ان سے جناب صباح الدین عبد الرحمٰن کو اختلاف ہے[۸] اگرچہ وہ ان ملفوظات کی حمایت میں قوی تر دلائل فراہم نہیں کر سکے ہیں۔

ان ملفوظات کو جعلی قرار دینے کے سلسلہ میں جو خارجی شواہد پیش کئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی (وصال ۷۵۷ھ) نے ایک مجلس میں فرمایا کہ حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ حضرت نظام الدین اولیاء اور ہمارے شجرے کے دوسرے مشائخ میں سے کسی نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے اس پر حمید قلندر جامع خیر المجالس نے اطور تائید کہا کہ فوائد الفواد میں ہے[۹] کہ کسی شخص نے حضرت نظام الدین سے عرض کیا کہ اودھ میں مجھے ایک شخص نے ایک کتاب دکھائی تھی اور کہا تھا کہ یہ آپ کی تصنیف ہے۔ حضرت نظام الدین نے فرمایا کہ اس نے غلط کہا۔ میں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے" پھر حمید قلندر نے پوچھا کہ یہ جواب ملتے ہیں کیا اس زمانہ میں نہ تھے؟ حضرت چراغ دہلی نے فرمایا کہ نہیں۔ اگر ہوتے تو حضرت شیخ ان کا تذکرہ کرتے اور یہ دستیاب ہوتے۔

حضرت چراغ دہلی نے یہ بھی فرمایا کہ ان ملفوظات میں بہتیری باتیں ایسی ملتی ہیں جو ان بزرگوں کے شایان شان نہیں ہیں[۱۰]

۲۔ ہندوستان میں چشتی سلسلہ کی دو مستند کتابیں فوائد الفواد (ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاء فراہم کردہ امیر حسن علاء سجزی دہلوی) اور سیر الاولیاء مصنفہ سید محمد میر خورد کرمانی میں ان ملفوظات کے مجموعوں کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ حالانکہ مصنف سیر الاولیاء نے تا مقدور تمام کتب سے استفادہ کیا ہے۔ اور اسے خاص طور پر ان کتابوں سے باخبر ہونے اور ان تک دسترس حاصل کرنے کے مواقع خوب حاصل تھے۔

۳۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ اور جانشین حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی مجلس میں ایک بار ان ملفوظات کا تذکرہ ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ حضرت

---

[۱] مرآۃ العلوم جلد ۳/ ۲۱۰، [۲] فہرست مخطوطات دارالعلوم دیوبند جلد ۲/ ۳۶ و ۲/ ۳، [۳] میرامن دہلوی باغ و بہار (دیباچہ) [۴] یہ دونوں کتابیں فارسی میں ہیں۔ ان کا اردو ترجمہ ہشت بہشت نامی مجموعے میں شامل ہے، اللہ والے کی قومی دکان، لاہور ۱۹۵۶ء) اور اس وقت وہی میرے سامنے ہے۔

[۵] MOHAMMAD HABIB: HAZRAT AMIR KHUSRAU OF DELHI, (ALIGARH UNIVERSITY PABLICATION, 1927)

[۶] WAHID MIRZA (MOHAMMAD): THE LIFE & WORKS OF AMIR KHUSRAU, (PANJAB UNIVERSITY PABLICATION, 1935)

[۷] MOHAMMAD HABIB CHISHTI MYSTIC RECORD OF THE SALTANATE PERIOD, 'MEDIEVAL INDIA' QUARTERLY, VOL 1, 11, (1950)

[۸] خیر المجالس (مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی) ۵۲-۵۳

[۹] فوائد الفواد (مرتبہ لطیف ملک) ۶، [۱۰] خیر المجالس ۵۲

[۱۱] شائع کردہ چرنجی لال۔ مطبع محب ہند دہلی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء ص۳

[۱۲] جوامع الکلم (قلمی) ورق ۹۸ ب

[...] الدین کے جو ملفوظات امیر حسن علا سجزی نے جمع کئے ہیں وہ معتبر ہیں، باقی جن لوگوں نے [...] کے ملفوظات لکھے ہیں بے بنیاد ہوا ہے[۵]۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے اودھ میں [...] الدین کے ملفوظات کا ایک مجموعہ دیکھا تھا جسے سید صدر الدین اسحاق سے کچھ [...] ملتی تھی۔ پھر ایک واقعہ سنایا کہ مولانا محمد بانی خواجہ صدر الدین اسحاق کے مرید تھے[۶] [...]وں نے حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے ملفوظات جمع کئے تھے اور ایک بڑی جلد [ہو] گئی تھی۔ جب حضرت چراغ دہلی ٹھٹھہ (سندھ) سے واپس آئے تو مولانا محمد وہ [لے] کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت چراغ دہلی نے اپنے بھانجے سید [زین] العابدین کو بلایا اور کہا ایک تغار لاؤ۔ جب لے آئے تو فرمایا اسے پانی سے بھر دو [...] تو کہا اس کتاب کو پھاڑ کر اس میں دھو ڈالو۔ چنانچہ اپنے سامنے اسے دھلوا دیا۔

جوامع الکلم میں یہ بھی ہے[۷] کہ حضرت چراغ دہلی کے خلیفہ مولانا کمال الدین [...] ان ملفوظات کے دکھانے جو حمید قلندر نے فراہم کئے تھے[۸]۔ خیر المجالس [کی] طرف اشارہ ہے، حضرت نے فرمایا کہ من چیزے دیگر گفتہ ام و مولانا حمید الدین چیزے [دیگر] گفتہ ام، مولانا حمید الدین چیزے دیگر نوشتہ است، اوراق کو لے کر [...] دیا۔ لیکن خیر المجالس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حمید قلندر نے ان [ملف]وظات کی صحت کے لئے بہت اہتمام کیا تھا اور اسے دوران تالیف میں حضرت [چر]اغ دہلی کے ملاحظہ کے لئے پیش کرتے رہتے تھے[۹]۔

فوائد الفواد کے حسن ترتیب، صحت اور جامعیت کو ملفوظات کا دوسرا کوئی [مجم]وعہ نہیں پہنچتا۔ امیر حسن علا سجزی نے بارہ سال میں (۱۸۸) مجلسوں کے ملفوظات [بڑ]ے اہتمام سے جمع کئے۔ اور حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنے دست مبارک سے ان [کی] تصحیح کی تھی[۱۰]۔ اس میں کہیں فوائد السالکین، راحت القلوب یا اسرار الاولیاء [وغ]یرہ کتابوں کا نام تک نہیں آیا جس زمانہ میں فوائد الفواد مرتب ہو رہی تھی اس عہد [کے] ملفوظات دُرر نظامیہ میں بھی ملتے ہیں[۱۱] اور دونوں میں امیر خسرو کی افضل الفوائد یا راحت المحبین کا کوئی حوالہ نہیں ہے حالانکہ امیر خسرو نے بھی تقریباً وہی تاریخیں درج کی ہیں۔ امیر حسن دہلوی امیر خسرو کے گہرے دوست تھے اتنے کہ دونوں کی محبت کے افسانے مشہور ہو گئے ہیں مگر فوائد الفواد میں امیر خسرو کا نام صرف ایک جگہ ضمناً آیا ہے[۱۲]۔ ورنہ وہ حاضرین مجلس کے درمیان کہیں نظر نہیں آتے۔ اسی طرح افضل الفوائد میں حسن علا سجزی صرف دو جگہ ملتے ہیں[۱۳]۔

حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مشتمل کئی مجموعے فراہم کئے گئے۔ فوائد الفواد کے علاوہ ایک مجموعہ انوار المجالس سید محمد امام بن خواجہ صدر الدین [...] دہلوی نے مرتب کیا تھا[۱۴]۔ میر عزیز الدین صوفی نے تحفۃ الابرار وکرامۃ الاخیار ترتیب دیا تھا جسے بھی حضرت نظام الدین نے ملاحظہ فرما کر تصحیح کی تھی۔ چوتھا مجموعہ حضرت کے بھانجے ابو بکر مصلی بردار کے فرزند عبد العزیز نے تیار کیا تھا[۱۵]۔ اور اس کا نام مجموع الفوائد رکھا تھا۔ پانچویں کتاب ملفوظات المشائخ تھی[۱۶] جسے خواجہ شمس الدین دہلوی نے ترتیب دیا تھا۔ زبان عربی میں حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مشتمل ایک تالیف خلاصۃ اللطائف مولانا علی بن محمود جاندار نے لکھی تھی[۱۷] جس کا ایک اقتباس سیر الاولیاء میں موجود ہے۔ اور وہیں سے شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں نقل کیا ہے[۱۸]۔ ساتواں مجموعہ دُرر نظامیہ ہے۔ اس کے مؤلف بھی یہی علی بن محمود جاندار ہیں اور صرف اسی کتاب کا قلمی نسخہ ملتا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) میں محفوظ ہے[۱۹]۔ اردو ترجمہ البتہ چھپ گیا ہے[۲۰]۔

حضرت نظام الدین اولیاء کی ذات میں بقول حضرت بابا فرید گنج شکر علم، عقل اور عشق تینوں جوہر جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنے زمانہ کے بہترین علما سے پڑھا تھا جن میں مولانا امین الدین محدث تبریزی[۲۱]، مولانا کمال الدین زاہد[۲۲]، مولانا علاء الدین اصولی[۲۳] اور حضرت بابا فرید گنج شکر جیسی باکمال ہستیاں ہیں[۲۴]۔ اس وقت تک جو کتابیں تصوف، فقہ اور حدیث کی رائج تھیں وہ حضرت کے مطالعے

[...] اسرار الاولیاء کی طرف اشارہ ہے۔ اس کتاب کا بھی تنقیدی جائزہ بابا فرید نمبر میں شامل ہے۔ [۲] جوامع الکلم (قلمی) ورق ۹۸ ب [۳] یہ مولانا سید محمد امام کی طرف اشارہ ہے۔ جو خواجہ صدر الدین اسحٰق کے فرزند تھے۔ بستی نظام الدین اولیاء میں ان کا مزار ہے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کے مورث اعلیٰ تھے۔ (حالات کے لئے ملاحظہ ہو سیر الاولیاء / ۲-۲۱۱) انھوں نے حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات بھی انوار المجالس نامی کتاب میں جمع کئے تھے اس کے کچھ اقتباسات سیر الاولیاء صفحہ ۳۰۷، ۳۰۹ میں آئے ہیں۔ اور بعض دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں بھی تکلف، اظہار کی وجہ سے اس مجموعے کو بعد کو نظر انداز کیا گیا ہوگا۔ [۴] ٹھٹھہ سے واپسی انتقال سے چھ سال قبل ہوئی تھی۔ [۵] جوامع الکلم (قلمی) ورق ۹۸ ب ۹ - الف [۶] جوامع الکلم (قلمی) ورق ۹ الف [۷] خیر المجالس ص ۲۱۸ [۸] خیر المجالس صفحہ ۲۱۸ [۹] فوائد الفواد ۴۹ [۱۰] سیر الاولیاء / ۳۰۸

[۱۱] دُرر نظامیہ کے بارے میں میرا ایک تفصیلی مضمون منادی کے بابا فرید نمبر میں شامل ہے [۱۲] فوائد الفواد ۲۴۲ [۱۳] افضل الفوائد (اردو ترجمہ) صفحات ۲-۷۵

[۱۴] سیر الاولیاء ۱۷۷ [۱۵] سیر الاولیاء ۲۲ [۱۶] سیر الاولیاء ۲، [۱۷] سیر الاولیاء / ۳۱۸ [۱۸] سیر الاولیاء / ۳۴۹ [۱۹] اخبار الاخیار / ۹۴-۹۵

[...] میں خلاصۃ اللطائف کا جو اقتباس عربی میں ملتا ہے وہی دُرر نظامیہ باب ۱۶ صفحہ ۱۳۹ میں پایا جاتا ہے۔ اس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ خلاصۃ اللطائف میں ایسی ملفوظات عربی زبان میں بیان ہوں گے جو دُرر نظامیہ میں فارسی میں ہیں۔

[۲۰] نو ہارکلکشن (نمبر ۱۸۳) [۲۱] کتب خانہ نذیریہ، اردو بازار دہلی سے شائع [۲۲] دُرر نظامیہ باب ۲۱ ص ۱۸۸ نیز فوائد الفواد ۳۴۲ [۲۳] سیر الاولیاء ص ۱۰۱، اخبار الاخیار

[۲۴] فوائد الفواد ۲۷۸، ۳۴، ۳۴۱ وغیرہ خیر المجالس ۱۹۰، ۱۹۱ تذکرۃ الواصلین ۹

[۲۵] بابا فرید سے انھوں نے عوارف المعارف کا درس لیا تھا فوائد الفواد / ۴۳۔ اس کے علاوہ ملاقات میں تمہید ابو شکور سالمی کا ذکر بھی آیا ہے۔ سیر الاولیاء / ۱۱۷

[۲۶] سیر الاولیاء / ۱۰۱

میں زینت تھیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی آپ بحّاث "از محفل شکن" مشہور تھے۔ [1] فوائد الفواد میں فقہ، حدیث، تفسیر، اخلاق، تصوّف اور سلوک کے جو نکتے بیان ہوئے ہیں، اُن کو دیکھ کر جو معارف ہیں انھیں دیکھ کر کسی کو بھی یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہو سکتی کہ حضرت نظام الدین اعلیٰ درجہ کا علمی ذوق رکھتے تھے اور اُن کی مجلسوں میں بہترین علمی نکات بیان ہوتے تھے۔ غیاث الدین تغلق نے سماع کے مسئلے پر جو مناظرہ اپنے دربار میں منعقد کرایا تھا،[2] اس میں حضرت تنہا تھے مگر آپ نے تمام علماء کی زبان بند کر دی تھی۔ لیکن جعلی ملفوظات کے مجموعوں میں یا تو وہ روایات ہیں جنھیں اسرائیلیات کہا جاتا ہے یا قصص الانبیاء کے اقتباسات ہیں یا فوق الفطرۃ عناصر، غیر معمولی مجاہدات، کرامات اور مبالغہ آمیز فضائل کی ایک مسلسل داستان ہے۔ اگر فوائد الفواد یا خیر المجالس کے مطالب کا موازنہ مثلاً افضل الفوائد اور راحت المحبین کے مندرجات سے کیا جائے تو معیار و اعتبار کا نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے اور اس سے یہ شبہ قوی تر ہو جاتا ہے کہ یہ ملفوظات بعد میں دوسری کتابوں کو سامنے رکھ کر وضع کر لئے گئے ہیں یا اڑا لئے گئے۔ لوگوں نے تاہم دیکھا ہے کہ ایسی کتابوں کی مانگ اس زمانے میں اچانک بڑھ گئی تھی۔[3]

وہ تمام ملفوظات جن پر جعلی ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے حیرت انگیز طور پر باہم مماثل بھی ہیں۔ انیس الارواح، دلیل العارفین، فوائد السالکین، راحت القلوب، اسرار الاولیاء، افضل الفوائد، راحت المحبین، ان سب کتابوں کی ساخت ایک ہی سی ہے۔ کسی میں بھی تاریخی تسلسل کا وہ اہتمام نہیں ہے جو فوائد الفواد میں پایا جاتا ہے۔ حاضرین بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے نہیں ملتے۔ بات جب اکثر بغیر کسی سیاق و سباق کے شروع ہوتی ہے اور اسی طرح اچانک ختم ہو جاتی ہے۔ مختلف کتابوں کے حوالے ان سب ملفوظات میں بار بار آئے ہیں کہ "میں نے فلاں کتاب میں لکھا دیکھا ہے..."۔ اس کے برعکس فوائد الفواد کا انداز ایک حقیقی ملفوظ کا ہے۔ اس کی مجلسوں میں زندگی کی مہک اور موضوعات میں تنوع ہے اور اس کے مطالعے سے دل کو سرور اور دماغ کو نور حاصل ہوتا ہے۔

"جعلی ملفوظات" کی تاریخیں بھی اکثر غلط ہیں اور ان کا تطابق دوسرے مآخذ کی مدد سے نہیں ہوتا۔ اگر ان میں دئے ہوئے سنین پر بھروسہ کیا جائے تو کسی واقعے کی صحت بھی قابل اعتبار نہیں رہتی۔ مگر صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ان کے دفاع میں کہتے ہیں کہ سنین کا غلط ہونا کاتبوں کا تصرف ہے۔ اگر انھیں کاتبوں کی کرامات سمجھ کر ان سے صرف نظر کی جائے اور صرف مطالب پر نظر کی جائے تو گتھی حل ہو جاتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کاتبوں کو تاریخ و سال ہی سے کیا دشمنی تھی۔ ہم ایک دو مواقع پر تو یہ عذر قبول کر سکتے ہیں مگر یہاں تو "پنبہ کجا کجا نہم" والا معاملہ ہے۔

ان سب ملفوظات کا گہرا تحلیلی مطالعہ کرنے کے بعد فی الحال میری رائے بھی یہی ہے کہ موجودہ صورت میں ان کی صحت مشکوک ہے اور ان کو عوام کی عقیدت و محبت کو دیکھتے ہوئے بعض کتب فروشوں نے تصوف کی کچھ معتبر اور کچھ نامعتبر کتابوں کے اقتباسات کو زبانی روایات سے مخلوط کر کے انھیں وضع کیا ہے۔ یہ کچھ ایسی انہونی بات نہیں ہے۔ سیکڑوں مصنفوں کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی ہے کہ ماحول کی رنگینیاں ان کے نام سے کتابیں لکھ کر بیچی جاتی تھیں۔ خواجہ فرید الدین عطار سے کئی ہی کتابوں کا غلط انتساب ہوا ہے۔ دیوان بو علی شاہ قلندر، دیوان خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، دیوان خواجہ معین الدین اجمیری اور دیوان ربّ نساء مخفی اس کی چند مثالیں ہیں۔

مذکورۂ بالا شبہات امیر خسرو کی افضل الفوائد اور راحت المحبین پر بھی اسی طرح وارد ہوتے ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا تذکرہ نہ تو خود امیر خسرو نے اپنی کسی دوسری تصنیف میں کیا ہے۔ نہ ان کا حوالہ فوائد الفواد، خیر المجالس، سیر الاولیاء، جوامع الکلم یا اخبار الاخیار جیسی قدیم تالیفات میں پایا جاتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ میں امیر خسرو سے منسوب ان دونوں کتابوں کے جعلی ہونے کا اعلان قطعیت کے ساتھ بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ بعض شواہد ان کے حق میں بھی مل جاتے ہیں، جن میں سب سے قوی شہادت یہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ حضرت برہان الدین غریب ہانسوی (متوفی ۷۳۸ھ) کے مریدوں میں ایک بھائی تھے ایک خواجہ حماد کاشانی (متوفی ۷۶۱ھ) جنھوں نے اپنے مرشد کے ملفوظات "احسن الاقوال" کے نام سے جمع کئے ہیں[4] اور اس کے علاوہ منافع المسلمین، اسرار الطریقۃ اور حصول الوصول بھی ان کی تصانیف ہیں۔ دوسرے بھائی خواجہ مجد الدین کاشانی تھے جنھوں نے غرائب الکرامات اور بقیۃ الغرائب نامی دو کتابوں میں حضرت برہان الدین غریب کے ملفوظات کو جمع کیا تھا۔[5] تیسرے بھائی خواجہ رکن الدین دبیر کاشانی نے ایک قابل قدر کتاب شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء[6] لکھی تھی جو حقیقتاً سلوک کا مستند اور مفصل ضابطہ ہے۔ رکن دبیر نے بھی حضرت برہان الدین کے ملفوظات نفائس الانفاس نامی مجموعے میں فراہم کئے ہیں۔

---

[1] سیر الاولیاء/۱۱ [2] اس کی روداد سیر الاولیاء/۵۲۵ - ۵۲۲ میں ملے گی۔ مولانا فخر الدین زرادی کا رسالہ کشف القناع عن وجوہ السماع بعد کو اسی سلسلے میں لکھا گیا ہے اور اس میں بھی مناظرے کی کچھ روداد موجود ہے۔ اس کے قلمی نسخے کتب خانوں میں مل جاتے ہیں۔ [3] صباح الدین بزمی تاریخ مشائخ (بحوالہ وحید مرزا/۱۱۲) [4]

SEE MY ARTICLE AHSAN AL-AQWAL AN EARLY SOURCE ON HAZRAT SHEIKH FARID PUBLISHD THE 'JOURNAL OF SIKH STUDIES' VOLUME 1, No. 2 (AUGUST, 1974) P 86

[5] یہ دونوں کتابیں اب ناپید ہو چکی ہیں مگر مستی روشن علی کی تصنیف روضۃ الاقطاب میں ان کے حوالے موجود ہیں۔ [6] یہ کتاب ابھی تک نہیں چھپی ہے۔ دکنی زبان میں اس کا ترجمہ میراں یعقوب نے کیا تھا۔ اس کا انتخاب ایک طویل مقدمہ کے ساتھ مدیع حسینی نے رسالہ قدیم اردو (جلد دوم) میں چھاپا ہے۔ شمائل الاتقیاء کے قلمی نسخے نیشنل میوزیم نئی دہلی، ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری، درگاہ شاہ امین الدین اعلیٰ (بیجاپور)، انڈیا آفس اور برٹش میوزیم میں ملتے ہیں۔ راقم الحروف نے نیشنل میوزیم کے نسخوں کو دیکھا ہے۔ [7] یہ کتاب بھی ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا ابھی تک صرف ایک قلمی نسخہ معلوم ہے جو کتب خانہ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں محفوظ ہے۔

ان کی ایک کتاب مصور العارفین ہے جس کے متعدد اقتباسات شمائل الاتقیاء میں آئے ہیں۔

شمائل الاتقیاء کی تالیف کا انداز یہ ہے کہ سلوک کے مختلف موضوعات پر مشائخ صوفیہ کی مستند کتابوں سے اقتباسات جمع کئے گئے ہیں جن کتابوں سے عبارتیں ماخوذ ہیں ان میں بعض کے حوالے آئے ہیں۔ دیباچہ میں بھی مولف نے طول طویل بحث اپنے مصادر کی دی ہے۔ اس کتاب کی تالیف نفائس الانفاس کے بعد ہوئی ہے۔ اور دوران تالیف ہی میں (۷۳۸ھ / ۱۳۳۷ء) حضرت برہان الدین غریب کا انتقال ہو گیا تھا۔ یعنی شمائل الاتقیاء کی تالیف کا آغاز تو حضرت کے ایما سے ہوا مگر آپ اس کو تکمیل کے بعد ملاحظہ فرما سکے ہیں۔

دیباچۂ شمائل الاتقیاء میں مآخذ کی جو فہرست ہے اس میں انیس الارواح، دلیل العارفین، فوائد السالکین، راحت القلوب اور اسرار المعرفین کے علاوہ راحت المحبین ملفوظ شیخ نظام الدین جمع تالیف امیر خسرو بھی لکھا ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ شمائل الاتقیاء حضرت امیر خسرو کے انتقال (۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء) سے چودہ سال بعد حضرت برہان الدین غریب کے حکم سے لکھی گئی جنھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں گزارا تھا اور عمر کے آخری دور میں اپنے مرشد کے حکم سے دکن تشریف لے گئے تھے[1] حضرت امیر خسرو سے ان کے قرب اور اختصاص کے تعلقات تھے[2] مگر یہ کتابیں امیر خسرو کی وفات کے بعد لکھی گئی ہوتیں اور ان کا مصنف امیر خسرو ہونا مشتبہ ہوتا تو حضرت برہان الدین غریب شمائل الاتقیاء کی تالیف میں ان سے استفادے پر شدید اعتراض کرتے۔ یاد رکھنے کے لئے یہ قرینہ موجود ہے کہ چشتی سلسلہ کے صوفیا کی یہ کتابیں حضرت برہان الدین غریب کے ساتھ ہی دکن پہنچی ہوں گی کیونکہ آپ دکن کو ہجرت کرنے والے متقدمین چشتی صوفیا میں سے ہیں آپ سے پہلے صرف آپ کے برادر خورد حضرت شیخ منتجب الدین ہانسوی (متوفی ۷۰۹ھ) دولت آباد تشریف لے گئے تھے[3]

افضل الفوائد کا نام شمائل الاتقیاء میں نہیں آیا ہے اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا تھا کہ وہ مستند نہیں ہے یا اس وقت تک وجود میں نہ آئی ہوگی۔ اور راحت المحبین امیر خسرو کی تالیف ہے۔ لیکن موخر الذکر کے دیباچہ میں ہے۔

> "منگل ۱۹ رجب ۷۱۹ھ کو قدم بوسی کا شرف حاصل کیا میں نے عرض کیا کہ اس سے پہلے جو کچھ میں نے جناب کی زبان مبارک سے سنا اسے نظم کرتا رہا اور اس کا نام افضل الفوائد رکھا جو منظور نظر عالی ہو چکا۔ اب بھی اگر فرمان ہو تو جو کچھ جناب کی زبان مبارک سے سنا جائے وہ لکھ لیا جائے تاکہ دوسری جلد مرتب ہو جائے لیکن اس جلد میں زیادہ تر انبیاء اور سلوک کی حکایات ہوں تاکہ میرے دل کو اطمینان ہو آپ نے فرمایا کہ بہتر پھر مسکرا کر فرمایا کہ جو کچھ پہلے دل میں ایسی تمنا تھی اس لئے میں نے یہاں کے بعد انبیاء کا ذکر شروع کیا ہے[4]۔"

اس سے ظاہر ہے کہ افضل الفوائد پہلی جلد ہے اور راحت المحبین کو اس کی جلد ثانی کی حیثیت سے مرتب کیا گیا ہے اور دوسری جلد کے دیباچہ میں جلد اول کا حوالہ ملتا ہے۔ لہٰذا دونوں کتابوں کا انتساب حضرت امیر خسرو سے درست ہے۔

یہاں ایک بات اور قابل ذکر ہے جو سرسری طور پر غیر متعلق معلوم ہوگی مگر اس سے جو نتائج برآمد ہوں گے وہ ہمارے اس مطالعے کو سمجھنے میں مدد دیں گے۔ راحت القلوب کا حوالہ بھی شمائل الاتقیاء میں موجود ہے۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے ملفوظات ہیں جن کے مؤلف حضرت نظام الدین اولیاء (وصال ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء) بتائے جاتے ہیں۔ پروفیسر محمد حبیب، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور خود راقم الحروف نے راحت القلوب کے جعلی ہونے کا اعلان کیا ہے۔ میں نے اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے دیکھے ہیں اور سب سے قدیم نسخہ جو میری نظر سے گزرا ہے وہ ۹۴۲ھ کا مکتوبہ تھا۔ اس سے میرا خیال تھا کہ راحت القلوب دسویں یا گیارہویں صدی ہجری کی من گھڑت ہے مگر شمائل الاتقیاء میں اس کا حوالہ دیکھ کر میں اس رائے سے رجوع کر چکا ہوں اگرچہ ابھی تک اس کتاب کے مستند ہونے کے بارے میں قطعیت کے ساتھ مطمئن نہیں ہوں۔

راحت القلوب کے جعلی ہونے کی دوسری دلیل جس پر بعض اور امور کی صحت کا بھی دارومدار ہے۔ یہ ہے کہ اس میں پہلی مجلس کی تاریخ ۱۵ رجب ۶۵۵ھ روز چہارشنبہ درج ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر کی تاریخ وفات ۵ محرم ۶۶۴ھ تسلیم کی گئی ہے[5] اور حضرت نظام الدین اولیاء نے فوائد الفواد میں فرمایا کہ میں نے اجودھن کے ۹ یا ۱۰ سفر کئے[6] جن میں تین سفر شیخ کی حیات میں ہوئے اور باقی سفر ان کے مزار مبارک کی زیارت کے لئے کئے گئے۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ بابا صاحب نے (۹۸) سال کی عمر پائی تھی[7] اور حضرت نظام الدین اولیاء نے بابا صاحب کی زندگی کے آخری تین یا چار برسوں میں ملاقات کی سعادت حاصل کی تھی۔ اس زمانے میں اکثر رمضان کا مہینہ وہیں گذارتے تھے۔ آخری رمضان ہی میں خلافت ملی تھی۔ اور اسی شوال میں دہلی کو واپسی ہوئی تھی[8] جس کے تین بعد محرم میں بابا صاحب کا وصال ہو گیا تھا۔

اگر ۶۶۴ھ بابا صاحب کی وفات کا سال مانا جائے تو حضرت نظام الدین اولیاء کی پہلی حاضری ۶۶۰ھ یا ۶۶۱ھ میں ہو سکتی ہے۔ دُرر نظامیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب حضرت بابا فریدؒ نے خلافت نامہ لکھوا کر دیا تو حضرت نظام الدین سے فرمایا کہ اسے ہانسی (ہریانہ) میں شیخ جمال الدین کو اور دہلی جا کر قاضی منتجب الدین کو دکھا دینا[9] حضرت نظام الدین نے دل میں سوچا کہ انھوں نے اپنے بھائی حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کو اجازت نامہ دکھانے کی ہدایت نہیں فرمائی شاید آپ ان سے خود ناراض ہیں جب دہلی آ کر معلوم ہوا کہ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور دُرر نظامیہ سے صراحت کے ساتھ ان کی تاریخ وفات

---

[1] سیر الاولیاء/۲۸۲ - روضۃ الاقطاب/۱۲۱ [2] اخبار الاخیار شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۹۳-۹۴ [3] دونوں علی روضۃ الاقطاب ص ۱۲۱ [4] راحت المحبین (اردو ترجمہ) ص ۵ [5] اخبار الاخیار ص ۵۴ (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۳۲ھ) [6] فوائد الفواد / [7] محمد علی سامانی نے سیر محمدی (تالیف ۸۳۱ھ) میں لکھا ہے کہ ۲۳ رجب ۸۱۸ھ کو حضرت بندہ نواز نے فرمایا کہ آج کے روز میری عمر بھی حضرت شیخ الاسلام فرید الدین مسعود قدس سرہ کی عمر کے مساوی ہو چکی یعنی آپ کی عمر شریف بہ ہنگام رحلت ۹۸ سال تھی [8] سیر الاولیاء/۹۹
[9] دُرر نظامیہ (باب ۱۳) ص ۱۲۷

خیال ۶۶۹ھ معلوم ہوتی ہے[1]۔ اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ بابا صاحب سے خلافت نامہ
ان ۶۶۹ھ میں ملا تھا۔ اور اسی مہینہ میں حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کا انتقال ہوا
۔اس کے بعد وہ بابا صاحب تقریباً چار سال تک حین حیات میں رہے۔

لیکن شمائل الاتقیاء کا جو قلمی نسخہ (مکتوبہ ۱۰۹۱ھ/ ۱۶۷۹ء) یہاں نسل
رام میں محفوظ ہے اس کے آخری ورق پر کسی شخص نے جس کی تحویل میں یہ کتاب رہی
کی بعض یادداشتیں قلم بند کر دی ہیں۔ اس میں حضرت برہان الدین غریب کا نسب نامہ
درج ہے۔ ان کے بھائیوں کے نام بھی بتائے ہیں۔

"اول برہان الدین قتال، دوم بابا محمد عرف حضرت شاہ برہان الدین، سوم
المتیع، چہارم ۔منتخب الدین"

اور بہنوں کے نام بی بی عائشہ، بی بی مسہ، بی بی خدیجہ اور بی بی مریم لکھے ہیں یہ بھی
درج ہے کہ آپ کی والدہ کا نام بی بی ساجرہ تھا۔ اور ۱۱ر شوال کو ان کا عرس ہوتا ہے۔ اس
کے بعد بعض تاریخی مادّے درج کئے ہیں جو یہ ہیں۔

۱۔ حضرت نظام الدین اولیاء ۔۔ شہنشاہ دین۔ (۷۲۵ھ)
۲۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری۔ آفتاب ملک ہند (۶۳۳ھ)
۳۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ۔ خواجہ جیو (۶۳۴ھ)
۴۔ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ۔ کلید گنج شکر (۶۵۷ھ)
۵۔ امیر حسن دہلوی۔ طوطئ شکر مقال (۷۲۵ھ)[2]
۶۔ حضرت برہان الدین غریبؒ ۔ نور عشق بود (۷۳۸ھ)

اگر ان مادّہ ہائے تاریخی کو درست مانا جائے تو کچھ نئے سوالات ابھرتے ہیں بعض
ملفوظات میں لکھا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی
حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نے ایک ہی سال میں رحلت کی[3] اور یہ ۶۳۳ھ کا
سنہ سمجھا جاتا ہے فوائد الفواد میں التمش کی تاریخ وفات درج ہے۔[4]

"اوران جا تاریخ نقل سلطان شمس الدین یاد کرد بندہ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر این
بیت بزبان مبارک راندہ

سال شش صد وسی وسہ از ہجرت ؛ ماند شاہ جہاں شمس دین عالمگیر (کذا)

سیر الاولیاء میں بھی ہے کہ قاضی محی الدین کاشانی نے حضرت نظام الدین اولیاء
خدمت میں عرض کیا کہ جس سال سلطان شمس الدین التمش کا انتقال ہوا ہے اسی
سال شیخ قطب الدین بختیار کاکی اور مولانا قطب الدین کاشانی نے بھی رحلت فرمائی ہے
سن کر حضرت نظام الدین نے یہ شعر پڑھا[5]

بسال شش صد وسی وسہ بود از ہجرت
نماند شاہ جہاں شمس دین عالمگیر (کذا)

لیکن اس شعر کا پہلا مصرع دونوں کتابوں میں ساقط الوزن ہے اس کی طرف
فوائد الفواد کے نئے ایڈیشن کے مرتب نے بھی توجہ نہیں کی۔ صحیح شکل یہ ہے۔

بسال شش صد وسی وچہار از ہجرت
نماند شاہ جہاں شمس دین عالمگیر

اور یہی فوائد الفواد کے بعض قلمی نسخوں میں پائی جاتی ہے[6] اس سے معلوم ہوا کہ
۶۳۴ھ میں التمش نے انتقال کیا اور یہی اعداد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے
مادۂ تاریخ وفات "خواجہ جیو" سے برآمد ہوتے ہیں۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ حضرت خواجہ
معین الدین اجمیری نے بھی اسی سال رحلت فرمائی تھی۔ اسے ماننے میں ذرا سی دشواری
پیدا ہوتی ہے۔ مادۂ تاریخ وفات "آفتاب ملک ہند" سے ۶۳۳ھ مستفاد ہیں علی بن محمود
جاندار نے دُرَرِ نظامیہ میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے آخری سفرِ دہلی کا حال لکھا
ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت حضور اجمیر پہنچے تھے کہ دہلی میں حضرت خواجہ
قطب الدین نے انتقال فرمایا[7]

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے ۱۴ ربیع الاول ۶۳۴ھ کو انتقال فرمایا
اور اس سے بیس ماہ کے بعد (رجب ۶۳۴ھ) میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کا وصال
تسلیم کیا جائے گا اس اشکال کو رفع کرنے کی یہ صورت ہے کہ آفتاب کو الفاب سمجھا
جائے یعنی قدیم رسم الخط میں الف ممدودہ کو دو الف کا قائم مقام سمجھتے ہیں اس طرح
اس مادے سے بھی ۶۳۴ھ برآمد ہوں گے تاریخ نگاروں نے ایک عدد کی کمی بیشی کو جائز
بھی رکھا ہے۔

اب رہا حضرت بابا فرید گنج شکر کے انتقال کی تاریخ کا مادہ "کلید گنج شکر" تو اس سے
۶۵۷ھ/ ۱۲۵۸ء برآمد ہوتے ہیں۔ اگر اسے صحیح مانا جائے تو بعض اشکال پیدا ہوتے ہیں اور
بعض رفع بھی ہو جاتے ہیں۔

(الف) ۶۵۷ھ تاریخ وفات مانیں تو حضرت نظام الدین اولیاء کی پہلی حاضری کا سنہ
۶۵۵ھ ہو جاتا ہے جو راحت القلوب میں دیا ہوا ہے۔

(ب) حضرت امیر خسرو اپنے والد امیر سیف الدین محمود کے ساتھ آٹھ سال کی عمر میں
حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے امیر خسرو کی ولادت[8] ۶۵۱ھ/ ۱۲۵۲ء
میں ہوئی ان کے والد کا انتقال ۶۵۹ھ/ ۱۲۶۱ء میں ہوا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امیر خسرو جس
سال پہلی بار اپنے والد کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں باریاب ہوئے ہیں
اسی سال یا اس سے ایک سال کے بعد ان کے والد نے سفر آخرت اختیار کیا ہے اگر امیر سیف الدین
حضرت نظام الدین کے مرید ہوئے ہیں تو حضرت اس وقت تک کسی کو بیعت نہیں کر سکتے تھے،
جب تک خود آپ کو خلافت و اجازت نہ ملی ہو لہذا یہ ماننا لازم آئے گا کہ ۶۵۹ھ تک حضرت
نظام الدین کو اجازت مل چکی تھی اور اس سے بھی بابا فرید گنج شکرؒ کا سنہ وفات ۶۵۷ھ تسلیم

۱ے دُرَرِ نظامیہ (باب ۱۴) ص ۱۲۰، ۲ے یہ تاریخ وفات حضرت امیر خسرو کی ہے اور ان کے بارے کتنہ یہی کہتے ہیں۔ امیر حسن دہلوی کا انتقال ۷۳۰ھ میں ہوا تھا۔ ۳ے اخبار الاخیار/ ۲۳
۴ے فوائد الفواد ۲۹۵، سیر الاولیاء/ ۵۶، ۵ے سیر الاولیاء ۵۶ ۶ے فوائد الفواد (قلمی نسخہ برٹش میوزیم۔ ورق ۸۲ ۷ے دُرَرِ نظامیہ (باب ۲۴) ص ۲۱۰ ۸ے یہاں
اس موضوع پر تفصیل سے بحث کا موقع نہیں ہے لیکن ڈاکٹر وحید مرزا نے امیر خسرو کی ولادت کا زمانہ ۶۵۲ھ متعین کیا ہے میرا خیال ہے کہ یہ ۶۵۱ھ ہونا چاہیئے۔ اس کے ثبوت سے شواہد ملتے ہیں شہزادہ
بغرا خان کے مرثیہ میں بھی امیر خسرو نے لکھا ہے کہ اب ۶۸۳ھ ہے اور میری عمر ۳۲ سال ہو چکی ہے (دیکھو وحید مرزا) ص ۶۳ وغیرہ۔

کہ ان کی ایک قوی دلیل مل جائے گی۔

مگر اس کے سوا ۷۲۵ھ کو تاریخ وفات مان لینے سے کچھ اور عقدے پیدا ہوں گے جن کی تفصیل موجودہ موضوع کے احاطے سے باہر ہے۔ اس لئے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں اور فی الحال راحت المحبین کے بارے میں اپنی سابقہ رائے پر قائم ہوں۔

دراصل بزرگانِ چشت کے بارے میں تاریخوں کا تذکرہ نویسوں کا زیادہ تر دار و مدار سیر الاولیاء پر ہے۔ اور اس کا یہ حال ہے کہ صرف ایک بار (۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء) دہلی سے چھپی ہے۔ اور اس کا متن بھی ایک اٹھارھویں صدی عیسوی کے مخطوطے پر مبنی ہے۔ اس میں کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ تحریف اور رد و بدل بھی ہوا ہے۔ اور بیشتر مواقع پر ناشر یا مرتب سے صحیح عبارت پڑھی ہی نہیں گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب کا ایک تنقیدی متن تمام معلوم خطی نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا جائے۔ اور یہ کام راقم الحروف نے شروع کر رکھا ہے۔

افضل الفوائد میں (۳۴) مجلسوں کے ملفوظات ہیں جن میں پہلی مجلس کی تاریخ ۲۴ ذی الحجہ ۷۱۳ھ اور آخری مجلس ۱۵ ذی قعدہ ۷۱۵ھ بتائی گئی ہے۔ ان میں سے بیشتر تاریخوں کا مقابلہ تقویم سے کیا گیا تو مطابقت نہیں پائی گئی۔ اس کی مفصل بحث شاید غیر دلچسپ ہوگی۔ مگر اشارتاً ایک مثال لکھنا کافی ہے۔

(الف) افضل الفوائد کی تیسری مجلس کی تاریخ ۱۰ محرم (۷۱۴ھ) بتائی گئی ہے۔ اور دن پنجشنبہ لکھا ہوا ہے۔ اس حساب سے ۱۲ محرم کو شنبہ ہونا چاہئے مگر وہاں اس تاریخ کو دن چہارشنبہ بتایا ہے۔

حاضرین مجلس میں مولانا شمس الدین یحییٰ، مولانا برہان الدین غریب، مولانا فخر الدین زرادی، مولانا وجیہ الدین پائلی، مولانا شہاب الدین میرٹھی اکثر مجلسوں میں موجود ہیں۔ لیکن ایک محفل میں مولانا جمال الدین ہانسوی بھی حاضر ہیں اور ان کی موجودگی میں محفل سماع برپا ہوئی ہے۔ اس میں اگر کتابت کی غلطی نہیں ہے اور تمام قلمی نسخوں میں شیخ جمال ہانسوی ہی کا نام ملتا ہے تو اسے افضل الفوائد کے جعلی ہونے کی قوی ترین داخلی شہادت مانا جائے گا۔ کیونکہ شیخ جمال الدین ہانسوی کا انتقال حضرت بابا فرید گنج شکر کی حیات ہی میں ہو چکا تھا اور اس کا حوالہ دُررِ نظامیہ میں بھی دیا گیا ہے۔[1] ۷۱۴ھ میں وہ حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں کیسے موجود ہو سکتے ہیں۔ ان کا حال بھی اس طرح لکھا ہے[2] کہ جب وہ آئے تو آداب بجا لا کر بیٹھ گئے۔ حالانکہ حضرت شیخ جمال ہانسوی حضرت بابا فریدؒ کے خلیفۂ اول تھے۔ اور جب بابا فرید صاحب کسی کو خلافت نامہ لکھ کر دینے والے ہوتے تو حکم بھی ملتا تھا کہ اسے ہانسی میں شیخ جمال کو (تصدیق کے لئے) دکھا دینا۔ خود حضرت نظام الدین اولیاء نے بھی اپنا خلافت نامہ انھیں لا کر دکھایا تھا۔ تو انھوں نے یہ شعر پڑھا تھا۔[3]

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردہ بگوہر شناس

اس کے ساتھ ہی محفل سماع میں رقص کرنے والے شیخ عثمان سیاح ہیں۔ یہ حضرت ابوالفتح شیخ رکن الدین سہروردی کے مرید تھے اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی مجالس اکثر آیا کرتے تھے۔ شیخ جمال ہانسویؒ سے عمر اور رتبہ میں یقیناً بہت کم تھے۔ ان کے سامنے سماع میں وجد کرنا یوں بھی ادب کے خلاف ہوتا۔ اور شاید جس شیخ کے وہ مرید تھے اس سنت پر عامل ہوں تو ممکن ہے کہ سماع سے بالکل ہی محترز رہے ہوں۔

افضل الفوائد کی پہلی مجلس ۷۱۳ھ کی ہے اور اسی سنہ کی سترہ (۱۷) مجلسیں فوائد الفواد کی جلد سوم میں موجود ہیں جن میں آخری محفل ۲۱ ذی قعدہ ۷۱۳ھ کی ہے۔ ان تاریخوں کے آس پاس ہی افضل الفوائد کی مجلسیں قلم بند ہوتی رہیں۔ مگر فوائد الفواد میں نہ وہ شخصیات نظر آتی ہیں نہ وہ موضوعات ہیں جو ہمیں امیر خسرو کے مرتب کردہ ان ملفوظات میں ملتے ہیں۔

ایک عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ افضل الفوائد کا مسودہ امیر خسرو نے حضرت نظام الدین اولیاء کے ملاحظہ میں پیش کیا تھا۔

"ستائیسویں ماہ جمادی الاولیٰ کو پابوسی کا شرف حاصل ہوا۔ اس روز میں نے جز جن میں خواجہ راستان کے الفاظ دربار لکھے تھے حاضر خدمت کئے اور عرض کیا کہ آج تک کچھ بندہ نے جناب کی زبان مبارک سے سنا، اپنی سمجھ کے مطابق اسے قلم بند کرتا رہا اور اس کا نام افضل الفوائد رکھا۔ جناب نے یہ سن کر ان اجزا کا مطالعہ کر کے فرمایا کہ اچھا لکھا اور عمدہ نام رکھا ہے۔ اور جہاں کہیں مجھ سے کوئی بات رہ گئی تھی اپنے دست مبارک سے لکھ دی۔"[4]

ایسا ہی بیان فوائد الفواد کو شیخ کی خدمت میں پیش کرنے کے بارے میں امیر حسن نے بھی لکھا ہے۔ ۲۴ محرم ۷۱۴ھ کی مجلس میں ہے:

"سعادت پابوس بدست آمد۔ آں روز بندہ جلد اول کہ ہم ازیں فوائد الفواد جمع کردہ شدہ است، بحکم فرمان پیش برد۔ چوں مطالعہ فرمودہ مشرف استحسان ارزانی داشت و فرمود کہ نیکو نوشتہ ای و درویشانہ نوشتہ ای و نام ہم نیکو کردہ ای۔"[5]

ان دونوں بیانوں کا تعلق و مقابلہ ایک خاصا قوی شبہ پیدا کرتا ہے۔ دوسرا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ان "جعلی" ملفوظات میں ایسا مواد بالکل نہیں ہے جو اس عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات پر روشنی ڈالتا ہو۔ یہی کیفیت افضل الفوائد کی بھی ہے۔ مگر اس کے برعکس فوائد الفواد، دُررِ نظامیہ، سیر الاولیاء، خیر المجالس یا احسن الاقوال تاریخ کے طالب علم کو بہت سی مختصر مگر قیمتی معلومات بکھری ہوئی مل جاتی ہیں۔

تصوف اور مذہب کی کتابوں کے حوالے بھی ان ملفوظات میں کثرت سے آتے ہیں اور ان کا انداز بھی شک انگیز حد تک مماثل ہے۔ افضل الفوائد میں بھی چالیس کتابوں کے حوالے آئے ہیں۔ ان میں کچھ کتابیں اوراد و وظائف کے مجموعے ہیں۔ کچھ تصوف کے موضوع پر ہیں۔ تیسرے نمبر پر فقہ اور تفسیر کی کتابیں ہیں۔ جن میں تفسیر کشاف للزمخشری، تفسیر زاہدی، تفسیر امام ناصری اور تفسیر امام مجاہد کے علاوہ ایک نام تفسیر خواجہ شفیق بلخی بھی ملتا ہے۔

---

[1] دُررِ نظامیہ (باب ۲۸) ص ۲۴۰، سیر الاولیاء / ۱۰۰ [2] افضل الفوائد (اردو ترجمہ) ۹ [3] دُررِ نظامیہ (باب ۱۳) ۱۲۱، ۱۲۰ [4] اخبار الاخیار ص ۱۲۱
[5] افضل الفوائد ۸۰ [6] فوائد الفواد ۱۹۸

قند کی کتابوں میں ابو اللیث سمرقندی کے رسائل اس زمانے میں بہت مقبول تھے۔ ایک موقع پر صرف اس طرح حوالہ دیا ہے: خواجہ امام ابو اللیث سمرقندی کی کتاب میں دیکھا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اتنی معروف تصنیف تھی کہ اس کا نام لینے کی ضرورت بھی نہیں۔ دوسری کتابیں ہدایہ کے علاوہ صلوٰۃ مسعودی کا نام بھی صرف ایک مجلس میں آیا ہے۔ اس کے مصنف شیخ ابو عطا مسعود بن محمود بن یوسف سمرقندی ہیں۔ خواجہ حمید الدین ناگوری کی دو کتابوں کے نام آئے ہیں۔ ایک راحت الارواح دوسری لوائح۔ ایک اور تصنیف تحفۃ العارفین کا نام بھی مجلسوں میں آیا ہے اور ایک موقع پر اسے مولانا علاء الدین اصولی کی تصنیف بتایا ہے۔ بظاہر مولانا علاء الدین اصولی بدایونی ہو سکتے ہیں جن سے حضرت نظام الدین اولیاء نے فقہ کی کتاب قدوری کا درس بھی لیا تھا۔ تذکرۃ الاولیاء نامی کتاب جس کا حوالہ دو بار آیا ہے حضرت شیخ فرید الدین عطار کی مشہور زمانہ تالیف ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا حوالہ حضرت نظام الدین کے دوسرے ملفوظات مثلاً فوائد الفواد یا دُرر نظامیہ میں نہیں ملتا۔ اگرچہ بعض باتیں صریحاً اس سے ماخوذ ہیں یا دونوں کتابوں میں بڑی حد تک مشترک ہیں۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ افضل الفوائد کے نصف اول میں کتابوں کے حوالے زیادہ ہیں۔ اور آخری نصف حصے میں بہت کم ہو گئے ہیں۔ راحت المحبین جو اسی کا حصہ دوم ہے اس میں اور بھی کم ہیں۔

افضل الفوائد میں ۱۵، ھ کی میں مجلس قلم بند ہوئی ہیں اور فوائد الفواد جلد چہارم میں اسی سن کی (۱۱) مجلسوں کے ملفوظات ہیں۔ دونوں کتابوں کے مشمولات اور مطالب کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معیار و اعتبار کا نمایاں فرق نظر آئے گا۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ امیر حسن دہلوی ایک ہی ماہ و سال میں جو ملفوظات قلمبند کریں گے ان میں دقیق مضامین اور بہترین علمی نکات ہوں اور اسی زمانے میں امیر خسرو جن ملفوظات کو لکھیں وہ معمولی مضامین اور قصص الانبیاء وغیرہ پر مشتمل ہوں؟

دوسرا پہلو ان کتابوں کے اسلوب نگارش کا ہے۔ امیر حسن دہلوی نے حتی الامکان وہی الفاظ قلم بند کئے ہیں جو حضرت نظام الدین اولیاء کی زبان مبارک سے نکلے ہیں[۱]۔ اس لحاظ سے فوائد الفواد صرف اس دور کی معیاری فارسی گفتگو کا نمونہ ہے بلکہ اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کا طرز کلام کیا تھا۔ اس کے برخلاف اگر امیر خسرو نے بطور خود یعنی اپنے الفاظ میں افضل الفوائد کے مطالب کو لکھا ہے تو اس کی فارسی امیر خسرو کے اسلوب اور طرز نگارش سے کمتر ہے اور ان کی دوسری سب تصانیف سے مختلف بھی ہے۔ خزائن الفتوح میں تو وہ بہت ہی مرصع نگار بن گئے ہیں۔ لیکن اعجاز خسروی کے رسائل میں انھوں نے فارسی نثر کے جو نمونے پیش کئے ہیں ان میں سے کسی کا انشائی بھی افضل الفوائد سے نہیں ملتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ امیر خسرو نے جیسا سادہ ہی قلم بند کیا ہے جو ملفوظات معین ملفوظات کرتے ہیں تو افضل الفوائد کے اسلوب کو فوائد الفواد کے طرز سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہونا چاہئے۔ جن لوگوں نے اس تالیف کے جعلی ہونے کا دعویٰ کیا ہے ان کی دلیلوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

افضل الفوائد اور راحت المحبین میں حضرت نظام الدین اولیاء یا آپ کے شیوخ یا معاصرین کے بارے میں کوئی قصہ ایسا نہیں ہے جو دوسری کتابوں میں نہ ملتا ہو یا اس میں زیادہ صحت، وضاحت یا جزئی تفصیلات کے ساتھ درج ہو۔ البتہ بہت سے مضامین وہ ہیں جو دوسری کتابوں میں بھی تقریباً اسی انداز سے بیان ہوئے ہیں۔ یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جائے گا۔

افضل الفوائد میں ہے کہ ایک مرتبہ مولانا کیتھلی میرے پاس آئے کھانا موجود تھا۔ مشرف کو کہا کہ لاؤ۔ اس نے لانے میں دیر کر دی۔ میرے ہاتھ میں ایک چھوٹی چھڑی تھی اس کی پیٹھ پر ماری۔ مولانا کیتھلی نے اس طرح آہ کی کہ گویا انھیں کی پیٹھ پر لگی ہے۔ میں نے پوچھا آپ نے آہ کیوں بھری؟ فوراً پیٹھ سے کرتا اٹھا کر مجھے دکھایا۔ جب میں نے نگاہ کی تو دیکھا اس چھڑی کا اثر آپ کی پیٹھ پر موجود تھا[۲]۔ یہ واقعہ سیر الاولیاء وغیرہ میں بھی بیان ہوا ہے۔

اسی طرح افضل الفوائد میں ہے، سلطان شمس الدین انار اللہ برہانہ کی یہ عادت تھی کہ آدھی رات کے وقت عبادت میں مشغول ہوتا اور جب جاگتا تو خود پانی لے کر وضو کرتا۔ غلاموں میں سے کسی کو نہ جگاتا۔ جب اس سے وجہ پوچھی گئی تو کہا کہ اپنی تکلیف دوسرے کو کیوں دوں کہ انھیں نیند سے جگاؤں[۳]۔

فوائد الفواد میں یوں ہے: 'از عقیدۂ خوب او در التمش، حکایت فرمود کہ شبہا بیدار بودے و چوں از خواب بیدار شدے وضو ساختے دوگانہ گزاردے، و باز در خواب شدے و ہیچ کس را بیدار نکردے[۴]۔'

افضل الفوائد میں ہے کہ خواجہ بایزید بسطامی کا ایک ہمسایہ یہودی تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟ تو اس نے کہا اگر مسلمانی وہ ہے جو بایزید کو حاصل ہے تو مجھ سے ہو نہیں سکتی اور اگر یہ ہے جو تمہیں حاصل ہے تو اس کے حاصل کرنے سے مجھے شرم آتی ہے[۵]۔"

فوائد الفواد کی ۴ رمضان ۷۱۰ھ کی مجلس میں ہے: "حکایت فرمود کہ یہودے در جوار رحمۃ بایزید بسطامی قدس اللہ سرہ العزیز خانہ داشت۔ چون خواجہ بایزید نقل کرد آن یہود را گفتند کہ تو چرا مسلمان نمی شوی؟ یہود گفت چہ مسلمان شوم اگر اسلام آنست کہ بایزید داشت آن اسلام از من نیاید و اگر اینست کہ شما دارید مرا ازین اسلام عار می آید[۶]۔"

ان دونوں کتابوں سے پہلے یہ واقعہ شیخ فرید الدین عطار کے تذکرۃ الاولیاء میں اس طرح آیا ہے: "گبرے را گفتند کہ مسلمان شو، گفت اگر مسلمانی این است کہ بایزید می کند من طاقت ندارم و نتوانم کرد، و اگر اینست کہ شما می کنید بدین ہیچ اعتقاد ندارم[۷]۔"

ایک مجلس میں امیر حسن علاء سجزی حاضر ہیں اور انھوں نے 'رباعی' پڑھی ہے[۸] مگر وہ رباعی کے وزن میں نہیں ہے۔ امیر حسن یا امیر خسرو جیسے شاعروں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اوزان رباعی سے ناواقف ہوں گے۔

---

[۱] امیر خورد کا بیان ہے کہ "بیں تقریر سلطان المشائخ بقدر امکان رعایت کرد" (سیر الاولیاء/ ۳۰۸) [۲] افضل الفوائد ۱۴ [۳] افضل الفوائد ۱۴ [۴] فوائد الفواد ۲۵۹ [۵] افضل الفوائد ۱۱ [۶] فوائد الفواد: ۲۰۸ ، [۷] تذکرۃ الاولیاء ۹۸ (مطبع حیدری لاہور، ۱۳۰۱ھ)، [۸] افضل الفوائد ۲

افضل الفوائد میں ایک موقع پر یہ شعر آیا ہے۔[1]

داری سر ما وگرنہ دور از برما
ما دوست کشیم و تو نداری سر ما

یہی شعر فوائد الفواد میں بھی دو جگہ آیا ہے[2] مگر یہ ایک رباعی کے آخری دو مصرعوں میں پہلی بار شیخ فریدالدین عطارؒ کے تذکرۃ الاولیاء میں ہے[3]

خون ریز بود ہمیشہ در کشور ما
جان خود بود ہمیشہ در محشر ما
داری سر ما اگر نہ دور از بر ما
ما دوست کشیم و تو نداری سر ما

افضل الفوائد میں نظامی گنجوی کے یہ دو شعر حضرت نظام الدین اولیاء کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں[4]

چو مست عشق گشتی ملک را همه برهم زن
ستون عرش در جنبان طناب آسمان در کش
طریقش نے قدم می زن صدیش نے زبان میگو
حجابش بے نظر می بین شرابش بے دہان می کش

اور ۳ جمادی الثانیہ ۷۱۲ھ کی مجلس میں جو فوائد الفواد میں ہے[5] آپ نے اس غزل کا صرف مطلع پڑھا ہے اور فرمایا کہ ایک دن حضرت بابا فریدؒ نے تمام دن پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ افطار کا وقت آگیا۔

نظامی ایں چہ اسرار است کز خاطر عیاں کردی
کسے سرش نمی داند زباں درکش زباں درکش

پھر رات بھر اسی کو پڑھتے رہے۔ حتیٰ کہ سحری کا وقت آگیا" یہی ملفوظ درر نظامیہ میں بھی ملتا ہے[6]

افضل الفواد[7] میں حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمۃ کی آخری علالت اور وفات کا حال بھی ہے۔ اور وہ دوسرے تمام ماخذوں سے قطعاً مختلف ہے۔

"فرمایا کہ خواجہ فرید قدس اللہ سرہٗ العزیز نے پانچویں محرم کو انتقال فرمایا اور یہ اس طرح ہوا کہ جس رات انتقال ہونے والا تھا مجھے یاد فرمایا کہ مولانا نظام الدین موجود نہیں اور یہ بھی فرمایا کہ میں بھی اپنے خواجہ شیخ قطب الدین کے انتقال کے وقت موجود نہیں تھا۔ وہ بھی موجود نہیں (پھر فرمایا کہ جب آپ کے انتقال کا وقت قریب آیا تو اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ اور صبح سے دس بجے تک پانچ مرتبہ قرآن شریف پڑھا۔ پھر ذکر الٰہی میں ایسے مشغول ہوئے کہ آپ کے ہر بُن مو سے خون جاری ہوا اور جو قطرہ خون کا زمین پر گرتا اس سے اللہ کا نقش زمین پر بنتا) اور یہ رباعی پڑھ کر سجدہ کرتے اور پھر سر اٹھا لیتے۔

بوے خوش تو ز ہر چمن می شنوم
شرح غم تو ز خویشتن می شنوم
گر ہیچ بیاسد کہ کسے بہ نام
تا نامِ تو گوید و من می شنوم

جب ذکر سے فارغ ہوئے تو لوگ نزدیک آ بیٹھے آپ نے انھیں فرمایا کہ باہر جا کر بیٹھو جس وقت میں بلاؤں گا اندر آ جانا دیر بعد آواز آئی کہ اب دوست سے ملے گا۔ وہ سب اندر آئے۔ خواجہ صاحب کو کسی اور ہی عالم میں متغیر پایا۔ جب عشاء کا وقت قریب ہوا تو آپ نے چار رکعت عشاء کی نماز ادا کی پھر سجدہ میں سر رکھ کر جان حق کے حوالے کی پھر آواز آئی جیسا جو دھن کے سامنے باسدو شاکر رائے زمین پر امانت بھی سو حق کے سپرد ہوئی۔"

اس بیان میں جس عبارت کو ہم نے خطوط وحدانی میں بند کر دیا ہے مجھے اس کے الحاقی ہونے کا شبہ ہے کیونکہ ایسی مبالغہ آمیز باتیں حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنی مجلسوں میں بیان نہیں کیں جو دوسری جعلی ملفوظات کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

اسی طرح ایک مجلس میں حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو صحابی ظاہر کیا ہے حالانکہ وہ تابعین میں شمار ہوتے ہیں داتا گنج بخش کی کشف المحجوب حضرت کے مطالعے میں رہتی تھی۔ اور فوائد الفواد میں اس کا حوالہ بھی آیا ہے۔ اس میں بھی خواجہ حسن بصریؒ تابعی کہا گیا ہے۔ مگر افضل الفوائد میں ہے۔

"بعد ازاں خواجہ حسن بصری رضی اللہ عنہ کے برکت حاصل کرنے کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی تو زبان مبارک سے فرمایا کہ خواجہ صاحب ابھی بچے ہی تھے کہ خاتم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے کوزے سے پانی پی لیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اس کوزے سے کس نے پانی پیا؟ عرض کیا کہ حسن نے فرمایا چونکہ اس نے کوزے سے پانی پی لیا ہے اس لئے علم اس میں اثر کرے گا۔[8]"

دوسرے موقع پر یہ بیان ہوا ہے کہ خواجہ حسن بصری کی والدہ حضرت ام سلمہ ام المؤمنین کی متولی تھیں یہ صحیح ہے۔ لیکن حسن بصری کی ولادت حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں (غالباً ۲۱ھ یا ۲۲ھ) ہوئی تھی۔ اس لئے آپ کے صحابی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ روایات میں یہ آیا ہے کہ جب آپ کا شیر خوارگی کا زمانہ تھا آپ کی والدہ حضرت ام سلمہ اپنا دودھ پلا دیا کرتی تھیں اس کی برکت سے آپ کی حکمت و فصاحت کا مرتبہ ہوا[9]

خواجہ حسن بصری کا نام فوائد الفواد میں صرف پانچ جگہ آیا ہے[10] مگر افضل الفوائد میں متعدد بار آپ کا تذکرہ ہوا ہے[11] اور اس میں بیشتر وہ روایات و حکایات ہیں جو شیخ فریدالدین عطارؒ کے تذکرۃ الاولیاء میں بھی ملتی ہیں[12]

افضل الفوائد[13] میں ہے"۔ فرمایا کہ میرے شیخ الاسلام فریدالحق والدین قدس اللہ سرہٗ

---

[1] افضل الفوائد ۲۵، [2] فوائد الفواد ص ۴۷-۵۰، [3] تذکرۃ الاولیاء ۶ [4] افضل الفوائد ۶۹، [5] فوائد الفواد ۱۶۴، [6] دُرر نظامیہ (ق ۲) ص ۲۲۸-۲۲۹، [7] افضل الفوائد ۹۳، [8] افضل الفوائد ۸۹ (یہی عبارت تذکرۃ الاولیاء/۱۸ میں ملتی ہے) [9] طبقات ابن سعد جلد ۷، ص ۱۵۲-۱۷۸ (طبع بیروت ۱۹۵۸) [10] فوائد الفواد ص ۱۱۹-۱۲-۱۳۸-۱۸۶-۲۲۶ [11] مثلاً صفحات ۸۹ وغیرہ [12] تذکرۃ الاولیاء ص ۱۲-۱۸ [13] افضل الفوائد ۴۸

روایت مبارک سے سامنے ہے کہ ایک بار مغلوں نے نیشاپور پر حملہ کیا تو اس شہر کے خلیفہ نے کسی کو خواجہ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجا کہ دعا کریں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا اب دعا کا وقت گزر چکا ہے۔ اب تقدیر پر شاکر رہ کر بلائے الٰہی کے لئے مستعد رہو۔" یہ روایت بھی فوائد الفواد میں ۱۰ ربیع الآخر ۷۰۸ھ کی مجلس میں بیان ہوئی ہے۔ "در ایام خروج کفار تتار شد چوں بلائے معین بہ نشاپور رسید بادشاہ ہے کہ آنجا بود کس بر شیخ فریدالدین عطار فرستاد کہ دعائے بکن۔ او جواب گفت کہ وقت دعا گذشت وقت رضا است یعنی بلائے خدا نازل شد حالا رضا باید داد"

افضل الفوائد[1] کی مکرر روایتوں میں سے ایک یہی ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے ایک بار حوض شمسی میں ہاتھ ڈال کر گرم گرم کاک (روٹیاں) نکال لی تھیں۔ اسی دن سے ان کا لقب 'کاکی' ہو گیا۔ حالانکہ حضرت نظام الدین نے دوسرے مواقع پر کاکی کی وجہ تسمیہ کے لئے دوسری روایات بیان کی ہیں۔ اور اس روایت میں افضل الفوائد منفرد ہے۔

دوسری جلد کا نام راحت المحبین ہے اور جیسا کہ ہم نے شروع میں اشارہ کیا ہے، اس کتاب کا حوالہ شمائل الاتقیاء میں متعدد بار آیا ہے لیکن پروفیسر محمد حبیب نے اپنی کتاب میں افضل الفوائد یا راحت المحبین کا قطعاً نام نہیں لیا۔ وحید مرزا نے افضل الفوائد پر ایک نوٹ لکھا ہے اور اس سے احتراز کیا ہے۔ مگر ان کی کتاب میں راحت المحبین کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے وجود سے بے خبر ہیں اور جن قلمی نسخوں تک ان کی رسائی ہوئی ہے ان میں راحت المحبین شامل نہیں رہی ہوگی۔ اس میں صرف سترہ (۱۷) مجلسوں کا حال ہے۔ جن میں سے پہلی مجلس کی تاریخ ۲ رجب ۷۱۹ھ بتائی گئی ہے اور آخری مجلس ۵ محرم ۷۲۱ھ کی ہے۔ حاضرین محفل میں پندرہ (۱۵) حضرات کے نام آئے ہیں جن میں اکثر وہی ہیں جو افضل الفوائد کی مجلسوں میں بھی ملتے ہیں۔ امیر حسن علا سجزی کا نام صرف دو جگہ آیا ہے[2]۔ مولانا جلال الدین، خواجہ قطب الدین ہانسوی، شیخ عثمان سیاح اور شیخ حسین نبیرۂ خواجہ بختیار کاکی بھی حاضر محفل میں ہیں۔

راحت المحبین میں کتابوں کے حوالے حیرت انگیز حد تک کم ہیں۔ پوری کتاب میں صرف سات حوالے آئے ہیں۔ اسرار الاولیاء، دیباچہ قصص الانبیاء، حالات خواجہ حسن بصری، تنبیہ الغافلین، مسعود بن سعد سلمان وغیرہ؛ ان میں ہی، تبیہ الواللیث سمرقندی، فتاویٰ اور اسرار الاولیاء۔ لیکن یہ آخری کتاب غالباً اس مجموعہ ملفوظات سے مختلف ہے جسے حضرت سید بدرالدین اسحاق دہلوی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب کی غلطی ہو اور یہاں بھی نام "انادالاولیاء" کا رہا ہو، اس صورت میں کل حوالے صرف چھ ہی رہ جائیں گے۔

راحت المحبین میں گیارہ مجلسیں تو صرف قصص الانبیاء ہی پر مشتمل ہیں۔ یہ زیادہ تر ان کتابوں کے مضامین ہیں جو حالات انبیاء میں لکھی گئی ہیں اور اسلام کے ابتدائی عہد ہی سے بہت مقبول رہی ہیں۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ خدا نے ہر قوم میں انبیاء کو مبعوث کیا تھا۔ لیکن صرف چند پیغمبروں کے نام قرآن میں ملتے ہیں۔ اور ان میں بھی صرف بعض کا نام ہی آیا ہے اور کوئی تفصیل نہیں ہے۔ لیکن جن نبیوں کا تذکرہ عہد نامہ قدیم میں موجود ہے ان کے حالات یہودی علماء نے قصص و اساطیر کی شکل میں جمع کر رکھے تھے۔ بعد کو مسلمانوں میں بھی وہی شائع ہو گئے اور ان کی نیم تاریخی حیثیت کے پیش نظر علماء اسلام نے انہیں "اسرائیلیات" کا نام دیا ہے۔ پہلے یہ قصے وعظ و تذکیر کی محفلوں میں بیان کئے جاتے تھے اور جب عہد بعد میں آیا تو ان پر مشتمل کتابیں بھی معرض وجود میں آ گئیں۔ راحت المحبین میں وہی سب مواد ہے۔ مگر اس کے وجود پر اس لئے حیرت ہے کہ جس محفل میں مولانا شمس الدین یحییٰ، مولانا فخر الدین زرادی، مولانا وجیہہ الدین پائلی اور مولانا نصیر الدین محمود چراغ دہلی جیسے عالم فاضل موجود ہوں وہاں ان قصوں کے بیان کرنے کی افادیت کیا ہو سکتی ہے؟

یہاں ہم نے دونوں کتابوں کا تعارف قدرے تفصیل سے پیش کر دیا ہے۔ جن دلائل کی بنیاد پر ان کتابوں کو جعلی سمجھا گیا ہے ان کے ساتھ ہی وہ پہلو بھی پیش کر دیئے ہیں، جن سے ان کا پایۂ استناد معتبر ہوتا ہے۔ لیکن جب تک دونوں کتابوں کے متعدد قلمی نسخے سامنے نہ ہوں، فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں قطعاً جعلی سمجھا جائے یا امیر حسن کی مستند تصانیف میں ان کا شمار کیا جائے۔ ایک دشواری یہ ہے کہ ان کا متن تحقیق کے ساتھ مرتب ہو کر ابھی تک نہیں چھپا ہے۔ اور جو تراجم شائع ہوئے ہیں ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] فوائد الفواد ۹۰ [2] افضل الفوائد ۲۴ [3] راحت المحبین (اردو ترجمہ) ۱۳۱، ۱۵۱

بشکریہ نیا دور

تحفۂ ملکیت اوقاف سہ ماہی	
مقام اشاعت	۵۰ سردار پٹیل مارگ الہ آباد/ انالکنٹ
وقفۂ اشاعت	سہ ماہی
رنٹر پبلشر ایڈیٹر	حکیم اجمل خاں۔ ۵ سردار پٹیل مارگ انالکنٹ
قومیت	ہندوستانی
ملکیت	پنجاب وقف بورڈ (اوقاف) انالکنٹ

میں حکیم اجمل خاں اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط
اجمل خاں

سید صباح الدین عبدالرحمن

امیر خسرو کی وطن شیفتگی

امیر خسرو دنیا کے ان ارباب کمال میں تھے، جن کو عبقری کہا جاتا ہے، قدرت کاملہ نے ان کو عبقریت کے تمام لوازم و اوصاف سے نوازا۔ وہ ایک اچھے فرزند، ایک اچھے باپ اور ایک اچھے انسان تھے، شاہی دربار کے ایک بہت ہی محبوب ہم نشین اور ندیم رہے، ایک عظیم قصیدہ گو، ایک عظیم مثنوی نگار، ایک عظیم غزل گو، ایک عظیم نثر نگار، ایک عظیم صوفی اور ایک عظیم ماہر موسیقی بھی تھے۔ جب ان کے والد بزرگوار سیف الدین ایک لڑائی میں جاں بحق ہوئے تو ان کی موت کو تہ دل سے محسوس کیا اور اپنے رنج و غم کا اظہار یہ لکھ کر کیا۔

سیف از سرم رفت و دلم بس دو نیم ماند
دریائے من روان شد و در یتیم ماند[1]

یعنی آنسو

اپنی ماں کا جب ذکر کرتے ہیں تو "زیر قدم مادر بہشتی شدم" لکھتے ہیں[2]

ان کے ایک بیٹے محمد کی وفات ان کی زندگی میں ہو گئی تھی۔ اس کی یاد میں ایک بہت ہی پُر درد مرثیہ لکھا جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

یا رب این شب چہ شب آمد کہ دلم گم شد
چشم بہار کے مراد زدستم گم شد[3]

انسان کی حیثیت سے ان کا مسلک یہ تھا کہ ہر کس و ناکس سے میٹھی زبان سے پیش آنا چاہیے۔ کہتے ہیں۔

خسرو گر انگبیں می خواہی از شکرستان
اول اندر کام بیرون کن زبان خویش را[4]

اپنی زبان کی شیرینی کی وجہ سے اپنے تمام معاصر سلاطین کے دربار کے [illegible] رہے، سلاطین خواہ مذہبی، یا سنگدل اور سخت مزاج یا رنگین طبع رہے، سب ان کو اپنا ندیم خاص بنانے میں مسرت محسوس کرتے۔ اسی زبان حال سے کہتے۔

یوسف عہدی اگر خسرو تو وصف گرت
در دم ملک دو عالم رایگاں بستانمت[5]

جب قصیدہ نگاری میں طبع آزمائی کرنے لگے تو انوری، خاقانی اور کمال اصفہانی کو یہ کہہ کر للکارا۔

تا کند گردون بہ چشم انوری
خاک من کحل سپاہانی شدہ است[6]

خاقانی ار ز خاک برآید بہ عہد زمان
انصاف این قصیدہ غرہ بر ورزد[7]

مثنوی کہنے پر آئے تو قران السعدین میں لکھتے ہیں۔

اوج خیالم بہ قمر داد طبع
ملک گرفتہ ز سماوات شمع[8]

اپنی مثنوی مجنون و لیلیٰ میں کہتے ہیں۔

زندہ است ہمی اوستادم
ور ہست مثنوی حساب یادم[9]

مطلع الانوار میں یہ بھی کہہ گئے ہیں۔

کوکبۂ خسروم شد بلند
زلزلہ در گور نظامی فگند[10]

اور جب اپنی غزلوں کی نغمہ سرائیوں اور زمزمہ سنجیوں سے لوگوں کو محظوظ کرنے لگے تو

---

[1] غرۃ الکمال، دیباچہ، قلمی نسخہ کتب خانہ دارالمصنفین [2] ایضاً [3] وسط الحیوۃ، علی گڑھ اڈیشن، ص ٧ [4] دیوان امیر خسرو دہلوی مرتبہ ڈاکٹر ابوالحسن ص ٩٥ [5] ایضاً ص ١٢٩ [6] بزم مملوکیہ از راقم صفحات ص ٢٩٢ [7] ایضاً ص ٢٩٦ [8] قران السعدین علی گڑھ اڈیشن ص ٩٥ [9] مجنون و لیلیٰ علی گڑھ اڈیشن ص ١٦٩ [10] شعر العجم حصہ دوم ص ١٤٥۔

ساتھ طور پر دعویٰ کیا ۔

خسرو سرمست اندر ساغر معنی ریخت
شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

اور جب ہندی شاعری کا ذکر ہوا تو معلوم نہیں کتنے ہندی گیت دوہے، مکرنیاں،
چو پاتیاں اور پہیلیاں لکھ کر فخر کے ساتھ یہ آواز بلند کی ۔

چو من طوطی ہندم ار راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم[1]

اور جب نثر لکھنے پر آمادہ ہوئے تو اعجاز خسروی کی پانچ جلدیں جن میں ایک ہزار ایک صفحے
اپنی سمجھ لکھ کر اپنی قوت تحریر کی ساحرانہ دکھا دی اور جب تصوف کی راہ پر گامزن
ہوئے تو جس عشق مجازی کا راگ اپنی غزلوں میں الاپنا شروع کیا تھا، وہ عشق الٰہی سے
بدل گیا جس میں ربنہ ربنہ ایسی سوز پیدا ہوتی کہ ان کے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین
اولیا فرمایا کرتے کہ حشر کے روز مجھ کو امید ہے کہ اس ترک بچے کے سوز سینہ کی وجہ سے
بخش دیا جاؤں گا،[2] اور بقول مولانا شبلی امیر کا ہر حرف شعلہ بن کر آتا ہے وہ اپنی جادو
بیانی کی ترزبانیاں ہیں[3] اور جب فن موسیقی کی تحصیل میں مشغول ہوئے تو بقول محمد حسین آزاد
ان کی طبیعت ایک طرف نئی نئی ایجادیں بھی کرتی تھی، جیسے طرب خیال ترانہ تک لکھے ہیں
کہ انھوں نے عام بول چال کی ہندی میں جو گیت لکھے وہ نہ صرف ان کی زندگی میں مقبول
ہوئے بلکہ ایسی مثال نہیں ہے کہ جو گیت چھ سو برس پہلے لکھے گئے، وہ اب تک مقبول ہیں
اور وہ کسی نہ کسی رسم کے سبب ابھی تک عوام میں گائے جاتے ہیں[4]

ان تمام محاسن کے ساتھ ان کا سامان وصف یہ بھی رہا کہ جس طرح ان کو اپنے ساتھی
آقاؤں سے والہانہ لگاؤ رہا جس طرح ان کو اپنے فن شاعری سے وارفتگی رہی یا جس طرح
ان کو اپنے مرشد سے عشق رہا اسی طرح ان کو اپنے وطن، اور اس کی ہر چیز سے شیفتگی، سرشاری
اور سرمستی رہی ۔

دھلی کے فراق سے بے چینی

ان کی پیدائش شمالی ضلع ایٹہ (پٹیالی) میں ۱۲۵۳ء میں ہوئی، لیکن ان کی نشوونما
دہلی میں ان کے نانا عماد الملک کے یہاں ہوئی، جو سلطان شمس الدین التتمش کے عہد سے
بلبن کے دور تک عرض ممالک کے عہدہ پر فائز تھے، نانا کی وفات کے بعد پہلے سلطان غیاث الدین
بلبن کے بھتیجے کشلی خاں کے دامن دولت سے وابستہ ہوئے، پھر بلبن کے لڑکے شہزادہ
بغرا کے یہاں سامانہ چلے گئے، وہ ۱۲۸۰ء میں اپنے باپ کے ساتھ لکھنوتی گیا تو اس کی معیت
میں خسرو بھی تھے، لکھنوتی پہنچے تو دھلی کو یاد کرکے تڑپنے لگے، ان کے دوستوں میں اس
زمانہ کے مشہور شاعر شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر نے ان کی ہر قسم کی دلجوئی کی لیکن
وہ وہاں نہ رُکے، اور جب سلطان غیاث الدین بلبن کے ساتھ دہلی واپس ہوئے تو
اپنے دیوان غرۃ الکمال (نوشتہ ۱۲۹۳ء) کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ لکھنوتی سے نکلے تو
ان کو معلوم ہوا کہ گویا حضرت یوسف چاہ زنداں سے نکل آئے ہیں، جب وہ دہلی پہنچے تو
ان کو محسوس ہوا کہ حضرت یوسف مصر پہنچ گئے ہیں یہیں سے ان کی وطنی محبت بیدار ہوئی
جو آگے برابر بڑھتی گئی ۔

لکھنوتی سے واپسی کے بعد سلطان غیاث الدین کے بڑے لڑکے شہزادہ محمد سلطان
کے ندیم خاص ہو کر اس کے ساتھ ملتان چلے گئے، ان کے ساتھ ان کے محبوب دوست
امیر حسن دہلوی بھی تھے، شہزادہ محمد سلطان کی صحبت میں ان کے شاعرانہ ذوق کی تشنگی
بجھتی رہی، وہ ان کو اپنی عنایتوں سے نوازتا رہا، لیکن ان کو دہلی کی یاد برابر ستاتی رہی،
اس کو وہ قبۃ الاسلام کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس کی سربفلک عمارتوں، محل سراؤں تالابوں
مزاروں، باغوں کی خوشبوؤں اور یہاں کے حسینوں اور مہ پاروں کو یاد کرکے ملتان میں بے
چین ہو جاتے، ملتان سے دہلی سال میں ایک بار آتے، اور جب یہاں سے رخصت ہو جاتے
تو دہلی چھوڑتے وقت ان کو انتہائی شاق گذرتا تھا[5]

بیرونی حملے پر اظہار تشویش

ملتان ہی کے قیام کے زمانے میں چنگیز خانیوں نے ہندوستان پر حملہ کیا، اس موقع پر
خسرو کی وطنی محبت میں وسعت پیدا ہوتی نظر آتی ہے : دہلی کے بجائے اب پورے ہندوستان[6]
کے جاں نثار بن کر ان بیرونی حملہ آوروں کے خلاف انھیں جذبات کا اظہار کرتے
ہیں جو ایک محب وطن کو کرنا چاہئے، ہندوستان پر چنگیز خانیوں کے حملے کو آسمانی بلا اور
سیل فتنہ قرار دیتے ہیں ۔

واقعہ است این یا بلائے کز آسمان آمد پدید
آفت است این یا قیامت کز جہان آمد پدید
راہ زد بنیاد عالم را و سیل فتنہ را
رخنہ کامسال در ہندوستان آمد پدید[7]

ہندوستانی فوج کی نبرد آزمائی پر اظہار مسرت

شروع میں ہندوستان کی فوج نے ان بیرونی دشمنوں کو پسپا کیا تو بہت خوش
ہوتے لکھتے ہیں ۔

کہ ہندوستانی سواروں کا دستہ باہر نکل کر ان دشمنوں کے خلاف کوہ قاف
بن کر کھڑا ہوگیا ۔

رخش بیروں راند بر عزم مصاف
راست کردہ لشکرے چوں کوہ قاف
قاف تا قاف از الف ہائے علم
کردہ طغرائے شہنشاہی رقم[8]

---

[1] دیباچہ غرۃ الکمال قلمی نسخہ دارالمصنفین [2] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ص ۲۳۹ [3] شعرالعجم جلد ۲ ص ۱۲۹ [4] آب حیات ص ۹۸
[5] ڈسکوری آف انڈیا ص ۵۸ ۔ ۲۵۷
[6] دی لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو دہلوی از وحید مرزا ص ۵۱ [7] وسط الحیوۃ علی گڑھ ایڈیشن، ص ۱۶۱ [8] ایضاً ص ۱۵ ۔

طرح کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ان ہندوستانی سواروں کی تیزی اور حرکت سے تیر کے جسم پر بھی لرزہ طاری ہو گیا۔

جنبش تیزی سواران دلیر
لرزہ می افگند در اندام تیر[1]

ہندوستان کی فوج کی تلواروں کو کافر سوز کہہ کر خوش ہوتے ہیں۔

ہندوستان را کہ رسد از لشکر کارزار
از تیغ کافر سوز ناہست آب اندر رسانی[2]

تاتاریوں کے حملے روکنے کے لئے ہندو مسلمان جس طرح ایک ہو گئے اس یکجہتی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

بیرون شدند سے از سر ترک و ہندو
کہ ہندوستان با خراسان یکے سد[3]

تاتاریوں نے جب ہندوستان پر حملہ کیا، لیکن وہ بری طرح پسپا ہو کر اپنی طرف بھاگے، تو لکھتے ہیں کہ وہ اپنی خوبصورت کے ساتھ ٹڈیوں کی طرح صف آرا ہوئے، مگر بھاگے تو ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئے :

گرچہ در ساتے معل یا تیز بوم در روے توم
صف کشیدہ چون ملخان از خراسان می رسد
لیک رزوقت گریز از تیر کسو را گرسا ہ
ریزہ ریزہ می شود آن گہ بکیمان می رسد[4]

ہندوستان کی طرف سے شہزادہ محمد سلطان نے ان تاتاریوں کو پہلے جس طرح پسپا کیا اس سے خوش ہو کر لکھتے ہیں کہ شہزادے نے اپنی تلوار سے مورو ملخ کی چنگیز خانی فوج پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں وہ فرار ہوتے ہوئے ملک پر خار چیونٹیوں کی طرح ہلاک ہو گئے۔

دست او بسمر برا در گسند چنگیز خان زمار
چون بہ عزم رزم سوئے لشکر ان کافر شود
گر بہ مد الستان از لشکر ہائے مور و ملخ
پاک سود مور را در وقت مردن پر شود[5]

ہندوستان کی فوج ان حملہ آوروں کے خلاف جس بہادری اور مردانگی سے لڑی اس کا تصور اس طرح کھینچتے ہیں کہ ان کے جنگجوؤں نے بہادروں کے ہاتھ پیر کاٹ کر رکھ دیا، ان کے گرزوں نے پہلوانوں کو پسپا کر کے رکھ دیا، وہ سروں کی طرح ہر طرف بڑھے اور نیزوں کا ڈھیر لگا، ہر سمت سے خون کا دریا بہنے لگا، دریائے روسی جاری رہی، جسموں کی رگوں سے آہ و زاری بلند ہونے لگی، اور قیامت کا سماں بندھ گیا۔

از برگ خنجر پہلو ستگاف
پارہ می شد مرد را پہلو نے ناف
در طراق گرزہ پولاد دست
پہلوئے ہر پہلوانے می شکست

کشتہ می شد چون ز تیری آمدے
منت پہلوئے زہر سو پہلوئے
سر کہ برید تیغ کسے جو
مرگ بر آب روان می تاخت گو
بر زمین از خون شدہ دریا پدید
روسی گشتہ زعالم تا بدید
از معل ہر سو فغان برخاستہ
رستخیز از جہان برخاستہ[6]

ہندوستان کی فوج کی پسپائی پر اظہار غم

مگر ایسا موقع بھی آتا جب ہندوستان کی فوج ان چنگیز خانی وحشیوں سے پسپا ہو گئی شہزادہ محمد سلطان اس معرکہ میں شہید ہوا، اس سے متاثر ہو کر ایک بہت ہی پر درد مرثیہ کہا جو سحر حلال کا درجہ رکھتا ہے اس پسپائی پر خود بھی خون کے آنسو بہاتے اور جس طرح ہندوستان کے لوگ روتے ان کی بھی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ دو چار اشعار ملاحظہ ہوں۔

چہرہ مہ بر روئے آن فرخ لقا گریستند
روز و شب بر سال آن ابدک لقا گریستند
آسمانہا با ہزاران دیدہ بر ایں زمین
ہمچو باران بہاری بر کسا گریستند
خلق ملتان مرد و زن گریہ کنان و نوحہ کنان
کوچکی ویوسی ز جابجا گریستند[7]

ملک اور تاج و تخت کے دشمنوں سے اظہار نفرت

بیرونی حملہ آوروں سے شدید نفرت پیدا ہو جاتی ہے امیر خسرو میں بھی یہی نفرت چنگیز خانیوں کے خلاف پیدا ہوئی، ان کی بہت ہی بری تصویر کھینچی ہے کہ ان کا سر گھٹا ہوا ہوتا، جس پر اون کے پر ہوتے، ان کا سر انڈے کی طرح دکھائی دیتا، ان کا چہرہ چوڑا چکلا ڈھال کی طرح معلوم ہوتا، آنکھیں ماتھے میں گھسی ہوئی ہوتیں، ناک چپٹی ہوتی، جس سے ریزش جاری رہتی، اور رسائی کے مٹر کی طرح دکھائی دیتیں، وہ جو بہ کھاتے کتے کی طرح کھانے کی چیزوں کی طرف دوڑتے میلے کچیلے بدبودار ہوتے، کوئی ان کے پاس بیٹھ جاتا، تو اس کو قے ہو جاتی، وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح ان مرتکب طیب اور انسان دشمنی کے بادشاہوں ان لوگوں کا ذکر بہت ہی نفرت سے کرتے ہیں جو ملک یا تاج و تخت کے دشمن ہوئے مثلاً سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں بنگال میں طغرل نے بغاوت کی تو ان کے لئے خسرو نے ازم، شوم، سودائی، بے دولت، اور نامبارک جیسے ناخوش گوار الفاظ لکھ کر اس نفرت کا اظہار کیا، اور اس کی پسپائی پر خوش ہوتے[8] اسی طرح ہندوستان کے اندر جو راجا بادشاہی تخت و تاج

۱؎ القرانص ۱۲۰ ۲؎ ایضاً ص ۱۲ - ۳؎ بسط الحیوٰۃ علی گڑھ ایڈیشن ص ۱۱ ۴؎ القرانص ۸ ۵؎ القرانص ۱۶۶ ۶؎ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں از راقم مقالہ ص ۸

کے مخالف ہوتے، ان کے لئے بھی سخت سے سخت الفاظ استعمال کئے، جہاتن، اگرات، سگان اور رو ملکل کے راجاؤں سے ملا ہیں۔ دہلی کی جنگ ہوتی تو ان کے خلاف ایسے ایسے ناخوش گوار الفاظ استعمال کئے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد آج کل گرانی ہوتی ہے لیکن سب ہی وہی تخت و تاج کے وفادار ہو جاتے تو پھر ان کی ادراک سے ہم مدبر ان کی مدح میں ان کا قلم طرب انگیز ہو جاتا، مثلاً ۱۳۱۱ء میں سلطان علاء الدین خلجی نے ملک کافور کی نگرانی میں دھور سمندر میں ایک فوج بھیجی، تو تلنگانہ کے راجہ رائے رایان رام دیو نے شاہی لشکر کی ہر قسم کی مدد کی، امیر خسرو نے اس کی تعریف اصل و اصیل دانا لکھ کر کی ہے، ان کے بیان کے مطابق جب شاہی لشکر دھور سمندر جاتے وقت دیوگیر سے گذرا تو رام دیو نے پورے اخلاص سے شہر کو فردوس کی طرح آراستہ کیا اور حکم دیا کہ لشکر کی ضرورت کی تمام چیزیں بازار میں موجود رہیں، اگر شاہی لشکریوں کے چلوؤں کو اپنے بستروں کے لئے سمور کے پردوں کی ضرورت ہو تو بھی فراہم کئے جائیں، دیوگیر کا بازار بھی ارم کی طرح سجایا گیا، جب شاہی لشکر کے سوار اس میں سے گذرے تو ان کو معلوم ہو رہا تھا کہ سبزہ زاروں میں سے گذر رہے ہیں، بازار کا ہر حصہ نئے انداز سے آراستہ کیا گیا تھا، صراف سونے اور چاندی کے سکے لئے بیٹھے تھے، بزازوں نے ہندوستان اور خراسان کے عمدہ کپڑوں کی تھانیں لگا رکھی تھیں، پھلوں کا انبار لگا ہوا تھا، ان میں سے بعض تو انار اور آم سے زیادہ شیریں اور رسیلے، لشکریوں کے لئے اون، چمڑے، نیل اور لوہے کی ساری چیزیں رکھی ہوئی تھیں جو بھی چاہے، مناسب قیمت پر خرید لے، عدل و انصاف ایسا تھا کہ

نہ ترکے کرد بر ہندو جفائے
نہ ہندو را مخالف بود رائے [1]

دھلی کی جدائی پر اظہار غم

امیر خسرو اپنے مربی شہزادہ محمد سلطان کی شہادت کے بعد ملتان سے دہلی آئے، تو دہلی دربار کے ایک ممتاز امیر حاتم خان جہاں کے ندیم ہوگئے، وہ ان کو شاہی لشکر کے ساتھ اودھ لے گیا تو دہلی چھوڑنے کے بعد وہ بہت روئے، اور راستہ بھر خون کے آنسو بہاتے رہے۔

بر عزم سفر عنان کشادم
خونابہ ز دیدگان کشادم
با لشکر شاہ کوچ بر کوچ
در گریہ ہمی شدم بہر کوچ [2]

اودھ کی تعریف لیکن دھلی کے لئے بے چینی

اودھ یعنی اجودھیا میں وہ دو سال تک رہے، یہاں ان کو ہر قسم کی راحت میسر تھی، حاتم خان ان کو اپنی دولت سے نوازتا رہا، ان کے اصلی وطن پٹیالی سے اودھ قریب تھا، اس لئے اجودھیا کی ہر چیز ان کو بھلی معلوم ہوتی، وہ ایک خط میں بہت ہی طرب انگیز طریقے سے لکھتے ہیں کہ یہ سرزمین سبزہ زار، مرغزار، انگور، انار، شفتالو سے کھلی، مولسری، چمپا، جوہی، کیوڑا، صندل، عود، عنبر، مشک اور کافور سے بھری ہوئی ہے یہاں کے لوگ بھی ان کو خوش مزاج، خوش اطوار، خوش گفتار اور خوش طبع معلوم ہوئے لیکن ان کا دل دہلی کے لئے تڑپتا رہا، دہلی سے دوری اور وہاں کے دوستوں کی جدائی سے ان پر جو گذر رہی تھی، اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

دل سوختہ چون چراغ گشتہ
صد جائے درون بداغ گشتہ
دورے ز دیار جان بصد زور
آبے ز دیار یار دل دور
دل رفتہ و تن ہلاک ماندہ
جان بر سر ترب ہلاک ماندہ [3]

جب ان کو وہاں سے دہلی جانے کی اجازت ملی تو لکھتے ہیں ہمہ تن شوق بن کر دہلی کی طرف چل کھڑے ہوئے، ایک تیر پیکان کی طرح راستہ طے کیا، بلکہ تیر کی طرح اڑتے چلے آئے، ایک مہینہ کے سفر میں گھوڑے کی لگام کو برابر کھینچے رہے، ہلال عید کی طرح دہلی مسرور اور شادمان پہنچے، تو جس کے گلاب کی طرح ہنس رہے تھے دوستوں کو دیکھ کر ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچی، ان کے دیدار کا جام پی کر سیراب ہوئے، ان کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے زندہ ہو کر اپنے باغ میں پہنچ گیا ہے، ایک پیاسا آب حیات کے چشمہ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ہے اور وہ مر کر پھر زندہ ہو گئے ہیں، مہربان ماں کے قدموں سے آنکھیں ملیں، جدائی سے جس ماں نے بھی اشکبار آنکھوں میں ساتھ اپنے سینے سے لگایا، اس وطنی محبت کی کیفیت خود ان کے اپنے الفاظ میں بھی ہے۔

قطع کنان راہ چون پیکان تیر
ملک جو سر آمدہ اندر گریز
یک مہ کامل بہ گشتم عنان
راہ چنین بود و کشش آن چنان
بجو مہ عید خوش و شادمہر
در مہ نوی العید رسیدم بشہر
خندہ زنان ہمچو گل و بوستان
خستہ کشادم برخ دوستان
یافتم از لذت دیدار کام
وز مے مقصود شدم سیر جام
مرغ خزاں دیدہ بہ بستان رسید
تشنہ بسرچشمۂ حیوان رسید
مردہ دل از حال بر ساں خویش
زندہ شد از دیدن خویشان خویش

ـــــــــــــــــــ

۱؎ خزائن الفتوح، علی گڑھ اڈیشن ص ۱۲۵ ۲؎ دیباچہ قران السعدین ص ۱ ۳؎ دیباچہ مثنوی قران السعدین ص ۱۱۔

دیدہ بہ ماندم بہ ہزاراں نیاز
بر قدم ماہ دو ارم سرفراز
با دو من حسنت بیمار من
چوں نظر افکند بدیدار من
پردہ ز روئے تعقب بر گرفت
اشک فشاناں سرم در گرفت[1]

دہلی کی تعریف

اودھ کے حاکم کے زمانے میں خسرو نے بغراخاں اور سلطان معز الدین کیقباد کی ملاقات کے تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، باپ بیٹے کی تاریخ ملاقات اودھ میں گھاگرا اور سرجو ندی کے بیچ میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کو خسرو نے کھا۔ کی فرمائش پر قران السعدین میں قلم بند کرکے اسی شہرت دی۔ اس کے انگریزی میں ترجمے کا تو ت دیا ہے، یہ مثنوی نظامی گنجوی کی مخزن الاسرار کے طرز پر جو ان کی گرانقدر کی اپنی جدت ذہنی، واقعہ نگاری، وصف نگاری، تمثیل آفرینی، لفظی صنعت گری اور تخیل نگاری کے لحاظ سے یہ ادب العالیہ میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، اس سے اس عہد کی بہت سی تاریخی، تمدنی، ثقافتی اور عمرانی باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ خسرو کو دہلی سے جو محبت رہی، اس کا اظہار کرنے میں ان کا قلم بہت ہی رقصاں ہوگیا ہے حمد، نعت اور بادشاہ کی مدح کے بعد ہی دہلی کی تعریف شروع کر دی ہے کہتے ہیں کہ اس کے حسن و انصاف کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، یہ عدن کی جنت ہے، اپنی صفات اور خصوصیات کے لحاظ سے باغ ارم ہے۔

حضرت دہلی کنف دین و داد
جنت عدن است کہ آباد باد
ہست چو ذات ارم اندر صفات
حرسہا اللہ عن الحادثات[2]

ایک راسخ مسلمان ہونے کے باوجود اس شہر کی محبت میں اس کو مکہ پر ترجیح دی ہے، اس کے لئے یہ شاعرانہ انداز بیان اختیار کیا ہے کہ اس بوستان کا ہر حصہ کی مکہ بھی ہندوستان کا طواف کرنے لگے، اس کی شہرت سن کر مکہ بہرہ ہو جائے یہ اپنی خصوصیات کی وجہ سے دنیا میں قبۃ الاسلام بن گیا ہے، اسی سے ساتوں آسمان کا شہرہ بڑھا ہوا ہے۔

گر شنود قصہ این بوستان
مکہ شود طائف ہندوستان
شہرہی زاں ہست کہ ...
[illegible] جدا گشت رضی اعظم

قبہ اسلام شدہ در جہاں
نسبت او قبلہ ہفت آسمان[3]

خسرو کو دہلی پیاری تھی، اس لئے اس کی ہر چیز پیاری بن گئی ہے جس کی تعریف میں ان کا قلم بے قابو ہو گیا ہے، اس کے حصار کے متعلق لکھا۔

برج بہ برج است حصارش زرز[4]

ان کے قلعہ کو مسعود بیت بتایا، اس کے کنگرہ کے بارہ میں ان کے قلم سے یہ نکل آیا ہے

کنگرہ او گشتہ زبان حملہ بیں
و آمدہ با ماہ و سما در سخن[5]

اس کے در و دیوار کی تعریف میں یہ طرح ہے کہ

برج بماند در و دیوار کس
تکیہ بدیوار و در کس کردہ است[6]

کا یک ان کا خیال دہلی کے لوگوں کی طرف چلا گیا، تو کہہ اٹھے کہ اس کے ہر گھر کا گوشہ بہشت ہے، اس کی زیب و آرائش میں بے حد رو بہ ترجیح کیے جاتے ہیں، ہر گھر میں عنبر و ستاما ہے جہاں اسی چہل پہل رہتی ہے کہ ایک آدمی کے گھر میں سینکڑوں آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

گوشہ بر خانہ بہشتے دگر
گشتہ بہ صف زر بہ تر فہ مرت
مردم یک خانہ و صد خرمی
خانۂ یک مردم و صد مردمی[7]

یکایک ان کو اسے شہر کی جامع مسجد کا خیال آیا ہوگا، تو پھر اس کی تعریف یہ کہہ کی یہ بیت الٰہی کی جامع ہے، اور اس کے خطبہ کی آواز چاند تک پہنچی ہے، اس کے گنبد میں بہت سے راز ہو رہے ہیں۔

مسجد او جامع فیض الٰہ
زمزمہ خطبہ او تا بماہ
گنبد او سلسلہ بود زراز
سلسلہ چوں کعبہ شدہ جلوہ ساز[8]

یہ مثنوی لکھتے وقت ان کے خیال کی آنکھوں کے سامنے قطب مینار آگیا ہوگا پھر لو اپنے بے ساختہ اندیال میں یہ خیال آفرینی کی ہے کہ اس مینارہ کو دیکھ کر چاند لے لی ٹوپی اتار پھینکی بلکہ اس کو دیکھتے ہی سے اس کی ٹوپی گر گئی، چاند اس کو دیکھ کر جاتے سے صبح تک نہیں سوتا ہے۔

دیدن او را بہ فلک افگندہ ماہ
ملک فتاد ستش گرہ بند کلاہ
ماہ بہ خپید ہمہ شب تا سحر
کرمہ سمتش حیلہ دار د بہ بر

ا قران السعدین علی گڑھ اڈیشن ص ۲۲۲ ۲ ایضاً ص ۲۸ ۳ ایضاً ص ۲۹ ۴ ایضاً ص ۲۹ ۵ ایضاً ص ۲۸ ۶ ایضاً ص ۲۹ ۷ ایضاً ص ۲۹ ۸ قران السعدین علی گڑھ اڈیشن ص ۳۰

زاں خطہ ہر آنکہ در امر داد
بر خیز رجا جست و دگر جاں دہ سپار[1]

اور جب ان کو اسی شہر میں وہ حوض یاد آتا جس کو سلطان شمس الدین التمش نے بنایا تھا تو جہاں اس کے مرغ ماہی کی تعریف کی ہے وہاں اس کے صاف و شفاف پانی کے متعلق کہہ گئے کہ اس کا پانی بھر پی لیتے تو آب چشمہ کو بھول جاتے ۔

ماہی آب خوشش او نوش کرد
آب خوش چشمہ فراموش کرد

ان کا قلم دہلی کی آب و ہوا کا ذکر کرنے پر آتا تو کہتے ہیں کہ اس ملک کا پانی اگر کوئی پی لے تو پھر خراسان کا پانی پینا نہ چاہتے۔ غالباً محسوس ہندوستان کے گرم ہوا کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ آفتاب کو یہاں سے عشق ہے، اس کے عشق کی گرمی کی وجہ سے یہاں کی ہوا گرم ہو گئی ہے، اور یہیں سے ساری زمین گرم ہوا پھیل گئی ۔

ہر کہ درین ملک بمے آب خورد
گشت دل از آب خراسانش سرد
مہر فلک گرم شد اندر وفاش
گرم از ان گشت جہان را معاش[2]

دہلی کی آب و ہوا کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں کی خوش گوار موسم کی وجہ سے اس کے چمن میں پھولوں کی بہار پورے سال رہتی ہے، اس کی سرزمین پھولوں کی وجہ سے سونے چاندی سے بھری معلوم ہوتی ہے، جنت کی طرح یہاں سبزہ رہتا ہے، اچھی آب و ہوا ہی کے سبب یہاں ہندوستان اور خراسان کے میوے پائے جاتے ہیں، بعض میوے ایسے ہیں جو خراسان میں کسی نے نہ کھایا ہوگا ۔

گل ہمہ سالہ بچمن خوش نسیم
خاک زگلہا شدہ پر زر و سیم
خط تر سبزہ بصحرا و کشت
سبزہ گرمی ز سواد بہشت
میوہ ز ہر دو خراسان بسے
زانکہ نخوردہ بخراسان کسے[3]

ایک بار پھر دہلی کے لوگوں کی تعریف میں ان کا قلم نشاط انگیز ہو جاتا ہے، اور یہ کہنے میں تامل نہیں کرتے کہ اس شہر کے لوگ فرشتہ سیرت اور جنت والوں کی طرح خوش دل اور خوش خو ہوتے ہیں ۔

مردم او جملہ فرشتہ سیرت
خوش دل و خوش خوئے چو اہل بہشت[4]

اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ لکھتے ہیں کہ یہاں کے لوگ صنف علم و ادب، آہنگ و ساز، نغمہ و سرود، پیرہ، پیکاں اور تیر کے ہنر میں بے نظیر ہیں ۔

ہر چہ ز صنعت ہمہ عالم ست
ہست در انشان و زیادت ہم ست
مستر از علم و ادب بہرہ مند
زاں سخن خود کہ شمارد کہ چند
چو ز سخن بگذری آہنگ و ساز
نغمہ مرغان بریشم نواز
دار ہنر پیرہ و پیکان و تیر
ہر کہ در آید بنظر بے نظیر[5]

پھر دہلی کے محبوبوں کی مدح کرنے لگتے ہیں تو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے جیسے مرید ہم جلیس اور ہم راز بھی ہیں، بلکہ محض حسن و عشق کے کوچے کے رہ نورد ہیں، دہلی کے ایسے سادہ ان کو اپنی طرف مائل کر رہا تھا جو کج کلاہی اور سر پر ٹیڑھی ٹوپی رکھتے، اپنے ناز و ادا کی وجہ سے کسی کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے، جہاں گشت کرتے، وہاں کی گلی ان چلتے پھرتے پھولوں سے معطر ہو جاتی، اور راستہ چلتے تو عشاق ان کے پیچھے ہو لیتے جن کی آنکھوں سے خون جاری رہتا، محبوب اپنے حسن کا غرور لیے سر میں رکھتے لیکن ان کے عشاق کا دل ہوا میں پرا دھوتا دکھائی دیتا، مثنوی لکھتے لکھتے ان محبوبوں کا ذکر والہانہ اور مضطربانہ انداز میں ایک غزل لکھ کر کیا ہے ۔

اے دہلی و اے بتان سادہ
پگ بستہ و ریشہ کج نہادہ
فرمان نبرند از انکہ ہستند
از عاشقیان ز خود مرادہ
جاتے کہ برہ کنند گشت
در کوچہ شود گل پیادہ
ستان زرہ و عاشقان دنبال
خون ناب ز دیدہ با کنارہ
ایشان ہمہ پادشاہ بر سر
و اینہا ہمہ دل بباد دادہ[6]

ان محبوبوں کا تعلق کس طبقہ سے تھا، اور ان کے پجاری کون تھے، وہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ۔

خورشید پرست شد مسلمان
زین ہندوگان شوخ و سادہ[7]

اس شعر سے وہ باہمی مواصلت و یگانگت ظاہر ہے جس کی تلاش اس بیسویں صدی میں ہمارے وطن ہندوستان کو ہے مگر خسرو کے بیان کے مطابق ہندوستان کی تیرہویں صدی میں پیدا ہو چکی تھی، خود خسرو ان ہندو محبوبوں کی محبت میں جس طرح

---

[1] ایضاً ص ۳۱ [2] ایضاً ص ۳۲ [3] ایضاً ص ۳۳ [4] ایضاً ص ۳۴ [5] ایضاً ص ۳۴ [6] ایضاً ص ۳۴ [7] قرآن السعدین علی گڑھ اڈیشن ص ۳۶ [8] ایضاً ص ۳۷ ۔

۔۔۔ ہے اس کا اظہار اس طرح کیا ہے ۔

کہ دہلی شد مرا خراب و سرمست
از صحبت خوباں پاک زادہ
ہر جستہ ستان موئے مرغول
خسرو چو نگشت در خلا[۱]

خسرو کی جو مذہبی اور رنگا رنگ زندگی رہی اس سے کبھی یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے وہ شراب پلانے والے لڑکوں کے عشق میں خراب و سرمست اور پیچ دار زلف رکھنے والوں کے پیچھے پڑے دار رکتے رہے۔ یہ ان کی ایک غزل کے اشعار ہیں جو قران السعدین کی مثنوی میں نغمۂ ترنم در موسیقیت پیدا کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں لیکن اس متغزلانہ رنگ میں وہ اس اس محبت کا اظہار کر گئے ہیں جو وہ دہلی کے باشندوں کے ساتھ رکھتے تھے۔ یہی ان کی طرف سے ہندوستان کے لئے پیام بن سکتا ہے کہ ایک مسلمان اپنی رواداری اور مزاج دلی میں ہندوؤں کے کیا ہو سکتا ہے

خسرو دہلی کے شیریں نگاں پاک زادہ کے لئے خراب و سرمست ہو سکتے تھے، تو پھر دہلی کے شاہی محلوں کے لئے ان کے محبت کس طرح سے کیوں نہیں پیدا ہوتے، ان کے عہد میں کیلوکھری میں ایک محل قصر نو کے نام سے تعمیر ہوا، اس کی مدح میں بکثرت اشعار کہہ گئے ہیں، ایک شعر میں کہتے ہیں کہ یہ محل کا ہے کو ہے، ایک سبب ہے جس کے زینہ سے بلندی کی معراج حاصل ہوتی ہے ۔

قصر بگویم کہ بہشتے سراج
روضۂ طوبیٰ در او دراز ساج[۲]

ایک دوسرے شعر میں اسے پرواز تخیل کے ساتھ رقم طراز ہیں کہ اس کے گنبد کی بلندی آفتاب کے لئے سدا رہ بن گئی ہے ۔

بام سعد بس کہ بہ فلک سر و سر
گرد کوہ رسد سعدے اگر[۳]

اس محل کے پیچھے جو باغیچی تھی، ایک شاعر ہی یہ دل نواز نکتہ پیدا کر سکتا ہے کہ اس کا ہبابابی محل جیسے عروس کے لئے آئینہ کا کام دیتا ہے ۔

طرفہ عروسے شدہ آراستہ
آئینہ از آب روان خواستہ[۴]

دربار میں جشن نو روز میں جو چہل پہل ہوتی تھی، یا اس موقع پر جتر سیاہ، چتر سفید، چتر سرخ، چتر سبز، چتر گل، رایت لعل و سیاہ، گلستان سیم و زر، محل موم اور دستہ گل دل فریب سے دربار کی جو زیب و آرائش کی جاتی تھی اس کی مصوری اس مثنوی میں خسرو نے اپنا شاعرانہ آرٹ دکھا کر جو یہ کہا ہے کہ ۔

قصر ہمایوں ز زمیں تا سماک
رلور زرلسہ جو فردوس پاک[۵]

اس سے ان کے ان اندرونی جذبات کا اظہار ہوتا ہے کہ ان کے وطن کے دربار کی رنگ و آرائش کا مقابلہ ایران، توران اور خراسان وغیرہ کے درباروں سے نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کا معیار بہ اعتبار فردوس پاک سے ہو سکتا ہے ۔

قران السعدین میں موضوع کی بڑی رنگا رنگی ہے، اس میں خسرو کا قلم مختلف سمتوں میں چلتا رہا، جہاں ان کو موقع ملا، دہلی یا دہلی کی کسی چیز کی تعریف کرنے لگے ہیں، کسی نہ کسی صورت سے ہندوستان کے تربوز کا ذکر لے آئے ہیں، یہ ان کے وطن کا پھل تھا، اس لئے دل کھول کر اس کی تعریف کی کہ یہ بہشت کے تمام پھلوں سے بازی لے گیا ہے اس میں شہد کی ایسی مٹھاس ہے اور آب حیات کی ایسی تاثیر ہے

خربزہ گوئی کہ نہ صحرائی کشت
گوئے زلود از برات بہشت
از رہ گرد آمد و در دے ناب
جام شکر ریختہ جو آب حیات[۶]

بغرا خاں اور کیقباد کی ملاقات کے وقت دونوں میں بڑے قیمتی تحائف کا مبادلہ ہوا، جس میں عود، مشک، عنبر، کافور، زر و جواہرات، موتی، یاقوت، گھوڑے، اونٹ، اسلحہ، خطائی، غلام اور زنجیر و زنبوران وغیرہ سب کچھ تھے، مگر خسرو کی نظر ہندوستان میں بنے ہوئے کپڑے ہی کی طرف اٹھی، جس کو وہ جامۂ ہندی کہتے ہیں، اس کی تعریف یہ لکھ کر کی ہے کہ یہ اتنا باریک تھا کہ جیسے جسم نظر آتا تھا، بعض کپڑے ایسے کم وزن تھے کہ ان کو چھو تو انگلیوں کے ناخن میں آجائیں، اور رکھو تو دو ساکڑ دھاگے لگیں ۔

جامہ ہندی کہ بدا سد نام
کر سنگی یں نہ بماند بسام
ماندہ بہ پیچیدہ نہ ناخن نہاں
بارکسانش نہ تو سد جہاں[۷]

باپ بیٹے نے ایک دوسرے کی جو ضیافتیں کیں، ان کی تفصیل بھی خسرو نے بڑے طمطراق سے بیان کی ہے، بیتر خواں پر ایک ہزار سے زیادہ قسموں کی نعمتیں ہوتیں، ان کو مرے لے لے کر بیان کرنے میں خسرو کا وطنی جذبہ ابھرا ہے کہ اور ملکوں میں ایسی نعمتیں میسر نہیں، ان دعوتوں میں پان بھی تقسیم ہوا یہ خسرو کے وطن کی خاص چیز تھی، اس لئے اس کی تعریف میں ان کا قلم جلالو مشکل سے رکا، جہاں اس کی سب کچھ مدح سرائی کی ہے وہاں یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ ہندوستان کی ۔۔۔ نعمت ہے، نہ دیکھنے میں تو ایک گھاس ہے لیکن اس سے جوش پیدا ہوتا ہے، منہ کی بدبو کو دور کرتا ہے، کمزور دانتوں کو مضبوط بناتا ہے، سر ہو کھانے والوں کی بھوک بڑھاتا ہے اور بھوکوں کی بھوک میں کمی کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ[۸]

ہندوستان کے ارباب علم کی تعریف

امیر خسرو کے سن کی پختگی کے ساتھ ان کی وطنیت اور بھی راسخ ہوتی گئی، وہ جب چالیس سال کے تھے تو اپنے کلام کا تیسرا مجموعہ ۶۹۳ھ میں غرۃ الکمال کے نام سے مرتب کیا اس کا ایک طویل دیباچہ نثر میں لکھا ہے جس میں اور بہت سی باتیں لکھنے کے ساتھ

---

۱ ایضاً ص ۳۷ ۲ ایضاً ص ۳۴ ۳ ایضاً ص ۳۵ ۴ ایضاً ص ۳۵ ۵ ایضاً ص ۵۵ ۶ ایضاً ص ۸۲ ۷ قران السعدین علی گڑھ اڈیشن ص ۹۱ ۸ ایضاً ص ۱۳۲ ۹ ایضاً ص ۸۶-۱۸۵ ۔

ہندوستان کے شعرا کا معیار ایران اور دوسرے ملکوں سے کم ہے، ایران والے ہندوستان کے فارسی بولنے والوں کو ہمیشہ نیچی نظر سے دیکھنے کے عادی رہے ہیں، ان کو اپنی سبک ایرانی پر بڑا غرور ہے، خسرو نے بھی اپنے زمانہ میں اس کو محسوس کیا، ان کی وطن پرستی جوش میں آئی تو غرۃ الکمال میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان اور خصوصاً دہلی کے اہل علم دنیا کے تمام ارباب علم سے بہتر ہیں کہتے ہیں۔

"ہندوستان خصوصاً حضرت کاتی سر سکنہ سکینۂ دہلی اند بہ طبع از یونانیان
ہمہ عالم غالب اند"

اس کو ثابت کرنے کے لئے سب سے دلائل دیتے ہیں، لکھتے ہیں کہ خراسان عراق، اسرار، بغداد اور ترکی کے لوگ یہاں آتے ہیں تو محفلوں میں سب کچھ بولتے اور چھا جاتے ہیں مگر اپنی زبان ہی میں بولتے اور شعر کہتے ہیں، ہندوستان کی زبان بولنے میں تو ان کو تکلف آجاتی ہے لیکن ہندوستان خصوصاً دہلی کے لوگ باہر جاتے ہیں تو وہیں کی زبان بولتے اور رہتے ہیں، اسی میں نظم و نثر بھی لکھنے لگتے ہیں، یہاں کے حوالی علم عرب نہیں گئے وہ بھی عربی میں ایسے اشعار کہہ سکتے ہیں کہ ان کی فصاحت و بلاغت سے عرب کے لوگ بھی مرعوب ہو جاتے ہیں، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ سب سے تاجک اور ترک ایسے ہیں جنہوں نے ہندوستان ہی میں ترکی زبان کی تعلیم پائی لیکن وہ زبان اس طرح بولتے ہیں کہ باہر کے فصحا ان کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔

وچند ہیں تاجک و نہ ترک دیدم کہ زبان ترکی در ہندوستان تعلیم د
کسب ساموختند چنان گفتند کہ فصحا آن طائفہ کہ از ماورا النہر آمدہ اند"

وہ قواعد کی فصاحت سے بھی زیادہ متاثر نہیں تھے، لکھتے ہیں کہ ماوراءالنہر کی فارسی میں تو فصاحت پائی جاتی ہے لیکن ایران میں اس کی وہی حیثیت ہے جو ہندوستان میں ہے خراسان اور خراسانیوں پر ہمیشہ قلمی ضرب لگانے کے لئے تیار رہتے، بڑی تحقیر کے ساتھ لکھتے ہیں وہ تو صحیح تلفظ بھی نہیں کر سکتے، کیا کو کو اور چہ کو چی بولتے ہیں پھر بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں فارسی سندھ سے جنوب کے سمندری ساحل تک ایک طرح بولی جاتی ہے۔

"وگفتار فارسی در ہندوستان از لب آب سندھ تا دریائے محیط یک زبان است"

اور پھر اسی فارسی پر ناز کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ہندوستان کی فارسی شاعری میں ایسی وسعت ہے کہ اس میں ہر قسم کے معانی کا اظہار ہو سکتا ہے۔

آن زبان کہ زبان چنین درا رست
شاید کہ سخن فراغ گوید

ان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ ہندوستان میں اصل فارسی یعنی دری بولی جاتی تھی، ہندی تو یہاں ہر فرسنگ پر مختلف ہو جاتی لیکن یہاں کی فارسی ایک ہی طرح بولی جاتی، اور جس طرح بولی جاتی اسی طرح لکھی بھی جاتی۔

"پارسی است کہ املائی زبان الفش تمام موافق مطابق است"

آذربائجان اور سیستان کے لوگوں کے فارسی تلفظ کا تو یہ لکھ کر تمسخر کیا کہ گردہ کہنے کی جگہ ان کی زبان سے کرہ نکلے گا، اسی طرح سیستان کے لوگوں کا یہ لکھ کر مذاق اڑایا کہ وہ اعمال میں ہیں زیادہ ہیں، خواہ مخواہ بڑھا دیتے ہیں، وہ کردہ ہیں (سیں) اور گفتہ ہیں (سیں) بولیں گے، خسرو کا دعویٰ تھا کہ دہلی کے علما، فضلا اور شعرا یہاں آئے تو دہلی کے لوگ ان ہی کی طرح بولنے لگ جاتے ہیں اور وہ لوگ دہلی کی زبان کو نازک، لطیف، درست اور فصیح پاتے ہیں [1]

معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی ملک کے لوگوں نے ہندوستان کے باشندوں کے سیاہ رنگ پر خسرو کے سامنے طنز کیا تھا، وہ اس طنز سے بے چین ہو گئے، اس کا جواب شاعرانہ انداز میں یہ کہہ کر دیا کہ اس رنگ کی ظلمت (تاریکی) کے اندر آب حیات کی تاثیر ہے، اس کی سیاہی اس کے لئے کوئی عیب نہیں، کیونکہ یہ سواد اعظم ہے، اس کے سامنے ساری دنیا پست ہو کر رہ گئی ہے۔

ہند را اے مدعی طعنی بہ تاریکی مزن
زانکہ اندر ظلمتہا آب حیوان مدغم ست
گر کسے گوید سیہ ہندوستان را عیب نیست
جملہ عالم رو سیاہ تند و این سواد اعظم ست [2]

قلعہ جھائین کی تعریف

اسی غرۃ الکمال کے مجموعہ میں ایک مثنوی مفتاح الفتوح بھی ہے، جس میں سلطان جلال الدین خلجی کی معرکہ آرائیوں کا ذکر ہے، وہ جب قلعہ جھائین (سرزمین رنتھمبور) کی تسخیر کے لئے گیا تو جب تک جنگ رہی امیر خسرو اپنے شاہی آقا کے دشمنوں کے لئے سخت الفاظ استعمال کرتے رہے، لیکن جب جھائین دہلی کی سلطنت کا حصہ ہو گیا تو پھر اس کے قلعہ کی تعریف میں بہت ہی تر زبان ہو گئے، ان کی اس تعریف میں ہندوؤں کے طرز تعمیر کے فن کو بھی خراج تحسین ادا کیا ہے، لکھتے ہیں کہ یہ آسمان کی طرح بلند تھا، سنگ خارا سے منقش تھا، ہندوؤں کی جنت معلوم ہوتا تھا، اس کے نقش و نگار بہت ہی دل فریب تھے، مانی کی تصویریں بھی اس کے سامنے مات تھیں، پتھر کی ایسی سیکڑوں مورتیاں دیکھنے میں آئیں جو موم سے بھی نہیں بنائی جا سکتی تھیں۔ دیوار کی گچ آئینہ کی طرح صاف شفاف تھی، اس کی کہگل گھسے ہوئے صندل سے کی گئی تھی۔ اس کی لکڑیاں خالص عود کی تھیں، اس کے باغ میں بہت سے بت جانے تھے، جن پر سونے چاندی کی نقش آرائی تھی، شاعرانہ انداز میں یہ بھی کہہ گئے

گر آن فرہاد را دل گذشتی
دلش را قصر شیرین لیچ گشتی [3]

سنسکرت زبان کی قدردانی

ان کی حب الوطنی کے جذبات شعری دول رانی خضر خان لکھتے وقت بھی (جو)

---

[1] دیباچہ غرۃ الکمال قلمی نسخہ دارالمصنفین [2] ایضاً [3] دیکھو مفتاح الفتوح مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین لاہور، ص ۲۶ - ۳۵

طرح امیر نے مثنوی "دول رانی خضر خاں" لکھی۔ یہ اسی عمر کے ۶۶ ویں سال یعنی ۷۱۵ھ میں لکھی۔ اس میں علاء الدین خلجی کے لڑکے خضر خاں اور گجرات کے راجہ کرن سنگھ کی لڑکی دول رانی کے عشق و محبت کی داستان لکھتے لکھتے بھی، مگر ان کا جذبۂ وطنی محبت میں سرشار ہو کر ہندوستان کی مختلف چیزوں پر گل فشانی کرتے چلتے ہیں۔ سنسکرت کی خوبی کرنی چاہیے تھی، اس لئے اس کا ذکر اس مثنوی میں لے آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ فارسی زبان سے کم نہیں ہے۔

غلط کردم اگر از دانش زنی دم
نہ لفظ ہندوی است از پارسی کم[1]

اس زبان کو عربی کے علاوہ جو تمام زبانوں پر فضیلت رکھی ہے اور تمام زبانوں پر فضیلت حاصل ہے۔

بجز تازی کہ میر ہر زبان است
کہ بر جملہ زبانہا کامران است

اس کی خوبی یہ بھی بتاتی کہ عربی زبان کی طرح اس میں کسی اور زبان کی آمیزش نہیں، سنسکرت کے مرتبہ کو عربی ہی کی طرح بتاتے ہیں۔

گر آمیزش درست تو است دگر حرف
ازان آمیزش زرش کم است یک حرف[2]

سنسکرت کے معانی بیان کو دوسری زبان سے کم نہیں سمجھتے رہے،

دگر بہر معانی از بیانی
دران پیرایہ دیگر جا کم ندانی

جامۂ ہندی کی تعریف

ہندوستان کے سے موٹے کپڑوں میں ایک کپڑا دیوگیری کا ذکر آگیا ہے یہ خسرو کو سب پسند آگیا تھا۔ اس لئے کہتے ہیں کہ دیوگیری وہ مخصوص اس کو بہت پسند کرتے ہیں یہ کتان سے بھی بہتر ہوتا ہے، اس کی خوبی یہ ہے کہ جسم میں آفتاب سے معلوم ہوتا ہے، ٹھنڈک میں ماہتاب دکھائی دیتا ہے اور پھر اس پر سایہ بھی چھایا نظر آتا ہے۔

نکو دانستہ خوبان پری کیش
کہ لطف دیوگیری از کتان بیش
ز لطف آن جامہ گوئی آفتاب است
و یا خود سایۂ ماہتاب است[3]

آم کی تعریف

ہندوستان کے قومی پھل آم کا بھی ذکر لے آئے ہیں۔ شاید کسی نے ان کے سامنے کہہ دیا ہوگا کہ انجیر آم سے بہتر ہوتا ہے، اس زمانہ میں کوئی اچھے قسم کی انجیر باہر سے آتی ہوگی جسے ان کی وطنی محبت یہ گوارا نہیں کر سکی کہ ہندوستان کے اس بہترین قومی پھل کو کسی اور پھل سے بہتر قرار دیا جائے، اس لئے جھلا کر کہتے ہیں کہ جو لوگ انجیر کو ہمارے آم پر ترجیح دیتے ہیں ان کی شان ایسی ہے جیسے کوئی اندھی عورت نغزہ کو تمام سے بہتر بتائے۔

زبے انصاف تواں دانست این کام
کہ عمیا نغزہ را گوید از ستام
بزرگس بوئے خود گردد جہت گیر
نہد کم نعزک مار ارا تعیشر[4]

ہندوستان کے پھولوں کی تعریف

خسرو کا ایک بے مثل شاعر ہونے کی حیثیت سے پھولوں کی رنگینیوں سے متاثر ہونا ضروری تھا مگر ان کے ان تاثرات میں جمالیاتی ذوق سے زیادہ وطنی محبت زیادہ نمایاں ہو گئی ہے، وہ پھولوں میں سوسن، بنفشہ، سیوتی، بیلا، گل زرین، گل سرخ، ریحان، گل کوزہ، گل لالہ، گل صد برگ، سیرغم، صد برگ، نسترن، یاسمین، دونا، کرنا، بیلوفر، ڈھاک، چمپا، جوہی، کیوڑہ، سیوتی، گلاب، اور مولسری وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں، ان پھولوں کی تعریف تو سب ہی شاعر کرتے آئے ہیں، لیکن خسرو نے ان پھولوں کی جو تعریف کی ہے، اس میں ان کے وطنی جذبات سے جس طرح مسرور اور مغلوب نظر آتے ہیں، وہ زیادہ لائق توجہ اور قابل قدر ہے۔ پہلے تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان پھولوں میں صرف سمن، یاسمین، اور نسترن ایران سے ہندوستان لائے گئے، ورنہ اور تمام پھول ان ہی کے وطن کی خاص پیداوار ہیں، پھر تو ان کے اشعار میں شوریت اور طیب کی مے دو آتشہ کا نشہ چھایا نظر آتا ہے، ان کی تعریف سب ہی دلربا اور دل ربایانہ انداز میں کرتے ہیں مثلاً گل کوزہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں پانی کی سی لطافت ہے لیکن خود پانی نے ایسی لطافت اس پھول سے دریوزہ گری کی ہے۔

گل کوزہ کہ دور چرخ گرداں
پدید از خاک پاک ہند گرداں
تری آب را در کوزہ کردہ
لطافت آب ازو دریوزہ کردہ[5]

بیلا کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کے ایک پھول میں سات پھول ہوتے ہیں، اس کی خوشبو میں لازوال ہے، اس لئے عاشقوں کے دلوں میں جگہ پاتی ہے۔

از ان سو بیل بیتابی کشادہ
بیک گل ہفت گل بر ہم نہادہ
ازان شد دلربائے عاشقان جائے
ہمی مہر دلہا راشدہ جائے[6]

کیوڑہ کے بارہ میں رقم طراز ہیں کہ اس سے معشوقوں کی پوشاک باسی جاتی ہے دو برس کے بعد بھی اس کی خوشبو ایسی ہی باقی رہتی ہے، کپڑا پھٹ بھی جائے تو اس کی

---

[1] دول رانی خضر خاں، علی گڑھ ایڈیشن ص ۴۱ [2] ایضاً ص ۴۲ [3] ایضاً ص ۴۲ [4] ایضاً ص ۴۳ [5] ایضاً ص ۴۱ [6] ایضاً ص ۴۳ [7] ایضاً ص ۴۳۔ [8] دول رانی خضر خاں ایڈیشن ص ۱۲۰ [9] ایضاً ص ۱۲۹ [10] ایضاً ۱۳ص۔

ہو نہیں جاتی۔

رویش حاجت خوباں معطر
دو ساں مشک و بوئے برفتہ[1]

رائے چمپا کو پھولوں کا بادشاہ قرار دیا ہے، کہتے ہیں کہ اس کی خوشبو ایسی ہے جیسے سراب میں کسی نے مشک ملا دیا ہو، چمپیلی جیسے بدن والے معشوق کی طرح نازک ہے، اس میں زردی عاشقوں کے چہرے کی طرح ہوتی ہے۔

دگر آں رائے چمپہ ساہ گلہا
کہ بوئے مشک بار آمد چو لیلہا
چو معشوق سمن بر نازپرورد
ولے رنگش چو روئے عاشقاں زرد[2]

مولسری کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی طرف عام لوگوں کا دل مائل ہے اس کے پھول معشوقوں کی گردن کے حائل ہیں۔

بہ مولسری لیک دلہا گشتہ مائل
شدہ در گردن خوباں حمائل[3]

کیوڑی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عمر اس کے لئے جان دیتی ہے، مرنے کے بعد بھی اس سے لپٹی رہتی ہے، معشوق عاشق کی طرح اس کے لئے سرگرداں رہتی ہے، یہ پھولوں کے معشوقوں کا معشوق ہے۔

زمشق لوتے او جاں دادہ زنبور
بکشتہ بعد مردن نیز از دور
ہمہ خوبانش عاشق دار جویاں
کہ معشوقیست در خوبرویاں[4]

اسی طرح اور دوسرے پھولوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں سے یہ پھول کھلتے ہیں اور کالی گھٹائیں چھا جاتی ہیں تو ان گھٹاؤں میں سے جب ترشح ہوتا ہے تو ان پھولوں کا باغ فردوس کا باغ معلوم ہوتا ہے، بلکہ فردوس میں بھی ایسا خوشگوار منظر ہوتا ہوگا، آخر میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے ایسے پھول اگر روم و شام میں ہوتے تو وہاں کے لوگ ان کی تعریف دنیا بھر میں کرتے پھرتے[5]

ہندوستان کے حسن کی تعریف

امیر خسرو کو جس طرح ہندوستان کے پھول دوسرے ملکوں کے پھولوں سے بہتر نظر آئے اسی طرح ان کی نظر میں ہندوستان کے معاملہ میں کسی اور جگہ کا حسن بالکل نہیں جچا انہوں نے تمام بین الاقوامی حسن کو ان میں کچھ نہ کچھ نقص نکال کر رد کر دیا تھا، اس زمانہ میں ان کی نظر میں مصر، روس، تاتار، قندھار، سمرقند، ختن، چلگل اور یغما کے حسن پر پڑی تھی، ان میں روایتی طور پر چلگل اور یغما کا حسن زیادہ مشہور تھا، مگر خسرو کو ان جگہوں کا بھی حسن پسند نہ آیا کیونکہ ان کے قول کے مطابق ان کے حسین بے چشم اور ترش رو ہوتے، خراساں کا حسن بھی مشہور تھا کیونکہ ان کے چہرے پر سرخی اور سپیدی ہوتی ہوتی، مگر خسرو کو ہندوستان کے معاملہ میں خراساں کی ہر چیز ناپسند تھی، اس لئے ان کے سرخ اور سپید رنگ کے حسینوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ ان کے جیسے پھول ہوتے ہیں ویسے حسین بھی ہوا کرتے ہیں، یعنی رنگ ہے لیکن خوشبو یعنی دل آویزی نہیں، ان کو روم و روس کا حسن بھی پسند نہیں تھا کیونکہ ان کے معیار کے مطابق ان میں عجز و انکسار نہیں ہوتا، پھر ان کے خیال کے مطابق یہاں کے حسین برف کی طرح سرد ہوتے، ان کی آنکھیں چھوٹی اور ناکیں پست ہوتیں وہ تاتاری حسینوں کو ناپسند کرتے کیونکہ ان کے لبوں پر ہنسی نہیں دکھائی دیتی، وہ ختن کے حسینوں کو بھی لائق توجہ نہیں قرار دیتے کہ ان کے چہرے پر نمک نہیں ہوتا، سمرقند اور قندھار کے حسن میں ان کو شیرینی محسوس نہیں ہوتی، اس طرح مصر اور روم کے سیمیں بدن حسینوں میں چستی و چالاکی نہیں پاتے جو چیزیں ان بیرونی ممالک کے حسینوں میں نہیں پائی جاتیں، وہ خسرو کو ہندوستان کے حسن میں دکھائی دیتیں، یعنی عجز و انکسار بھی، لبوں پر تبسم بھی، چہرے پر نمک بھی، شیرینی بھی، اداؤں میں چستی اور چالاکی بھی اس لئے بے اختیار یہ اعلان کرتے ہیں۔

ستان ہند را سبب ہمیں است
کہ ہر یک ہوتے ساں ہند ملک حسین است[6]

یہ سب کچھ لکھنے کو تو خسرو لکھ گئے لیکن ہندوستان کے حسینوں میں ہر قسم کا رنگ پایا جاتا ہے، اس کی تاویل بھی بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے، لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے حسینوں کے تین رنگ ہوتے ہیں، سیاہ، گندمی اور سہرہ، سیاہ رنگ کی خوبی بیان کرنا دشوار ہے، مگر اس میں یہ کہہ کر تعریف پیدا کر دی ہے کہ آنکھوں کی پتلی تو سیاہ ہی ہوتی ہے، اور اس میں آدمی تو سیاہ ہی نظر آتا ہے، اور ہر پتلی کے لئے سرمہ چاہئے، سرمہ کا رنگ تو سیاہ ہی ہوتا ہے، سپید رنگ تو عارضی ہوتا ہے، اس لئے بے سود ہے۔

سیہ را خود دیدہ جائے گاہ است
کہ اندر دیدہ ہم مردم سیاہ است[7]
زہر دیدہ بباید سرمہ را سود
سپیدہ عارضی رنگی است بے سود

گندمی رنگ کی یہ تاویل کی ہے کہ حضرت آدم نے گندم ہی کو پسند کیا، اور پھر اسی گندم سے سارا فتنہ اٹھا، اگر گندم کے آٹے کے ساتھ نمک ملا دیا جاتا ہے تو سینکڑوں بے نمک سپید نکوں سے بہتر ہو جاتا ہے، خسرو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ گندمی رنگ کے ساتھ چہرے پر نمک بھی ہو تو چہرے کی سفیدی سے کہیں بہتر رنگ ہوتا ہے۔

بگندم گوست میل آدمی زاد
کہ ایں فتنہ ز آدم یافت میلاد
یکے گندم بہ کام اندر نمک دہ
ز صد قرص سپید بے نمک بہ[8]

---

[1] ایضاً ص ۱۳۰ [2] ایضاً ص ۱۳۱ [3] ایضاً ۱۳۱ [4] ایضاً ص ۱۳۲ [5] ایضاً ص ۱۳۲ [6] دول رانی خضر خاں علی گڑھ اڈیشن ص ۱۳۲ [7] ایضاً ص ۱۳۴ [8] ایضاً ص ۱۳۴۔

خسرو کو ہندوستان کے حسینوں کا سبز رنگ بہت پسند تھا اسی لئے اس رنگ کی تعریف میں ان کا قلم خوب چلا ہے، کہتے ہیں کہ یہ سبز رنگ لالہ و نسرین کے رنگ سے بہتر ہوتا ہے بہشت کے طاؤس کا رنگ بھی یہی ہے، ستاروں کی رصد بھی اسی رنگ سے ہے، جنتیوں کی پوشاک کا بھی یہی رنگ ہے، بہار کا رنگ بھی اسی رنگ سے ہے، وغیرہ وغیرہ یہ تو ہندوستان کے حسینوں کے رنگ کی مدح سرائی ہوئی، خسرو کے عہد میں جو تہذیب تھی اس لحاظ سے وہ کسی شریف یا پردہ نشین عورت کی قلمی تصویر کھینچنا معیوب تھا، لیکن حسن کی پسندیدگی میں ہندوستانی دلہن کی عکاسی ان ہندوستانی رقاصاؤں کی مرقع آرائی کر کے کی ہے جو شہزادہ خضر خاں کی شادی کے موقع پر بلائی گئی تھیں یہ طبقہ اچھی نظر سے تو نہیں دیکھا جاتا ہے مگر ان ہی کے ذریعہ شعراء نے ہندوستانی حسن و عشق کی ساری داستان مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، خسرو نے ان حسینوں کو اپنے تصور کی خیالی آنکھوں کے سامنے لا کر جو کھڑا کر رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں ہندوستان کے حسن کا کیا معیار تھا ذرا سینے ان کے مژگاں سے سینے چھلنی ہو جائیں، ان کی دزدیدہ نگاہوں سے عالم جاتا رہے، ان کے کرشمے سے روح نکل پڑے، وہ پلکیں ماریں تو نوجوان ہلاک ہو جائیں، ان کی ہنسی سے عاشق لمعہ ہو کر رہ جائیں ان کے تل موتی کی ڈبیا کی طرح ہوں، ان کے ابرو کی کمان پر جانیں قربان ہوں، ان کے گیسوؤں میں ایسے پیچ و خم ہوں کہ معلوم ہو کہ سانپ صندل میں لپٹا ہوا ہے ان کی زلفوں کے خیال میں وہی کیفیت پیدا ہو جو روزہ داروں کی شام میں ہوا کرتی ہے، ان کی نیم خواب اور نیم بیدار آنکھوں کو دیکھ کر نیند حرام ہو جائے، ان کے دہن غنچہ کی طرح کبھی شگفتہ ہوں، ان کے گال سیب کی طرح ہوں، اگر ان سے پسینہ ٹپکے تو پسینے میں ان کے انار دانے اگے ہوئے دیکھے جائیں، یہ تو راقم کے الفاظ ہوئے، اب ذرا خسرو کے اشعار سے بھی محظوظ ہوں۔

بہ مژگانے کہ صد سینہ سفتہ
چہ غم دارد مرا دزدیدہ گفتہ
ہر چشمک زدن آشفتہ خوابے
بہر خندہ زدن بر لودہ جانے
رخال چوں شکر در درج مرجاں
یکے گوہر بہا در رخ صد جاں
ز ابرو تا کہ زہاں گشتہ جاہا
دو گاں نگندہ در قربان کمانہا
دو گیسو گرد ہر یک پیچ کردہ
چو مارے گرد صندل پیچ خوردہ
خیال زلف شاں در جان یاراں
چو شام اندر خیال روزہ داراں
ز لودہ خواب بیداراں یکے یار
ز چشم نیم خواب و نیم بیدار

دہن ہائے چو غنچہ گاہ گفتن
گہے در بستن و گہ در شگفتن
زنخ ہائے چو سیب لعل گونہ
نہ چوں سیب دو رنگ از عکس گونہ
عرق کر روئے ہر طاری رخسار
کہ تخم می چکد دانار می ریخت[1]

ہندوستان کے مراسم پر اظہار مسرت

شہزادہ خضر خاں کی شادی کے موقع پر شہر کی جو آرائش کی گئی در و دیوار پر تصویریں سجائی گئیں۔ راستوں پر دیبا کے فرش بچھائے گئے نوبت اور شادیانے اور ڈھول بجائے گئے نٹوں نے رسیوں پر تماشے دکھائے، شعبدہ بازوں نے طرح طرح کی شعبدہ بازیاں کیں، بہروپیوں نے سوانگ بھرے، رقاصاؤں نے رقص و سرود سے تماشائیوں کو محظوظ کیا، نجومیوں نے ساعت سعد مقرر کی، تو بارات ہاتھی گھوڑے اور لشکریوں کے جلو میں روانہ ہوئی، راستے میں یاقوت اور موتی لٹائے گئے، نکاح نیک ساعت میں پڑھا گیا تو دولہا پر موتی نچھاور کئے گئے۔ دولہا دولہن کے گھر پہنچا تو دولہن کو اس کے سامنے لا کر جلوہ دکھلانے کی رسم ادا کی گئی وغیرہ وغیرہ[2] ان سب رسم میں ہندوستانی اثرات زیادہ نمایاں تھے جن کو خسرو نے مزے لے لے کر یہ ظاہر کرنے کے لئے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں جو ہندوستانی تہذیب سرایت کر رہی تھی اس سے وہ خود خوش تھے۔

مذہبی عقائد کا احترام

وطنی محبت کا ایک فطری تقاضا یہ بھی ہے کہ وطن کی سرزمین میں جتنے لوگ رہتے ہوں ان سے بھی مذہب عقیدہ، ذات پات کی تفریق کے بغیر محبت کی جائے، اور ان کے مذہبی عقائد کا احترام بھی برقرار رکھا جائے خسرو کے یہاں اس کا بھی پیام ملتا ہے مثلاً اپنی مثنوی دول رانی خضر خاں میں ایک آتش پرست ہندو کا ذکر لے آتے ہیں، لکھتے ہیں کہ اس سے سوال کیا گیا کہ وہ آگ کی پرستش کیوں کرتا ہے اور اس کے لئے جان کیوں دیتا ہے، اس نے جواب دیا کہ آگ کو دیکھ کر امید وصل فروزاں ہوتی رہتی ہے اور آگ میں جا کر بقا حاصل ہوتی ہے۔[3]

محبت میں ایمانی جذبۂ وطنی

امیر خسرو نے قطب الدین مبارک خلجی کی فرمائش پر اپنی مثنوی نہ سپہر ۱۳۱۸ء میں لکھنی شروع کی، اس میں وہ اپنے شاہی آقا کی تخت نشینی، اور اس کی لشکر کشی وغیرہ کا حال لکھنا چاہتے تھے مگر ان کے جو وطنی جذبات دبے ہوئے تھے وہ اس مثنوی میں بہت زیادہ ابھر کر سامنے آگئے ہیں، اگر قران السعدین کو مثنوی وطنی کہا جا سکتا

---

[1] مثنوی دول رانی خضر خاں ص ۹۹ ۔ ۱۵۸ [2] مثنوی دول رانی خضر خاں ص ۱۵۲-۱۵۳ [3] ایضاً ص ۹۶ ۔ ۱۹۵۔

ہے تو یہ سپہر کو مثنوی نہ صرف ہندوستان کہا جا سکتا ہے، اس میں تو وہ اپنی وطنیت کے اظہار میں بالکل محو اور سرشار ہو گئے ہیں اسی سرمستی میں کہہ اٹھے ہیں۔

حکمت و دانائی و علم و ہنر
وانچہ کہ در ہند ملایست دگر[1]

پھر اپنی وطنیت کو مذہبی رنگ یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ وہ اس سے ضرور محبت کرتے ہیں، اور سب محبت کرتے ہیں اس لئے کہ یہ ان کا مولد، ماویٰ اور وطن ہے اور ان کے رسول کی تعلیم ہے کہ وطن کی محبت ایمان کا جز ہے۔

آمدن نکتۂ کیں رمز از دور من
ہست مرا مولد و ماوی و وطن
وان ز رسول آمدہ کای زمرۂ دیں
حب وطن ہست ز ایمان یقین[2]

ہندوستان جنت ارضی ہے

اسی کے بعد یہ لکھتے ہیں۔

کشور ہند است بہشتی بزمیں[3]

اس کے ثبوت میں سات اسباب فراہم کئے ہیں[4] ممکن ہے کہ ان اسباب میں ازمنہ وسطیٰ کا طرز استدلال دکھائی دے، جو موجودہ دور کے ذہن کے لئے زیادہ قابل قبول نہ سمجھا جائے، مگر خسرو نے جس جذبہ اور جس جوش و خروش کے ساتھ ان اسباب کو معلوم کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ پہلے چار اسباب تو یہ بتاتے ہیں کہ حضرت آدم جنت سے ہندوستان میں آئے یہاں طاؤس جیسا فردوس کا پرندہ ہوتا ہے، یہاں سانپ بھی باغ فلک سے آیا حضرت آدم جنت سے باہر نکلے تو فردوس کی نعمتوں سے محروم ہو گئے، اس کے بعد خسرو نے اور جو دو اسباب بتاتے ہیں، ان میں بڑا اعدمانی رنگ پیدا ہو گیا ہے جس سے آج کل کے ادبا کو بھی تسکین ہو سکتی ہے، لکھتے ہیں کہ یہاں خوشی اور عیش کے ساتھ اس کے پھول اور مٹی میں طرب آگیں ہے جس سے نشاط و آسائش کا سامان پیدا ہوتا رہتا ہے، یہاں کے پھولوں اور خوشبوؤں کی وجہ سے سال کے ہر حصہ میں اس کی سرزمین گلزار بنی رہتی ہے، ترک اور روم میں تو پھول دو تین مہینے سے زیادہ نہیں دکھائی دیتے اور وہاں جو پھول ہوتے بھی ہیں تو تیغ اور ژالہ کی وجہ سے ان میں خوشبو نہیں ہوتی، سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان اپنی نعمتوں اور خوبیوں کی وجہ سے بہشت ہے۔

خوش دلی و عیش فراخیست چناں
کاں زمی از روح شدہ دار جناں[5]
بس ہمہ حال ز حولی و بہی
ہند بہشت است باثبات رہی[6]

آخر میں کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا قول ہے کہ موت کے بعد ان کو جنت ملے گی، اس لئے وہ اس دنیا کو قید خانہ سمجھتے ہیں لیکن ہندوستان میں جو نسیم چلتی ہے اس سے ہندوستان خود بخود جنت بن گیا ہے اور یہ ہندوستان کے مسلمان اس سرزمین کو قید خانہ کے بجائے جنت سمجھنے لگے ہیں۔

گر نہ کہ بر سنت فردوس جہاں
با ہمہ لطفیش جو زندان است جہاں
لیک بہ ہند است نسیمش دگر
کاتش دوزخ نمی دہد انجا اثر
زاں سبب خاص مر اصحاب یقیں
ہند بود ان کہ کند جنت برین[7]

ہندوستان کی آب و ہوا کی خوبیاں

قران السعدین میں خسرو نے مختصر طور پر ہندوستان اور دہلی کی آب و ہوا کی تعریف کی تھی[8] ان کو شاید اس اختصار سے تسکین نہیں ہوئی، اس لئے نہ سپہر میں ہندوستان کی آب و ہوا کی پھر مدح شروع کر دی ہے، وہ کوئی ماہر موسمیات تو نہیں تھے، محض شاعر تھے، اسی لئے شاعرانہ انداز میں اس کی دس خوبیاں بتا کر اس کو دوسرے ممالک کی آب و ہوا سے بہتر قرار دیا ہے، پہلی خوبی تو یہ بتائی ہے کہ یہاں کی سردی سے کسی آدمی کو نقصان نہیں پہونچتا، ہندوستان کی فضیلت بیان کرنے میں خراسان کو ہمیشہ نیچا دکھاتے ہیں، اس لئے اس سلسلہ میں دوسری خوبی یہ بتاتے ہیں کہ خراسان میں لوگ ٹھنڈک سے مر جاتے ہیں مگر ہندوستان میں سردی سے لوگ ہلاک نہیں ہوتے، تیسری خوبی یہ لکھی ہے کہ یہاں کی سرد ہوا کے خوف سے غریبوں کو زیادہ سرمائی سامان کی ضرورت نہیں ہوتی ایک کمبل کافی ہوتا ہے کسان تو ایک پرانی چادر میں رات گذار لیتا ہے، برہمن تو رات کے آخری حصہ میں جمنا کے ٹھنڈے پانی میں غوطہ لگاتے ہیں، خسرو کے نزدیک چوتھی خوبی یہ ہے کہ خراسان میں دو تین مہینے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ہندوستان میں پورے سال گل و گل کی بہار رہتی ہے، یہاں کی آب و ہوا کی وجہ سے یہاں کے پھول گل لالہ کی طرح خوش رنگ رہتے ہیں، اور یہاں کے پھولوں میں خشک ہونے کے بعد بھی خوشبو رہتی ہے، خسرو کے نزدیک پانچویں اور چھٹی خوبیاں ہیں، پھر یہاں کی آب و ہوا ہی کی وجہ سے امرود، آم، کیلا، الائچی، کافور، لونگ جیسی چیزیں ہوتی ہیں، اس کو وہ ساتویں خوبی قرار دیتے ہیں، ایک بار پھر وہ خراسان اور ہندوستان کا موازنہ کرنے لگتے ہیں، کہتے ہیں کہ خراسان کے سب میوے تو ہندوستان میں پائے جاتے ہیں لیکن ہندوستان کے میوے وہاں نہیں ہوتے اس کو وہ آٹھویں خوبی بتاتے ہیں، بعد دو خوبیوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہاں کی آب و ہوا کی وجہ سے دو نادر چیزیں ہوتی ہیں، ایک کیلا اور دوسرا پان، کیلا تو اب ہندوستان سے باہر بھی ہونے

---

[1] مثنوی نہ سپہر مسلم یونیورسٹی ایڈیشن ص ۱۴۹ ۔ [2] مثنوی نہ سپہر مسلم ایڈیشن ص ۱۵۰ [3] ایضاً ص ۱۵۱ ۔ [4] ایضاً ص ۱۵۷-۱۵۸ [5] ایضاً ص ۱۵۵ [6] ایضاً ص ۱۵۶
[7] ایضاً ص ۱۶۰ [8] ایضاً ص ۱۶۱ ۔

لگانے، لیکن پان کہیں اور نہیں ہوتا ہے، اس کو وہ میوہ ہی قرار دیتے ہیں۔[1]

ہست بہ ہم آنکہ چو تنبول کرں
میوہ نہ ماند بہ ہمہ روئے زمیں[2]

ہندوؤں کے علوم و فنون کی تعریف

یہاں تو خسرو نے اپنے وطن کی آب و ہوا کی خوبیاں بتائیں، وہ اپنے ہم مذہبوں کو اپنے وطنی بھائیوں کے علوم و فنون کی قدر کرنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ اسی لئے بڑی فراخ دلی سے لکھتے ہیں کہ ان کے یہاں کے دانش و معانی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، روم سے فلسفہ ضرور پھیلا لیکن ہندوؤں کے یہاں بھی یہ علم کم نہیں یہاں منطق بھی ہے، نجوم بھی، علم کلام بھی البتہ ان کے یہاں فقہ نہیں، برہمنوں کے علم کی تعریف یہ لکھ کر کی ہے۔

برہمنے ہست کہ در علم و خرد
دفتر قانون ارسطو بدرد[3]

خسرو کے بیان کے مطابق ہندوستان میں طبیعات، ریاضیات اور ہیئت وغیرہ سب کچھ ہیں، البتہ یہاں کے لوگ مابعد الطبیعاتی علوم نہیں جانتے، خسرو کے اس بیان کے آخری ٹکڑے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، گو خسرو نے یہ لکھ کر اس کو یہ کہہ کر سنبھالا ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ اور بھی قومیں مابعد الطبیعاتی علوم سے واقف نہیں۔

ہندوؤں کی وحدانیت کا اعتراف

اس کے بعد خسرو نے ہندوؤں کے مذہبی عقائد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بہت ہی اہم ہے، مسلمانوں کے یہاں توحید ایمان کا سب سے بڑا جز ہے، جو لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل نہیں ان کو وہ مذہبی حیثیت سے ادنیٰ درجہ دینے کے لئے تیار رہیں، وہ ہندوؤں کو محض بت پرست سمجھتے رہے ہیں خسرو ہندو و مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر دیکھنا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کو یہ کہہ کر یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہندو ہمارے مذہب کے تو معتقد نہیں لیکن ان کے بہت سے عقائد ہم سے مشابہ ہیں، لکھتے ہیں کہ وہ خدا وند تعالیٰ کی ہستی، وحدت اور قدم کے معترف ہیں۔ وہ اس کے بھی قائل ہیں کہ وہی عدم سے اس دنیا کو وجود میں لایا، وہی روزی عطا کرتا ہے، وہی نیکی اور بدی کا خالق ہے، اس کی حکمت ازلی و ابدی ہے، وہی ازل سے ہر کل و جز کا مختار اور فاعل ہے، یہ ساری باتیں تحقیق کر کے لکھی جا رہی ہیں، ان میں جھوٹ نہیں۔

معترف وحدت و ہستی و قدم
قدرت ایجاد ہمہ بعد عدم

رازق ہر ہر ہمہ ہے بہر سے
عزیز دیاں وہ ہر جانور سے
خالق افعال بہ نیکی و بدی
حکمت و حکمش ازلی و ابدی
فاعل مختار و مجاری بعمل
عالم ہر کل و جزوی ز ازل
این ہمہ راگشت بہ تحقیق مقر
نے چو سے طائفہ بر کدب مقر[4]

ہندو مذہب کا مقابلہ دوسرے مذاہب سے

اسی پر وہ اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ ہندوؤں کے مذہب کا مقابلہ دنیا کے دوسرے مذاہب سے بھی کرتے ہیں، انہوں نے اس مذہب کو اسلام کے علاوہ اور تمام مذاہب سے بہتر قرار دیا ہے لکھتے ہیں کہ مجوسی دو خدا کو ایک بتاتے دو مانتے ہیں، لیکن ہندو خدا کو ایک ہی مانتے ہیں، عیسائی حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا تسلیم کرتے ہیں ہندوؤں کا یہ عقیدہ نہیں، فرقہ مجسمہ خدا کو صاحب جسم مانتا ہے، ہندو ایسا اعتقاد نہیں رکھتے، ستارہ پرست کی طرح ہندو سات خدا نہیں مانتے، فرقہ مشبہ خدا کو مخلوقات سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن ہندو اس کے خلاف ہیں، پارسی نور و ظلمت دو خدا مانتے ہیں، لیکن ہندوؤں کا ایسا خیال نہیں، وہ پتھر، جانور، آفتاب اور درخت کو ضرور پوجتے ہیں لیکن ان کی پرستش میں جو اخلاص ہے وہ قابل قدر ہے، ان کو پوجنے کے باوجود وہ اس کے قائل ہیں کہ یہ سب ایک ہی خالق کی مخلوقات ہیں، وہ اس کی اطاعت کے منکر نہیں[5]۔ ہندوؤں کی بت پرستی کے متعلق خسرو کا یہ شعر تو بہت مشہور ہوا۔

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری
ہم زوے آموز پرستش گری[6]

ہندوستان کی فضیلت

ہندوستان کی فضیلت بیان کرنے میں خسرو کا قلم چلا تو رکا نہیں، اسی لئے ایک دوسرے انداز میں اس کی برتری بتانا شروع کر دیا ہے، اس کی فضیلت کے دس اسباب بتائے ہیں مثلاً یہاں علم اور جگہوں کے مقابلہ میں زیادہ رہا، یہاں کے لوگ دوسری جگہوں کی زبان سیکھ کر بول سکتے ہیں، مگر دوسری جگہ کے لوگوں کی زبان یہاں کی زبان بولنے میں سل جاتی ہے، دوسرے ممالک کے لوگ یہاں کے علوم سیکھنے کے لئے آئے، مگر ہندوستان کے لوگ علوم سیکھنے کے لئے کہیں اور نہیں گئے، ہندسہ ریاضی اور ایجاد صفر یہاں کی خاص چیزیں ہیں، کلیلہ و دمنہ جیسی کتاب کہیں اور نہیں لکھی گئی، شطرنج یہیں کی ایجاد ہے، کلیلہ و دمنہ اور شطرنج

---

[1] مثنوی نہ سپہر بمبئی اڈیشن ص ۱۶۱ [2] ایضاً ص ۱۰۲۔۱۶۱ [3] ایضاً ص ۱۶۲ [4] ایضاً ص ۱۶۳ [5] مثنوی نہ سپہر بمبئی اڈیشن ص ۱۶۵ [6] ایضاً ص ۷۲۔۱۶۶۔

کی مقبولیت و شناسی ہوئی، یہاں کی برتری کو برقرار رکھنے میں یہاں کی موسیقی کو بھی بڑا دخل ہے، یہاں کی موسیقی کو جو ترقی ہوئی وہ کہیں اور نہیں ہوئی، یہاں کی موسیقی سے جنگل کے ہرن بھی بے جان ہو جاتے ہیں، آخر میں خسرو ہندوستان کی فضیلت میں بھی اپنے کو شمار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس کا جیسا ساحر شاعر جو کہیں اور نہیں پیدا کیا

محنت وہ آنکہ چو خسرو بہ سخن
سحر گری مست بہ چرخ کہن

زبانوں میں سنسکرت کی برتری کا اعتراف

اپنی وطن دوستی میں یہاں کی مختلف زبانوں میں عربی، فارسی، اور ترکی کے علاوہ ہندوی، سندھی، لاہوری، کشمیری، کبری، دھورسمندری، تلنگی، گجری، معبری، گوری، بنگالی، اودھی اور سنسکرت کا بھی ذکر کرتے ہیں[1]، لیکن ان سب میں سنسکرت کو افضل بلکہ فارسی سے بھی برتر قرار دیا ہے، البتہ عربی سے اس کو بہتر نہیں سمجھتے ہیں، مگر اس کی برتری کو فارسی کے برابر ہی تسلیم کیا ہے۔

آسمانے بہ رفعت دروری
از عربی کمتر و برتر زدری
گرچہ کہ تیر ہست زرس و گریں
ذوق عبارت کم ازاں نیست دریں[2]

ہندوستانی جانوروں کی تعریف

امیر خسرو کو ہندوستان کی ہر چیز پیاری رہی، تو پھر یہاں کے جانوروں کی طرف ان کی پیاری نگاہیں کیوں نہ جاتیں، ان کے اوصاف بیان کرنے میں بھی اس کے وطنی جذبات خوب ابھرے ہیں[3] لکھتے ہیں کہ یہاں کے طوطے آدمی کی طرح بول سکتے ہیں، مینا یہاں کا خاص پرندہ ہے جو کہیں اور نہیں پایا جاتا، یہ بھی آدمی کی طرح بول سکتا ہے، یہاں کے کوّے مستقبل کی خبریں دیتے ہیں، یہاں کی گوریائیں بھی پوشیدہ باتوں کی خبر دیتی ہیں، یہاں کے طاؤس میں دلہن کی ایسی رعنائی ہے، یہاں کے بگلے تھوڑی سی تربیت کے بعد عجیب و غریب کرتب دکھاتے ہیں، یہاں کی بکری ایک پتلی لکڑی پر چاروں پاؤں رکھ کر کھڑی ہو جاتی اور رقص کرتی ہے، یہاں کے بندر اپنی عقل میں انسان کی حد تک ہیں، یہاں کے ہاتھی بظاہر حیوان ہیں لیکن عمل میں انسان ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستان کے جادوگروں کی تعریف

خسرو کی توجہ ہندوستان کے جادوگروں کی طرف بھی ہوئی، لکھتے ہیں کہ یہاں کے جادوگر مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں، سانپ کے کاٹے ہوئے مردوں کو چھ مہینے کے بعد بھی زندگی دے سکتے ہیں، یہاں عمر بھی بڑھائی جا سکتی ہے، یہاں کے جوگی حبس دم کی مشق کر کے دو سال تک زندہ رہ سکتے ہیں، یہاں کے اثر میں بارش بھی روکی جا سکتی ہے وغیرہ وغیرہ، یہ باتیں عمل میں آتی یا نہ آتی ہوں، مگر خسرو ہندوستان کی بڑائی بیان کرنے میں یہ سب کچھ جوش و خروش میں لکھ سکتے ہیں۔

ہندو عورت و مرد کے جذبۂ وفاداری کا احترام

خسرو اپنے ہم وطن ہندو عورت اور مرد کی اس خوبی سے متاثر تھے کہ وہ اپنے شوہر کی خاطر اپنے کو جلا کر راکھ کر سکتی ہیں، اور مرد اپنے بت اور آقا کی خاطر جان دینے میں دریغ نہیں کرتے، ان کی اس وفاداری کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے خسرو لکھتے ہیں کہ اسلام میں ایسی چیزیں تو جائز نہیں، لیکن شریعت اجازت نہ دیتی تو وہ اس وفاداری کی سعادت کو حاصل کرنے کی تلقین کرتے۔[4]

ہندوستانی حکمراں کے طبقہ کی ذمہ داریاں

ایک محب وطن کی حیثیت سے خسرو کی نظر اس ملک کے حکمراں طبقہ کی طرف بھی اٹھی ہیں، ان کی دلی خواہش یہی رہی کہ اس ملک کے بادشاہ، حکمراں، لشکری اور عام باشندے اپنے سیرت و کردار اخلاق و اطوار میں اچھے سے اچھے ہوں، اسی لئے وہ بادشاہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ وہ دیندار رہے، اس کی ہر رائے محکم ہو، جو کچھ کہے اس پر عزم و سکون کے ساتھ عمل کرے، کسی کام میں عجلت کو راہ نہ دے، انصاف پسند ہو، ظلم کی آواز اس کے کانوں میں نہ پڑے، خواص و عوام کی آسودگی کا خیال یکساں طور پر رکھے، تاکہ جنگل اور محل کے رہنے والے دونوں خوش رہیں[5] امراء کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اگر ان کو خدا کو خوش رکھنے کا خیال غالب رہے گا تو وہ اپنے ملک کے بادشاہ کو بھی خوش رکھ سکتے ہیں، حقیقی مالک کی اطاعت گذاری ہی سے دنیاوی مالک کی فرمانبرداری آ سکتی ہے[6]، وہ ہندوستانی لشکریوں میں بھی اچھے سے اچھے اوصاف دیکھنا چاہتے تھے، اس لئے ان کو بھی نصیحت کی کہ وہ مذہبی سرگرمی کی خدمت انجام دیتے رہیں، غارت گری اور ماموری کے لئے نہ لڑیں، رعایا کی کھیتی کی حفاظت ہر حال میں کریں، جو بھی لشکر سے کاشتکار کو حقیر تصور کرتے ہیں، ان کو ایسے گھوڑوں کے پیٹ میں جانے نہ دیں[7]

اچھے ہندوستانی کے اوصاف

پھر ایک اچھے ہندوستانی کے یہ اوصاف بتاتے ہیں کہ وہ سچے، خوش خو، نیک خواہ ہوں، غصے میں دیوانے نہ بن جائیں، فریب سے احتیاط کریں، خیانت سے اجتناب کرتا ہے حسد اور بخل سے دور رہ کر کوئی اور بُرائی نہیں[8]

وطن کے علاقے کی تعریف

امیر خسرو ہندوستان کی محبت کا راگ اپنی زندگی کے آخر وقت تک الاپتے رہے

---

[1] ایضاً ۱۷۹ [2] ایضاً ۱۹۱-۱۸۱ [3] ایضاً ۱۹۱-۱۸۱ [4] ایضاً ۱۹۴-۱۹۱ [5] مثنوی دول رانی خضر خاں[؟] بمبئی ایڈیشن ص ۹۵-۱۹۴ [6] ایضاً ۲۹-۲۲۸ [7] ایضاً ۲۲۹ [8] ایضاً ۵۸-۲۵۶

ان کا آخری دیوان نہایۃ الکمال ہے[1] اس میں حمد، نعت اور منقبت کے ساتھ حسب معمول سلاطین اور امرا دوستوں کی شان میں قصیدے ہیں، لیکن ان کو جہاں بھی موقع ملا ہے وہ اپنی وطنیت کے سارے اپنی محبت کے نغمے بلند کرتے رہے ہیں، دیوگیر کا ذکر آگیا ہے وہاں سے دور دراز حصے میں واقع تھا، لیکن ان کے وطن کا علاقہ ہو گیا تھا، اس لئے اس کو مصر اور بغداد پر فضیلت دے دی ہے، اور پھر شاعرانہ انداز میں کہہ گئے ہیں کہ مصر نے اس کی شہرت سن کر گویا رشک و حسد میں اپنا جامہ اتار کر نیل میں پھینک دیا ہے، اس کی ہوا میں مسیحائی اور پانی میں آب خضر کی تاثیر ہے،[2] یہاں کے پھولوں، خوشبوؤں اور پرندوں سب کی ہی تعریف کی، یہاں کے پھلوں کا ذکر کرتے ہوئے کیلے کے متعلق لکھا۔ ہلال کی طرح خم اور شہد کی طرح خوش گوار ہوتے ہیں۔ آموں کو شہد اور دودھ سے بھرے ہوئے سبز ڈبے سے تشبیہ دی، یہاں کے پان کی بھی تعریف کی[3]۔ دیوگیر کے کپڑے کی مدح میں اپنے تخیل کو پورے طور پر بروئے کار لے آتے ہیں، کہتے ہیں اگر چاند کی جلد کوئی جلاد اس سے علیحدہ کر دے اور پھر اسی جلد سے دیوگیر کے کپڑے کا موازنہ کیا جائے تو کپڑا اپنی باریکی میں بڑھ جائے گا، اس کا ایک سوگز سوتی کپڑا ناخن میں سما سکتا ہے، اس سے لباس سا کر پہنا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بدن پر صاف صاف پانی پڑ رہا ہے۔

چہ وصف جامہ کنم کانچناں باشد اگر
زمہ سلخ کند پوست آخر جلاد
بچشم سوزن صد گز نگنجد از پس لطف
ز رو بجلہ چو دوک سوزن پولاد
سان قطرۂ آب توان گفتن اگر
چکد رحیتۂ خور مطر باعث

دیوگیر کی موسیقی کے بھی وہ فریفتہ ہوئے، اس کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ یہاں کے چنگ کی آواز سے زہرہ بھی نالہ و فریاد کر سکتی ہے، اور رباب کے نغمے سے مردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں۔[4]

دگر سرود جہاں کز عراق بر زہرہ
چو چنگ خوش کند زہرہ نالہ و فریاد
خوش آن رباب اگر مردہ زندہ گردد از آں
کہ نغمہ در دل نغز جان نوازیاد

ہندوستانی موسیقی سے محبت

خسرو اپنی مثنوی نہ سپہر میں لکھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی ایک آگ ہے جو قلب اور روح دونوں کو جلاتی ہے، اور دوسرے تمام ممالک سے بہتر ہے وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی صرف آدمیوں کو نہیں بلکہ جانوروں کو بھی مسحور کر دیتی ہے، شہ ہرن کو اس کے ذریعہ مسحور کر کے شکار کر لیا جاتا ہے،[5] وہ ایرانی طرز موسیقی سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے، اور جب ان کے اور دوسرے ہم مذہب ایرانی طرز کے گانے سننے میں مشغول تھے، تو انہوں نے ہندی راگ اور ایرانی راگ راگنیوں کو ملا کر نئے راگ پیدا کر کے اس میں ایک خاص کیف پیدا کی، ان ہی کی طرف مجیر، سنم، زیلف، سازگری، ایمن، عشاق، موافق، غنم، فرغنہ، سرپردہ، باخرز، فردوست، اور محرم منسوب ہیں، راگ درپن کے مصنف کا خیال ہے کہ مجیر غار اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے، سنم میں کلیان کے ساتھ ایک ایرانی راگ شامل ہے، سازگری میں پوربی، گوری، کنگلی اور ایک فارسی راگ کا امتزاج ہے، زیلف میں کھٹ راگ کو شہناز سے ملاتا ہے، ایمن میں ہنڈول اور نیریز ملے ہوتے ہیں، سارنگ، بسنت اور نوا کے راگ ہیں، موافق میں ٹوڑی، مالوی، درگا اور حسینی ملے ہوتے ہیں، غنم میں پوربی کو ذرا تغیر کر دیا گیا ہے، فرغنہ میں کنگلی اور گوری کو ملاتا ہے، باخرز میں دیسکار کے ساتھ ایک ایرانی راگ ہے، سرپردہ میں سارنگ بلاول اور راست کو مرکب کیا ہے، فردوست میں کانہڑا، پوربی اور ایک ایرانی راگ کا امتزاج ہے، اور ٹوڑی اور عراق کو ملا کر محرم بنایا گیا ہے۔

(راگ درپن قلمی نسخہ دارالمصنفین اعظم گڑھ)

بادشاہ نامہ کا مصنف عبدالحمید لاہوری لکھتا ہے کہ ہندوستان میں خسرو سے پہلے کبت، چھند، دھرپد اور بسنت گائے جاتے تھے، لیکن خسرو نے خاص خاص چیزیں ایجاد کیں، ان میں چار کے نام اس نے خاص طور پر لئے ہیں (۱) قول جس میں فارسی اور ہندی کے اشعار ہوتے ہیں، جو ایک سے چار تال پر گایا جاتا (۲) دوسری چیز کا نام لئے بغیر لکھتا ہے کہ اس میں فارسی اشعار ترانہ کے ساتھ ایک تال پر گائے جاتے، شاید یہ ترانہ ہو، (۳) اشعار نہیں ہوتے تھے، لیکن ایک تال پر گایا جاتا (۴) خیال[6]

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خیال حسین شاہ شرقی کی ایجاد ہے، لیکن کچھ ارباب فن ایسے بھی ہیں جو خسرو کو خیالیوں کا نائک کہتے ہیں، اور خیال کی ایجاد ان ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں، امیر خسرو کے زمانے میں سنسکرت میں دھرپد زیادہ گایا جاتا جو زیادہ تر ہندوؤں کی مذہبی روایتوں پر مبنی ہوتا، مسلمان دھرپد کے تقدس اور اس کی کلاسیکی اہمیت سے پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے، اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ امیر خسرو کے اختراع پسند ذہن نے دھرپد کی جگہ خیال ایجاد کیا، آل انڈیا ریڈیو کے سابق ڈائرکٹر آف میوزک ڈاکٹر [illegible] کا بیان ہے کہ قوالی کے چلت بول اور جزئیات سے خیال وجود میں آیا، اس لحاظ سے بھی خیال امیر خسرو ہی کی ایجاد سمجھا جاتا ہے کیونکہ قوالی بھی امیر خسرو ہی کی اختراع ہے، قوال تو امیر خسرو ہی کو اپنا ابوالآبا سمجھتے ہیں، قوالی میں غزل کا حسن، موسیقی کا روپ اور ارباب دل کا کیف حاصل ہوتا ہے، امیر خسرو غزل گو تھے، موسیقی کے ماہر بھی تھے، اور صاحب دل بھی تھے، اس لئے قوالی کی ایجاد کے لئے وہی موزوں ہو سکتے تھے، عام روایت یہی ہے کہ خسرو نے ہندوؤں کے دینا اور ایرانی طنبورہ کو ملا کر ستار کی ایجاد کی، دسویں صدی سے پہلے کسی شکل میں ایشیائے کوچک، ایران، آرمینیا اور ترکستان میں ستار ضرور موجود تھا

---

[1] نہایۃ الکمال ص ۱۵ [2] ایضاً ص ۵۲ ۱۵ [3] ایضاً ص ۵۲ ۱۵ [4] ایضاً ص ۵۲ ۱۵ [5] نہ سپہر ص ۱۰۱-۲ [6] بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری جلد دوم ص ۵-۶۔

اور یہ ہیر دلی گھروں ہی سے ہندوستان پہنچا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی مشہور ہے کہ پہلے ستار میں چار تار ہوا کرتے تھے مگر خسرو نے اس میں ایک تار اور بڑھا دیا تھا اور اس کا نام سہ تار رکھ کر خسرو کی طرف منسوب ہو گیا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ طبلہ بھی امیر خسرو ہی کی ایجاد ہے لیکن اس کی ایجاد بھی عام طور سے انہی کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔[1]

وطنی محبت کے جذبے میں امیر خسرو ہندوستانی عورتوں کے گیت سے بھی متاثر ہوئے اور خود ان کے جذبات کا اظہار اپنے ہندی گیتوں میں کرنے لگے۔ شادی بیاہ کے موقع پر جو گیت اور ڈھول گائے جاتے ہیں، ان میں سے سب کچھ امیر خسرو کی طرف منسوب ہیں محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں کہ دلی بلکہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں رسم ہے کہ عام عورتیں برسات کی بہار میں گھر گھر جھولا ڈلواتی ہیں، درخت میں جھولا ڈالتی ہیں، مل مل کر جھولتی ہیں، اور گیت گا گا کر جی خوش کرتی ہیں، ان میں شاید ہی کوئی عورت ہو جو یہ گیت نہ گاتی ہو۔

آج بنو نہ آوے سوامی ہو
اے ہو جو پیا آون کہہ گئے
آون آون کہہ گئے
آئے نہ بارہ ماس
اے ہو جو پیا آون کہہ گئے

یہ گیت امیر خسرو کا ہے اور سروا راگ میں لے بھی انہی کی رکھی ہوئی ہے، محمد حسین آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ موسیقی میں امیر خسرو کی طبیعت ایک ہی بھی کرشن کنہیا کی سی تھی، اس لئے دھرپد کی جگہ قول بنایا۔ ساگر بہت سے راگ ایجاد کیے کہ ان کے اکثر گیت آج تک ہندوستان کے مردوں اور عورتوں کی زبان پر ہیں، بہار راگ بسنت کے ملنے ہی نے ان کی طبیعت سے رنگ پکڑا ہے، میں کو جھکر کر کے ستار انہوں نے نکالا ہے۔[2]

خسرو کے بسنت کے گیت کی روایت اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ان کے شیخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ایک بھانجے مولانا تقی الدین تھے، جن کو حضرت خواجہ بہت محبوب رکھتے تھے، ان کا انتقال عین شباب میں ہو گیا، حضرت خواجہ اس سے بڑا صدمہ پہنچا، چھ مہینے تک ان پر سکوت طاری رہی، اس سے امیر خسرو مغموم رہتے تھے۔ وہ برابر اس فکر میں رہتے تھے کہ کس طرح مرشد کا غم غلط ہو، اس زمانے میں ہندوؤں کا بسنت کا میلہ لگا۔ وہ دہلی میں کالکاجی کے مندر پر سرسوں کے پھول چڑھا رہے تھے اور مست ہو کر گیت گا رہے تھے، امیر خسرو بھی اس منظر کو دیکھ کر بے خود ہو گئے، فارسی اور ہندی کے چند اشعار اسی وقت موزوں کئے، سرسوں کے پھول توڑے اور پگڑی پر لگا کر مستانہ شان پیدا کی، جھومتے جھامتے اشعار پڑھتے حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اس وقت اپنے بھانجے کے مزار پر تھے، امیر خسرو کی مستانہ ادا دیکھ کر اور ان کے اشعار سن کر مسکرانے لگے، پھر تو امیر خسرو کا کام بن گیا اس روز سے دہلی میں جب ہندو کالکاجی کے مندر پر جاتے تو دہلی اور قرب و جوار کے صوفیہ قوالوں کو لے کر پھول کے پھول ہاتھوں میں لئے اشعار پڑھتے ہوئے مولانا تقی الدین کے مزار پر جاتے وہاں سے حضرت خواجہ کے مزار پر آتے ہیں ان اشعار میں ایک شعر یہ بھی ہے۔

اشک ریز آمد ست ابر بہار
ساقیا گل بریز بادہ بیار

قوال ہندی کی ٹھمریوں کو پڑھ پڑھ کر اسی شعر کو بار بار دہراتے، ہندی کا ایک مصرع یہ ہے۔

عرس یار توری بسنت مانی

یہ جلسہ تو بڑا اثر پیدا ہوتا، رفتہ رفتہ دہلی کی درگاہوں میں ہندو رسم تک بسنت منائی جانے لگی، دوسری جگہوں میں بھی مسلمان بسنت منانے لگے بسنت کے موقع پر امیر خسرو کا ایک گیت ان کی طرف اس طرح بھی منسوب ہے۔

حضرت خواجہ سنگ کھیلے دھمال
بائیس خواجہ مل بن بن آیو تاہیں   حضرت رسول صاحب جمال
حضرت خواجہ سنگ کھیلے دھمال
عرب یار تیرو بسنت مناتو   سدا رکھیے رکھیے لال گلال
حضرت خواجہ سنگ کھیلے دھمال[3]

ہندی زبان سے محبت

امیر خسرو نے اپنی وطنی محبت کی بنا پر یہاں کی زبان ہندی نہ صرف سیکھی بلکہ اس میں مہارت پیدا کی اور فخر کے ساتھ کہا کہ وہ ہندوستانی ترک ہیں، ہندی بول سکتے ہیں، وہ مصری نہیں کہ عربی میں گفتگو کریں۔[4]

ترک ہندوستانم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

اور یہ بھی کہ وہ طوطی ہند ہیں، ان سے کوئی ہندی میں سوال کرے تو وہ میٹھی ہندی میں بول سکتے ہیں۔

چو من طوطی ہندم راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

وہ اپنی عبارتوں میں جہاں کہیں بھی ہندی الفاظ خوبصورتی سے استعمال کر سکتے تھے کرتے رہے، وہ خود کہتے ہیں کہ وہ ہندی میں اشعار کہہ کر اپنے دوستوں میں تقسیم کرتے رہے مگر انہوں نے ان کا کوئی مجموعہ تیار نہیں کیا،[5] یہ زیادہ تر عرفی اشعار تھے جن کو انہوں نے محفوظ رکھنا ضروری نہیں سمجھا، اب بہت سے ہندی اشعار ان کے نام سے منسوب ہیں، جن کے متعلق یہ شبہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے واقعی ہیں بھی کہ نہیں، وہ بلند پایہ اشعار بھی نہیں البتہ ان کی تصنیف خالق باری کے متعلق یہ یقین ہوتا جا رہا ہے کہ یہ انہی کی تصنیف ہے، گو یہ بھی شک و شبہ سے خالی نہیں، اس کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ بازی جانے والے بڑے اور بچے ہندی

1. اسلامک کلچر حیدرآباد، جنوری ۱۹۵۵ء۔ 2. آب حیات ص ۶۹ 3. پوری نظم امیر خسرو کی ہندی شاعری مرتبہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی میں درج ہے ص ۱۵۰۔ ۱۴۹ 4. دیباچہ غرۃ الکمال 5. پیرڈ ہسٹری لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو از ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۲۲ ـ ۲۲۷۔

سے بھی واقف ہوں ۔ یہ کتاب خسرو جیسے عبقری شاعر کے شایانِ شان نہیں ہو سکتی مگر یہ کوشش اس لحاظ سے اہم ہے کہ رفتہ رفتہ ہندی اور فارسی کی آمیزش سے ایک ایسی زبان سامنے آئی جس کو اردو کہا جانے لگا ۔ خسرو کی کچھ ایسی بھی غزلیں مشہور ہیں جن کا ایک مصرعہ ہندی اور دوسرا فارسی میں ہے ۔ اسی لئے بعض ارباب نظر ان کو اردو شاعری کا موجد اور اس کے صنم خانہ کا پیر مغاں قرار دیتے ہیں ۔

خسرو نے اسی وطنی محبت میں یہاں کے بچوں کی تفریح طبع کے لئے بہت سی پہیلیاں اور مکرنیاں بھی لکھیں جو آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں ۔ یہاں کی لڑکیوں کی دلچسپی کے لئے بھی کچھ گیت لکھے ۔ ان سب کو ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے اپنی کتاب امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری میں ان کی خالق باری کے ساتھ بوجھ پہیلی ، بن بوجھ پہیلیاں ، کہہ مکرنیاں ، دو سخنے ، ستیں ، غزل ، دوہے ، آنکھ کا لسم ، بسنت ، ساون ، کاگیت ، ڈھکوسلا وغیرہ کے عنوانات سے ایک جگہ جمع کر کے ایک مفید کام انجام دیا ہے ۔ معلوم نہیں اس میں وہ نام کیوں نہیں شامل کئے گئے ہیں جو خسرو سے منسوب ہیں ۔ یہ ساری چیزیں سامنے آگئی ہوتیں تو فیصلہ ہو سکتا کہ کیا چیزیں ان کی ہو سکتی ہیں اور کیا غلط ان کے نام سے منسوب ہو گئی ہیں ۔

تمت

خسرو نے اپنی فارسی شاعری میں اپنی وطنیت کا جو راگ الاپا ہے وہ ایک مستقل پیام ہے کہ ہم جس ملک میں پیدا ہوتے ہیں اور جہاں نشو و نما پاتے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ اس کی ہر چیز کو محبوب رکھیں ۔ اس کا ہر شہر ، اس کے باشندے ، اس کی آب و ہوا ، اس کی زبانیں ، اس کے علوم و فنون ، اس کی عورتوں کا حسن اس کے پھول ، پھل ، جانور اور یہی کہ اس کے جادوگر اور برہمن بھی محض اس لئے عزیز ہوں کہ وہ وطن کے ہیں ۔ وہ اپنی مذہبیت میں اپنی مثال آپ رہے ۔ اور کہنے جیسے کے سوز عشق الہٰی برحق ۔ ان کے مرشد حضرت خواجہ نظام الاولیاءؒ کو فخر رہا ۔ اسی کے ساتھ اپنی وطنی محبت کو اپنے ایمان کا جزو بنائے رکھا ۔ انھوں نے مذہب کے جام شریعت اور وطنیت کے سندان عشق کو جس آمیزش سے باہمی محبت ، یگانگت ، مفاہمت اور اتحاد و یک جہتی کی جو گنگا بہائی اس سے ان کی ذات اس روشنی کا ایک مینار رہ گیا ہے کہ مذہب کی راسخ العقیدگی دوسروں کے مذہبی عقائد کے احترام میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتی ۔ مذہب کی پاسداری اور عمل میں سچا اخلاص ہو تو یہی سچائی دلوں میں فراخ دلی پیدا کر سکتی ہے جس سے بلند کی تعمیر آسانی سے ہو سکتی ہے ۔

بقیہ ۔ امیر خسرو بحیثیت ایک عوامی شاعر

خسرو کے عہد میں دیسی اور فارسی لفظوں کے میل سے ایک نئی زبان بن رہی تھی ۔ ایسے وقت پر خسرو کی دور رس نظروں نے فرہنگ کی ضرورت کو بھی محسوس کیا ۔ انھوں نے اپنی ہندوی اور فارسی پہیلیوں ، دوسخنوں اور فرہنگ نامے خالق باری میں ٹھیٹھ دیسی الفاظ کے مقابل فارسی کے علمی الفاظ رکھ کر دیسی الفاظ کے صحیح معنی متعین کرنے کی کوشش پہلی بار کی ہے ۔

خالق باری خسرو کی مقبول ترین تصنیف ہے جو سارے ہندوستان میں مختلف بولیوں کے حلقوں میں سات سو سال تک مکتبوں پر چھائی رہی ۔ اس کتاب نے سارے ملک کو ایک ہندوستانی گر زبان تو سکھائی لیکن مکتبوں کے ماحول میں خود بھی تحریف اور تخریب کی زد میں آگئی ۔ اس میں بعض جگہ خسرو کی بات سے مطابقت ، ناموزوں اشعار اور غلط الفاظ آگئے ہیں لیکن اس کے معنی نہیں کہ اس تصنیف کا رشتہ ہی خسرو سے توڑ دیا جائے ۔ خسرو کے جشن ہفت صد سالہ کے موقع پر خالق باری کے یہ سارے نقائص دور کرنے کی ایک اجتماعی اور متفقہ کوشش ہونا چاہئے ۔ خالق باری ایک مختصر کتاب ہی لیکن تاریخ زبان میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے ۔

بقیہ ۔ حیات خسرو

صنعت بھی خاص ان کی ایجاد ہے ۔ اس میں التزام ہے کہ جو لفظ آتا ہے اس کے بعد کا لفظ دوسری زبان کے لحاظ سے پہلے لفظ کا ترجمہ ہوتا ہے مثلاً

شو رای رخ تو کشت مارا

فارسی مصرع ہے لیکن کشت کا اگر اردو میں ترجمہ کریں تو "مارا" ہوگا ۔ اس لئے مصرع اخیر لفظ پہلے لفظ کا ترجمہ بھی ہے ۔ امیر صاحب نے اس صنعت میں پورے مثنوی کی جانا لکھی ہے ۔

محتمل المعانی

یک شعر میں ایک لفظ لائے ہیں کہ اس کے مناسب معنی ہیں اور ہر معنی وہاں مراد لئے جا سکتے ہیں ۔

موقوف الآخر

ایک رباعی لکھی ہے ۔ جس کا ہر قافیہ دوسرے مصرعہ کا آغاز کا محتاج ہے مثلاً

در حسن ترا کسے نماند الا — خورشید کہ ہر صبح بروں آید تا
خدمت کند و پائے تو بوسد اما — می ترسد او ز چوب پا بوس تا

اسی صنعتوں اور بحاکادشوں میں کئی جلدیں لکھ ڈالی ہیں ۔ اگر کسی صاحب کو تفصیل سے زیادہ شعر کا ذوق ہو تو اعجاز خسروی موجود ہے مطالعہ فرمائیں ۔

محمد عمر

امیر خسرو کی حب الوطنی

دنیا کے بڑے آدمیوں کے حالات کا مطالعہ کرتے وقت یہ دیکھنا چاہیے کہ
اں وہ ایسے حالات و ماحول کا ماحصل تھے اور کس حد تک انھوں نے بذاتِ خود
ر دوپیش کے حالات پر اثر انداز ہوئے اور ان کو تبدیل کرنے کے کام میں حصہ لیا
ہاں تاریخ ایک طرف بڑے آدمی بناتی ہے وہاں دوسری طرف بڑے آدمی تاریخ
نے ہیں۔ دونوں لحاظ سے حضرت امیر خسرو ہندوستان کی ہندی اور مدنی یکجہتی
تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف اس دور کی وہ صحیح نمائندگی کرتے
ں اور دوسری طرف ہندوستان کی تاریخ پر ان کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔

حضرت امیر خسرو غالباً وہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنھوں نے خلوص نیت
ے وطن کی محبت، رواداری، وسیع المشربی، فراخدلی، کشادہ دلی اور ان کے
ریعہ تہذیبی یکجہتی کی تبلیغ اپنی منظوم اور منثور تصانیف میں کی اور اسے طرز
ل میں اُن صفات کو عملی جامہ پہنایا۔ ان کی نظر میں ہندوستان زمین پر جلد
ں تھا۔ اس ملک کے لوگ، اُن کے علوم، فنونِ لطیفہ، یہاں کی آب و ہوا،
سم، پھل پھول، چرند و پرند، عمارتیں، ندی نالے اور دریا، سماجی اور مذہبی رسوم
ں کہ ہر چیز دوسرے ملکوں پر فوقیت اور برتری کی حامل تھی۔ ہندوستان کی سرزمین
ے امیر خسرو کو اس لیے جذباتی لگاؤ تھا کیونکہ اُن کا جنم اسی سرزمین پر ہوا تھا۔
ں کی والدہ ہندی نژاد تھیں۔ وہ بھی اسی ملک میں پیدا ہوئیں۔ اور اسی آب
ہوا، تہذیب و تمدن میں پل کر وہ بڑی ہوئیں۔ اس وجہ سے ان کے رگ و
ے میں ہندوستانی معنوی اور ظاہری دونوں لحاظ سے سرایت کر چکی تھی۔ امیر
رو پر ان کا بہت گہرا اثر تھا۔ امیر خسرو نے بیرونی ممالک سے اپنے آبائی تعلقات

کو بالکل فراموش کر دیا تھا۔ ہندوستانی تہذیب کی معنوی روح کو صحیح اور
گہرے انداز میں جذب کیے بغیر اور اُن اقدار کو اچھی طرح سمجھے بغیر جن کی وہ حمایت
کر رہے تھے، یہ رجحان ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

"خزائن الفتوح" کی بعض عبارتوں کے مطالعہ سے بادی النظر میں ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ امیر خسرو متعصب اور راسخ مذہبی آدمی تھے لیکن حقیقت اس کے برعکس
ہے۔ اس سلسلے میں سومنات کے بارے میں اُن کا بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے[1]

امیر خسرو کے آبا و اجداد کا اصلی وطن کش شہر تھا جو بعد میں قبۃ الخضر (شہر سبز) کے
نام سے مشہور ہوا۔ اس خاندان کا تعلق ہزارہ قبیلہ سے تھا۔ اور یہ قبیلہ ہزارہ لاچین
کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ یہ قبیلہ نسلاً ترک تھا۔ چونکہ خسرو کے والد امیر
سیف الدین محمود بھی اس قبیلہ کے ایک فرد تھے۔ اس لیے خسرو نسلاً ترک ہوئے۔

ہندوستان آنے کے بعد امیر سیف الدین محمود کی شادی عماد الملک[2] کی بیٹی
سے ہوئی اور ۱۲۵۲ء یا ۱۲۵۳ء میں پٹیالی ہی میں خسرو تولد ہوئے۔

خسرو نے اپنے ہندی نژاد ہونے کا خود ذکر کیا ہے اور حب الوطنی کی دلیل
اس طرح پیش کی ہے۔

ہست مرا مولد و ماویٰ و وطن

دوسری ایک جگہ خسرو نے جہاں اپنی عربی دانی کا ذکر کیا ہے وہاں اس بات
کا واضح طور پر اعتراف کیا ہے کہ ان کے عربی کلام میں وہ شیرینی اور حلاوت نہیں ہے
جو ایک عرب شاعر کے ہاں پائی جاتی ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ
وہ ہندی نژاد ترک تھے۔

---

[1] "خزائن الفتوح" روضہ ہندوستان کہ خوشتریں ولایت او بہار است" ۴۴ [2] "خزائن الفتوح" (رفاعی) ۵۲

سلطان التمش کے نامور امیروں میں عماد الملک کا شمار ہوتا تھا۔ دورِ شمسی اور بلبنی میں بیس سال تک وہ "عارض ممالک" کے عہدے پر رہے اور دورِ شمسی میں حکومت کو استحکام
دینے میں انھوں نے بڑا اہم حصہ لیا۔ بقولِ خسرو، ان کے نانا کا شمار سلطنت کے چار ارکان میں ہوتا تھا اگرچہ وہ کوئی تاج بادشاہت نہ رکھتے تھے لیکن بادشاہوں کو تخت پر بٹھایا
تے تھے اور اپنی جود و سخا سے تمام ہندوستان کو اپنی مٹھی میں لے لیا تھا۔ پان کھانے کے بڑے شائق تھے اور ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن[1]

زندہ رہنے خسرو نے تمام مروجہ علوم و فنون پر قابلِ قدر دسترس حاصل کر لی تھی جیسا کہ ان کی منظوم اور منثور تصانیف سے عیاں ہے وہ مذہب، تصوف، فقہ، نجوم، منطق اور صرف و نحو میں غیر معمولی درک رکھتے تھے۔ انھیں عربی زبان و علم و ادب سے اچھی خاصی واقفیت حاصل تھی سنسکرت زبان بھی جانتے تھے نیز ہندوستان کی علاقائی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ کیونکہ انھیں سلاطین کی معیت میں مختلف صوبوں اور علاقوں میں جانے، وہاں قیام کرنے، وہاں کے لوگوں سے ملنے جلنے اور وہاں کے رسوم سے وقوف حاصل کرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ علم موسیقی میں ان کی مہارت مسلمہ تھی جس کا بعد میں مجملاً ذکر کیا جائے گا۔ تاریخ دانی میں انھیں ملکہ حاصل تھا، تاریخی واقعات کو بڑی صحت، خوبی، جامعیت سے بیان کیا ہے۔ شاعر ہوتے ہوئے بھی تاریخی واقعات کے بیان میں انھوں نے مبالغے سے کام نہیں لیا۔ مختصراً وقت کے ساتھ ساتھ ان کا افقِ علم و معرفت وسیع ہوتا گیا اور جذبۂ حب الوطنی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

شیخ نظام الدین اولیاء اور حضرت امیر خسرو

انسانی زندگی کو دو اہم شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دنیاوی اور روحانی۔ دنیاوی زندگی گھر کے ماحول اور زمانے کے حالات سے متأثر ہوتی ہے اور روحانی زندگی پر روحانی پیشوا اثر انداز ہوتا ہے۔ دنیاوی زندگی میں ایک ایسا بھی وقت آتا ہے جب انسان مادی زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے اور اس بیزاری کے عالم میں روحانی زندگی کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔ یہی حال امیر خسرو کی زندگی کا تھا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ امیر خسرو ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ درباروں سے وابستہ رہے اور بڑی دولت اور ثروت کے مالک بنے غرض تونگری میں محسودِ زمانہ تھے لیکن حصولِ دولت و جاہ و مرتبہ کے باوجود اس زیب و حشمت کے وہ اس زندگی سے بیزار تھے اور آخری زمانہ میں بار بار ملازمتِ دربار سے سبکدوشی چاہتے تھے لیکن سلاطین نے ہمیشہ انھیں اس بات سے باز رکھا۔ آخر میں انھوں نے ملازمت ترک کر دی اور فقراء کی خدمت میں لگ گئے اور شیخ نظام الدین اولیا کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے سالہا سال سلوک کی جادہ پیمائی میں لگے رہے۔

شیخ نظام الدین اولیاء کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے اور شیخ سے قریبی ملنے نے امیر خسرو کے دل میں رواداری اور بے تعصبی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ امیر خسرو نے اپنے روحانی پیشوا کی تقلید میں ہندو مسلم تہذیبی ہم آہنگی اور حب الوطنی کا ایک اہم کام شروع کیا۔ انھوں نے اپنے اس مشن کی اشاعت کے لئے اپنی تصانیف کا استعمال کیا۔ ان کا منظوم کلام اور منثور تصانیف میں زندہ روشن دلیلیں ہیں۔

امیر خسرو کی وطن پرستی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنی تصانیف میں بالعموم اور مثنوی "نہ سپہر" میں بالخصوص ایک مستقل باب ہندوستان کے فضائل کے بیان کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اور اس فضیلت کے ثبوت میں دس مختلف وجوہ اور دلائل پیش کئے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ براہین اور دلائل سے امیر خسرو نے ہندوستان کی علمی فضیلت کو ثابت بھی کیا ہے۔ اور ہندو مذہب کا، اسلام کے علاوہ، دوسرے تمام عالمی مذاہب سے مقابلہ کیا ہے اور ہندو مذہب کو ترجیح دی ہے۔ کہتے ہیں۔

برہمن ار ہستی او در بندہ نفس   از ثنوی کش بہ دوی رفتہ دلش[3]
عیسویان روح و ولد بستہ گرد   ہندو ازیں جنس بہ پیوستہ گرد
قوم مجسم ز قم جسم زدہ   زیشاں نہ دم ازیں قسم زدہ
اختریاں صنعِ خدا بردہ گماں   گفتہ بکے ہندو وراست ہماں
قوم مشبہ سوے تشبیہ شدہ   ہندو ازیں پاک بہ تنزیہ شدہ
علی دگر نور و ظلم خواندہ بدل   ہندو ازیں بابہ پیوند گسل

یعنی ثنوی فرقہ خدا کو دو مانتا ہے، اس کے برخلاف ہندو خدا کو ایک مانتے ہیں۔ عیسائی حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں، لیکن ہندو اس طرح کے عقیدوں کے قائل نہیں ہیں۔ فرقہ مجسمہ، خدا کو صاحبِ جسم مانتا ہے، لیکن ہندو ایسے اعتقاد سے مبرا ہیں۔ ستارہ پرست، ستارے خدا مانتے ہیں، لیکن ہندو اس عقیدہ کے پیرو نہیں ہیں۔ فرقہ مشبہہ خدا کو ممکنات سے تشبیہ دیتا ہے۔ ہندو اس کے منکر ہیں۔ پارسی، نور و ظلمت دو خدا مانتے ہیں لیکن ہندو اس خیال سے پاک ہیں۔ اس کے بعد بت پرستی پر طعنہ زنی کرنے والوں سے امیر خسرو کہتے ہیں کہ دوسروں کو اس طریقِ عبادت سے سبق لینا چاہئے کیونکہ اس بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندو بڑے راسخ العقیدہ لوگ ہیں۔[6]

ہندوستانی علوم و فنون کا ذکر کرتے ہوئے امیر خسرو لکھتے ہیں کہ فقہ کے علاوہ اس ملک کی مختلف کتابوں کی کتابیں اس مرتبہ کی ہیں جیسی کہ یونان میں ارسطو کی، منطق، علم نجوم، ریاضیات اور ہیئت کے علوم میں ہندوستان کے ماہرین زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ بڑے تعلیم یافتہ برہمن اس ملک میں موجود ہیں لیکن کسی بھی شخص نے ان کے اس گہرے مطالعے سے فیض حاصل نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ملکوں میں انھیں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ میں نے ان لوگوں سے کچھ تحصیل علم کیا ہے، اور اسی بنا پر میں ان کی اہمیت کو سمجھتا ہوں۔ مابعد الطبیعاتی علم میں

---

۱ مقدمۂ دیوان "غرۃ الکمال"
۲ امیر خسرو نے منظوم اور منثور تصانیف میں اپنی ہیئت دانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور علم ہیئت کی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: خزائن الفتوح (فارسی) ۴۸ - ۴۹
۳ "نہ سپہر" آسمان زمانے زمعت دردری از عربی کلکر، مترجم زوری ز ۱۸۱
۴ "تذکرۃ الشعراء" ص ۱۶   ۵ "نہ سپہر" (کلکتہ ۱۹۱۸) ۱۶۴ - ۱۶۵۔
۶ اے کہ زنی طعنہ بہ ہندو بری   از وے بیاموز پرستش گری

ہندوؤں نے یہ طریقہ ترک کر دیا ہے لیکن مسلمانوں کے علاوہ دوسری قومیں بھی اس علم سے نابلد ہیں۔ حالانکہ وہ ہمارے مذہب کی پیروی نہیں کرتے ہیں تاہم ان کے بہت سے عقائد ہم سے ملتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدت کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ میں ہر شے کو پیدا کرنے کی قدرت ہے وہ تمام چیزوں اور ساری مخلوق، آدمی، جانور اور ساری بولیوں کا قادر مطلق ہے۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ لہٰذا مشکلیں، عقائد اور ثنویوں اور منکروں سے کہیں زیادہ تر ہیں۔ حالاں کہ وہ پتھروں، سورج، جانوروں اور درختوں کی پرستش کرتے ہیں لیکن ان کا عقیدہ ہے کہ ان سب چیزوں کا خالق خدا ہے وہ ان اشیاء کو خدا کی تمثیل سمجھتے ہیں ان غیر جانداروں کا رہ خود کو مطیع نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ پرستش کا یہ طریقہ قدیم الایام سے ان کے ہاں مروج ہے وہ اس کو ترک کرنے سے مجبور ہیں۔[1]

ہندوستان سے محبت کی وجہ

مثنوی نہ سپہر میں وہ ہندوستان کا ذکر الہامی وارفتگی اور مجذوبانہ ذوق سے کرتے ہیں اور اسی عالم میں کہتے ہیں۔

حکمت و دانائی و علم و ہنر — داند چو کہ در ہند معاینت دگر

اس کے بعد کہتے ہیں کہ مجھے ہندوستان سے اس لئے والہانہ محبت ہے کہ یہ میرا مولد اور وطن ہے اور اسی جذبے کی تائید میں ایک حدیث بیان کرتے ہیں۔ حبّ الوطن من الایمان

حب وطن ہست ز ایمان یقین[2]

پھر وہ ہندوستان کو ایک جنت ارضی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے سات وجوہ بیان کرتے ہیں۔

کشور ہند است بہشتے بہ زمیں — حجتش اینک زرخ صفحہ بیں[3]
حجت ثابت چو دران ست ہفت — ہفت گویم بہ درستی یکے[4]

ہندوستان کی آب و ہوا

محمد سلیمان اشرف لکھتے ہیں۔

"شاعری پر ملک کی آب و ہوا کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ جو چیزیں کہ نگاہوں کے سامنے ہوتی ہیں اور خصوصاً ملکی جس طرح کے جذبات و کیفیات قلوب میں پیدا کرتی ہیں، اسی کو شاعری کا بار ضمیر سمجھنا چاہئے اسی لئے ہر ملک کا شاعر اپنے پسند کا معیار جداگانہ رکھتا ہے۔ ایک ہندی عاشق زلفِ معشوق کی تشبیہ و توصیف میں جھوم اٹھتا ہے۔ برسات کی رات اور کالی گھٹا کو اس کا عکس بتاتا ہے۔"[5]

ہندوستان کی آب و ہوا کا گہرا اثر خسرو کے کلام میں پایا جاتا ہے اور یہاں کی آب و ہوا کو خسرو خراسان اور دوسرے ملکوں کی آب و ہوا سے بہتر بتاتے ہیں اور اس بات کے لئے دس دلائل پیش کرتے ہیں۔

(۱) یہاں کی سردی نقصان دہ نہیں (۲) ہندوستان کی گرمی خراسان کی سردی سے بہتر ہے (۳) سرد ہوا کے خوف سے یہاں کے غربا کو سردی کے زیادہ سامان کی ضرورت نہیں ہوتی (۴) سال بھر تک یہاں گل و گل کی بہار رہتی ہے (۵) یہاں کے پھول گل باور کی طرح خوش رنگ ہوتے ہیں (۶) ہندوستان کے پھول سوکھ جانے پر بھی خوشبو دیتے ہیں (۷) یہاں آم، کیلا، الائچی، کافور اور لونگ جیسی چیزیں پیدا ہوتی ہیں (۸) خراسان کے بہت سے میوے اس ملک میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف یہاں کے میوے خراسان میں نہیں ہوتے (۹) یہاں کے نادر تحفے پان اور کیلا ہیں (۱۰) پان جیسا دنیا میں دوسرا کوئی میوہ نہیں۔[6]

ہندوستانی موسم

امیر خسرو نے اپنی مثنویوں اور قصائد میں ہندوستان کے موسموں، مثلاً موسم بہار فصلِ خزاں، برسات کی رات اور صبح و شام کی کیفیات وغیرہ کا ذکر کیا ہے فصلوں اور موسموں کا تغیر، صبح و شام اور رات اور دن کا ہونا ہر جگہ ایک منفرد پیرائے میں بیان کیا ہے مثلاً خزاں کے موسم کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔ جب فصلِ خزاں نے چمن میں لشکر پھیلایا تو بادِ خزاں نے گلزار میں اپنا گھوڑا کدا لے لگی گلِ ریحان جو پھولوں کا بادشاہ کہلاتا ہے اس کو نکال دیا۔ اس چمن کے اندر اس کی حکومت نہ رہی۔

فصلِ خزاں چوں بہ چمن خانہ ساخت — بادِ خزاں گرد بہ گلزار تاخت
شاہِ سپر غم بہ ولایت برانند — کش بہ چمن ہیچ ولایت نماند[7]

ہندوستانی جانور اور پرند

امیر خسرو نے جانور اور پرند کو اپنی محبت سے محروم نہ رکھا تھا کہتے ہیں کہ اس ملک کے طوطے آدمی کی طرح بول سکتے ہیں، مینا عرب و عجم میں نہیں پائے جاتے اور یہ پرندہ بھی آدمی کی طرح بول سکتا ہے کوا مستقل کی خبر دیتا ہے گورتا اپنی آواز پرواز وغیرہ میں عجیب و غریب ہے۔ دوسرے بہت سے عجیب و غریب پرندے اس ملک میں بھرے پڑے ہیں طاؤس اپنی خوبصورتی میں دلہن کی رعنائی رکھتا ہے۔ یہاں بگلے تھوڑی سی تربیت کے بعد عجیب و غریب کرتب دکھانے لگتے ہیں۔ یہاں پانی بھرے ایسے جانور بھی پائے جاتے ہیں۔ پرندوں کے بعد پانچ جانوروں کے اوصاف بڑی تفصیل اور جامعیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ایک ایسا جانور ہوتا ہے جو ہرن کے مانند اور گیدڑ کی

---

[1] مثنوی نہ سپہر: ۱۶۱-۱۶۵ [2] ایضاً: ۱۴۹-۱۵۰ [3] مثنوی دول رانی و خضر خاں میں کہتے ہیں۔

بہشتے فرض کن ہندوستان را — کہ ایجا است است ایں بوستان را — وگرنہ آدم و طاؤس را آنجا — کجا زیبا شدے منزل آرائے۔

برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مثنوی "نہ سپہر" ۱۴۹-۱۵۰ [4] مقدمہ "ہشت بہشت" ۲۳-۲۴ [5] مثنوی نہ سپہر ۱۵۸-۱۶۱ [6] "قرآن السعدین" ۱۵۵ برائے فصلِ بہار ملاحظہ ہو۔ ایضاً ۲۰۱، دول رانی و خضر خاں۔ خسرو کہتے ہیں کہ بعض لوگ آم کو انجیر پر ترجیح دیتے ہیں — دگر کس سوئے نو دگر دہت گیر — بعد کم لطف بادا از انجیر: ۴۳ [7]

طرح ہوتا ہے گھوڑا، بکری، ہرن اور ہاتھی۔[1]

ہندوستانی معمار

امیر خسرو نے جب ہندوستان کی قدیم عمارتوں کو دیکھا تو وہ اس ملک کے معماروں اور سنگ تراشوں کی دستکاریوں سے بہت متاثر ہوئے اور بڑی فراخدلی سے اُن کے اوصاف بیان کئے ہیں۔

یہاں کے سنگ تراش جوانے فن میں فرہاد کو مات کرتے تھے۔ پتھروں کو اس طرح اور چکنا بنا دیتے تھے کہ ان کی سطح پر سے خیال کا پاؤں بھی پھسل جائے۔ دہلی کے معمار جو فن عمارت میں یگانہ ہندوستان کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے ایک پتھر کو دوسرے سے اسی صفائی سے جوڑ دیتے تھے کہ ایک نہایت باریک بال بھی ان کی دراڑوں میں سے نہیں گزر سکتا تھا۔[2]

ہندوستان کی زبانیں

اس زمانے میں اس ملک میں بولی جانے والی اور مقامی زبانوں میں امیر خسرو نے ترکی اور فارسی کے ساتھ سندھی، ہندوی، لاہوری، گجراتی، کشمیری، کبرتی، دھور سمندری، تلنگی، گوجری، معبری، گوڑی، بنگالی، اودھی اور سنسکرت کا ذکر کیا ہے۔ سنسکرت کو عربی سے کمتر اور فارسی سے برتر بتایا ہے جبکہ ہندوی زبان میں فارسی سے کسی طرح حلاوت اور شیرینی کم نہیں۔[3]

ہندوستان کے بعض شہروں کا بیان

جن شہروں میں امیر خسرو کو قیام کرنے یا دیکھنے کا موقع ملا اُن کی توصیف بیان کرنے میں انھوں نے خوب زورِ قلم دکھایا ہے اور ان شہروں کے ذرّہ ذرّہ میں انھیں ایسی خوبی اور دلکشی نظر آئی ہے جو کسی دنیا کے کسی دوسرے شہر میں نہیں پائی جاتی۔

دلّی

دلّی اور دلّی کی عمارتوں، باغوں، پھولوں، پھلوں اور وہاں کے باشندوں کی تعریف امیر خسرو کا بہترین موضوع ہے۔ اس کارنامے میں خسرو کا کوئی سہیم نہیں ہے۔ دلّی کی محبت خسرو کے رگ و پے میں اس لئے سرایت کر گئی تھی کہ اس شہر میں انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا۔ دہلی اسلامی اور ہند و تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی اور اس شہر میں علمی، ادبی، تہذیبی اور مذہبی سرگرمیاں پائی جاتی تھیں۔ مزید برآں دلّی میں اس لئے بھی جاذبیت اور کشش پائی جاتی تھی اور وہاں شیخ نظام الدین اولیاء سکونت پذیر تھے اور ان کے فیضانِ رحمت کے چشمے ملک کے دور دراز علاقوں کو سیراب کر رہے تھے جس کی بدولت دور دراز سے کسان، کاشتکار، بردار وار دہلی کی طرف چلے آ رہے تھے۔ دلّی سلاطین دہلی کا دارالخلافہ تھا، اس لئے پُرشکوہ، پُرعظمت اور خوبصورت عمارتوں سے آراستہ پیراستہ تھا۔ شعر و شاعری کا چرچا اس قدر تھا کہ بقول امیر خسرو جس شہر کو بھی اٹھاؤ اس کے نیچے سے ایک شاعر اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ یہ تھی وہ دلّی جو خسرو کی نظر میں بغداد، مصر، خراسان، خطا، تبریز، ترمذ، بخارا اور خوارزم وغیرہ پر سبقت رکھتی تھی۔

دہلی سے دور ملتان میں قیام کے دوران انھوں نے ملتان کے مقابلے میں اس شہر کو بہشت زار بتایا ہے۔ دہلی کو یاد کر کے بے کل ہو جاتے ہیں، اور کہتے ہیں۔

"ایک وہ زمانہ تھا کہ میرا مسکن قبۃ الاسلام تھا جو ہفت اقلیم کے بادشاہوں کا قبلہ ہے یعنی وہ دہلی جو ہمشیرۂ آسمان ہے اور روئے زمین پر جنت بریں کا ایک ٹکڑا ہے۔ تو آسمان میں ہمارا مبارک سایہ ڈالے ہوتے ہیں اور ربعِ اقلیم اس کے دروازے کا حلقہ ہیں۔ اس کے بلند قصر آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور سورج پر بھی سایہ ڈالتے ہیں اور اس کے بازار میں آدمیوں کا اتنا اژدہام رہتا ہے کہ مردم چشم کو بھی دیکھنے والے کی آنکھ میں جگہ نہیں ملتی۔ اس کے سرسبز میدانوں میں پھول کھل رہے ہیں اور اس کے چشمے جگمگاتی آنکھوں سے بھی زیادہ صاف اور روشن ہیں جن کا بہتا ہوا پانی آبِ حیات کی طرح خوش گوار اور نبات میں سے بہتے ہوئے دودھ کی طرح شیریں ہے۔ حوض سلطانی ایسا روشن کہ معلوم ہوتا ہے کہ چاندنی کو پگھلا کر نہر میں ڈال دیا ہے۔ اس کے باغات میں تماشائیوں کا ہجوم، جن میں سے ہر ایک لالہ رخسار تھا۔

گوش کی وہ چمک دمک کہ کان کے موتیوں کی آب کو بھی ماند کر دے۔ جو دوران کے لطیفے اس کے باغوں میں بلند ہوتے ہیں ایسے شیریں کہ درخت مخمور ہو جائیں۔ اور چشمے آ ٹھہرے لگیں۔ وہاں میرے دن بسر اور رہ جاتے ہیں اور راتیں ایک محبوب کی صحبت میں بسر ہوتی تھیں۔"[4]

ایک دوسرے موقع پر دہلی کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"یہ عدن کی جنت ہے، اسی خصوصیات اور صفات میں باغِ ارم کے مانند ہے۔ اس بوستان کے مقدّس کو سن کر مکّہ بھی ہندوستان کا طواف کرنے لگے اور اس شہر کی شہرت سن کر مکہ بہرہ ہو جائے۔ یہ پہاڑی پر آباد ہے۔ اس کے ارد گرد دو میل تک باغات لگے ہوئے ہیں۔ جمنا سے اس کی آبیاری ہوتی ہے۔ شہر کے پرانے قلعوں اور قلعہ ملک کے ساتھ ساتھ جوانی شہر میں واقع تلپٹ، اندرپت، بہارپور اور افغان پور کا بھی ذکر ملتا ہے۔ دہلی کے باشندے فرشتہ سیرت اور جنت میں

---

[1] مثنوی "نہ سپہر" ص ۱۸۱-۱۹۱؛ "خزائن الفتوح" ص ۸، ۹، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۱۹۔ [2] خزائن الفتوح ص ۲۳

[3] مثنوی "نہ سپہر" ص ۱۷۰-۱۸۱؛ امیر خسرو کا ذہنی ارتقاء، وحید مرزا ص ۱۳۱ ۲۲ [4] "خزائن الفتوح" میں "قبۃ الاسلام" لکھا ہے۔

[5] حوض شمسی یا قطب صاحب کا تالاب سلطان التتمش نے ۱۲۲۹ء میں تعمیر کروایا تھا۔ ملاحظہ ہو آثار الصنادید دہلی ۱۹۶۵ء ص ۲۷ قران السعدین ص ۲۲-۲۳

[6] دیوان "تحفۃ الصغر" [7] قران السعدین ۲۸، ۲۹

بسنے والوں کی طرح خوش دل اور خوش خو ہیں۔ صورت، علم، ادب، آہنگ، چہرہ، پیکاں اور تیر اندازی کے فن میں بے بدل ہیں۔

پھر دہلی کے سادہ لوح محبوبوں اور مہ جبینوں کے ناز و غمزہ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ شوخ اور حسین سادہ رو محبوبوں کی وجہ سے مسلمان بھی سورج کے پرستار ہوگئے ہیں۔

خورشید پرست شد مسلماں   زیں سادہ دلانِ شوخ و سادہ[1]

دہلی کی آب و ہوا خسرو کو بہت مرغوب تھی۔ دہلی کا پانی خراسان کے پانی سے بہتر تھا۔ دہلی کی ہوا گرم و سرد بھی بلکہ اس کی وجہ یہ معتدل تھا۔ آفتاب کو یہاں سے عشق ہوگیا تھا اور اس عشق کی گرمی نے یہاں کی آب و ہوا کو گرم کر دیا تھا۔ دہلی کا تربوز سمرقند کے تمام پھلوں سے بازی لے گیا تھا۔ اس میں شہد جیسی مٹھاس پائی جاتی تھی۔

خربزہ گوئی کہ بہ صحرا و کشت   گشتہ ز رود از تراب بہشت[2]

اجودھیا

امیر خسرو، خان جہاں امیر علی، حاکم اودھ کے ساتھ اجودھیا میں دو سال تک رہے تھے اور اس شہر کے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

ملک اودھ کا ملک بہت خوش گوار ہے۔ درحقیقت یہ شہر باغ کے مانند ہے جہاں لوگ امن و امان اور خوش حالی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کی زمین باغ کے لئے زینت ہے اور اس کے گرد و جوار میں اسباب طرب جمع ہیں۔ اس کے قریب سے دریائے سرجو گزرتا ہے جس کی روانی دیکھنے والوں کی پیاس بجھا دیتی ہے۔ خوشی کے تمام ضروری لوازمات یہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ کثرت سے پھول اور شراب مہیا ہے۔ باغوں میں درختوں کی شاخیں پھلوں سے بوجھل ہیں۔ انگور، کھٹے سیب، نارنگی اور متنوع درختوں کے پھل جن کے ہندوستانی میں میٹھے اور ذائقہ دار، مثلاً کیلے اور آم انسانی دماغ کو راحت بخشتے ہیں۔ پرندوں کے رسیلے اور آواز نغموں سے فضا گونج رہی ہے۔ کپڑے ایسے کہ عمر گزشتہ کو واپس لے آئیں۔ ان کی زینت اور زیبائش کا رنگ مثلاً جھمرلی اور بہاری کہ موسم بہار کا ایک شمہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور بدن پر ایسے ہلکے معلوم ہوتے ہیں جیسے لالے پر بدلی یا صبح کے وقت گلاب پر قطرۂ شبنم۔ یہاں کے لوگ خوش اطوار، خوش خلق اور وسیع النظر ہیں[3]۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس زمانے میں اجودھیا کی آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔

دیوگیر

جس زمانے میں ملک کافور نے تسخیر دکن کے لئے کوچ کیا تو خسرو اس کی معیت میں دکن گئے اور دیوگیر شہر کو بہ چشم خود دیکھا۔ بقول ان کے وہ شہر اپنی تازگی اور لطافت میں شداد سے بھی بازی لے گیا تھا۔ یہاں تک کہ مصر نے اس کی شہرت سن کر اپنا جامہ اتار کر دریائے نیل میں ڈال دیا تھا۔ اور لنکا دو ٹکڑے ہوگیا تھا۔ اس کی ہوا جنت کی تھی۔ جس کی خوشبو سے تمام پھول معطر ہوتے تھے۔ ہر بازار ایک باغ معلوم ہوتا تھا جہاں جوہری اور صراف موتی جواہرات اور سونے چاندی کے ڈھیر سامنے لئے بیٹھے تھے۔ ہر قسم کے کپڑوں کے تھان کے تھان، جو ہندوستان میں بہار سے لے کر خراسان تک کہیں بھی نہیں مل سکتے تھے ان دکانوں میں نظر آتے تھے۔

اس کے بعد امیر خسرو نے اس دیار کے گھوڑوں اور ہاتھیوں کی تعریف بیان کی ہے اور موسیقی کی تعریف میں تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ یہاں کے نغمے سے مردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں۔[4]

مثلاً امیر خسرو نے ان تمام شہروں کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے دیکھے تھے۔ مثلاً لاہور کے علاوہ انہوں نے ملتان اور ورنگل کی تعریف بیان کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

شہروں کے علاوہ خسرو نے بعض ہندوستانی قدیم قلعوں کا بھی ذکر کیا ہے ان کی خوبصورتی، مضبوطی اور بلندی کی بھی تحسین کی ہے۔ قلعہ جھائیں جو رنتھمبور کے قریب واقع تھا اور سلطان جلال الدین نے تسخیر کیا تھا، کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ قلعہ آسمان کی طرح بلند تھا۔ سنگ خارا سے منقش تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ ہندوؤں کی بہشت ہو۔ در و دیوار کی نقاشی و رعنائی کو سربلند کرتی تھیں۔ پتھر کی سینکڑوں ایسی مورتیاں دیکھیں جن میں جو موم سے بھی نہیں بنائی جا سکتی تھیں۔ اس کے باغ میں بہت سے بت تھے جن پر سونے چاندی کے کلس تھے۔[5]

ہندوستانی کپڑے

ہندوستان میں جو کپڑے بنتے تھے وہ قدیم الایام سے اپنی نزاکت، لطافت، خوبصورتی اور باریکی کے لئے مشہور تھے۔ امیر خسرو کہتے ہیں کہ وہ اتنے باریک ہوتے تھے کہ پہننے پر جسم نظر آتا تھا اور بعض کپڑے تو ایسے بھی تھے کہ لپیٹو تو انگلیوں کے ناخن میں آجائیں اور اگر کھولو تو بہت بڑا تھان بن جائے[6] دیوگیری نامی کپڑے کی خوبی یہ تھی کہ یہ آفتاب ماہتاب یا سایہ معلوم ہوتا تھا[7]

ہندوستانی عورتیں

اب خسرو ہندوستانی عورتوں کے حسن کے بیان کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ یہاں کی عورتوں کا حسن مصر، روم، قندھار، سمرقند، ختا، چین اور بلخ اور دنیا کے تمام حسینوں کے حسن پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہاں کے حسن میں گوناگوں صفات پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد امیر خسرو نے دنیا کے دوسرے ملکوں کے حسینوں کے حسن کی خامیوں کا ذکر کیا ہے اور مقابل کے بعد ہندوستانی حسن کی افضلیت کو ثابت کیا ہے۔[8]

تابِ ہندراست ہمیں است
ہر یک موئے تابِ صد ملکِ چیں است

دیوان نہایۃ الکمال ۱۲۵-۱۲۴، خزائن الفتوح ۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو ۔ سپہر ۔ اعجاز خسروی (نول کشور) ۔ ایضاً ۱۹ ۔ ایضاً ۳۲، ۳۴ ۔ ایضاً ۵۶-۵۴، ۲۷-۲۹ ایضاً

مثنوی ۔ قرآن السعدین ۔ ۲۱-۲۲ (علی گڑھ ۱۹۵۴ء) مرتبہ پروفیسر شیخ عبدالرشید ۔ مثنوی مفتاح الفتوح ۴۲ ۔ مثنوی دولرانی خضر خاں ۵۰-۵۲ (۱۹۱۲ء)

ہندوستانیوں کی وفاداری

ہندوستان کی دوسری خصوصیات کے علاوہ امیر خسرو نے اس ملک میں ایک ایسی خوبی پائی تھی کہ جو دنیا کے کسی اور قوم میں آج بھی نہیں ملتی تھی کہ تیرہویں صدی عیسوی میں یہ بھی ہندو عورت اور مرد کی وفاداری دیکھتے ہیں۔

ہندو اپنی وفاداری میں تلوار اور آگ سے کھیل سکتا ہے اور ہندو عورت اپنے شوہر کی محبت اور وفاداری میں اس کی چتا میں جل کر بھسم ہو جاتی ہے ایک ہندو مرد اپنے بت اور آقا کے لئے اپنی جان بھینٹ چڑھا دیتا ہے خسرو کہتے ہیں کہ اسلام میں ان باتوں کی اجازت نہیں تاہم یہ باتیں قابل ستائش ہیں اگر اسلام اس کی اجازت ہوتی تو بہت سے لوگ اس سعادت کو حاصل کرنے میں اپنی جانیں دے دیتے۔[1]

اگرچہ آتش پرستی سبق آموز ہے تو بقول خسرو آتش پرستی اس سے کسی لحاظ سے بھی کم اہمیت نہیں رکھتی ہے اور اس عمل سے بہت سبق ملتا ہے۔ ایک آتش پرست ہندو کا ذکر کرتے ہیں۔ اس ہندو سے یہ سوال کیا گیا کہ وہ آگ کی کیوں پوجا کرتا ہے اس کے جان کیوں دیتا ہے، تو وہ یہ جواب دیتا ہے کہ آگ کو دیکھ کر وصل کی امید روشن رہتی ہے اور آگ میں جا کر بقا حاصل ہوتی ہے۔[2] اس عقیدے کی قدر کر کے کا خسرو نے اس لئے مشورہ دیا ہے کہ گویا سے صادق محبت الٰہی کی آگ میں جل کر واصل بالحق ہوتے ہیں۔

لڑکی کی ولادت

ہندوستان کے محاسن کی امیر خسرو نے ستائش کی ہے لیکن بعض باتوں کی مذمت بھی کی ہے جو کسی بھی لحاظ سے قابل قبول نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً قدیم الایام سے ہندوستان میں لڑکی کی ولادت کو ناگوار سمجھا جاتا رہا ہے اور ادنیٰ طبقوں میں آج بھی یہی صورت حال ہے۔ امیر خسرو نے ایسے باطل خیالات کی تردید کی ہے اور لکھتے ہیں کہ عورت کا وجود ہی نوع آدم کی افزائش کے لئے مرد سے زیادہ اہم و لازمی ہے جس سے تو پیغمبر جیسا انسان پیدا ہوتا ہے تو پھر انسان کو جس کی بدولت کرامت انسانی حاصل ہوتی ہے اس کے وجود کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا ہرگز روا نہیں۔[3]

شادی بیاہ کے رسوم

جب ترک مسلمانوں نے اس ملک میں مستقلاً سکونت اختیار کر لی تو رفتہ رفتہ ہندوؤں سے ان کا میل جول بڑھنے لگا۔ ہندوستانی عورتوں سے شادی بیاہ ہونے لگے۔ نتیجتاً ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی تہذیب کے عمدہ عناصر اپنا لئے اور تہذیبی یکجہتی کا کام شروع ہو گیا جو دن بدن تکمیل و ترقی پا رہا۔ مسلمانوں نے شادی بیاہ کے رسوم بالخصوص اپناتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے بیٹے خضر خان کی شادی کے موقع پر جو رسوم ادا ہوتے تھے، وہ نکاح کے سوا سارے کے سارے خالصتاً ہندوستانی تھے۔

امیر خسرو اور ہندوستانی موسیقی

امیر خسرو ہندوستانی موسیقی میں دسترس رکھتے تھے اور بعض راگ راگنیوں کے موجد بھی تھے۔ دولت شاہ سمرقندی کا بیان ہے کہ امیر خسرو علم موسیقی سے واقف تھے۔[4] خسرو نے خود بھی اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ چھوٹے دعوے کریں۔ اس سلسلے میں ان کا ایک قطعہ یہ ہے۔

مطربے می گفت خسرو را کہ اے گنج سخن
علم موسیقی ز علم شعر نیکوتر بود[5]

ملا شاہ خسرو کو ایرانی اور ہندوستانی فن موسیقی میں مہارت حاصل تھی ان کی تصانیف میں فارسی اور ہندوستانی راگ اور راگنیوں کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں انھوں نے متعدد جگہ ہندوستانی راگ راگنیوں، الاپ، دھرپد وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ستار ایجاد کیا، مرد نگ کو ڈھولک میں تبدیل کیا، ایرانی یا عاطبور کی بجائے ستار ایجاد کیا، ڈاکٹر وحید مرزا لکھتے ہیں۔

یہ بات مشہور و مسلم ہے کہ انھوں نے ہندوستانی راگ میں بہت کچھ تصرفات کئے تھے، اور اس میں ایسا انقلاب پیدا کر دیا تھا کہ وہ ایک نئے مسلک اور طریقے کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ اور ہندوستان میں اُن کے اس طریقے کے پیرو صرف ان کے اپنے زمانے میں تھے بلکہ اب تک بھی موجود ہیں۔[6]

خسرو کی ہندی شاعری

ان کے فارسی کلام میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ ملتے ہیں اور بالخصوص ہندی کلام تو خالصتاً ہندی زبان میں ہے۔ یہ مسئلہ ابھی تک معرض بحث میں ہے کہ آیا کہ جو ہندی کلام خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے وہ ان کا کلام ہے بھی یا نہیں، اس پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں ہے۔ لیکن گمان غالب ہے کہ خسرو نے ہندی زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہوگی کیوں کہ امیر خسرو اس زمانے کے سب سے عظیم الشان شاہی اشخاص کے درباری شاعر تھے لیکن انھوں نے عوام سے اپنا ناتا کبھی نہیں توڑا اور ان کو عوام کا شاعر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ایک عوامی شاعر وہی شخص ہو سکتا ہے جو عوام کے جذبات اور افکار کی ترجمانی کرے۔ امیر خسرو شیخ نظام الدین اولیاء کی صلح کل کی تحریک میں شریک کار تھے، خسرو ہندوستان کی بیشتر اہم زبانوں سے واقف تھے اور ہندی ان کی مادری زبان تھی اس لیے عوام کے دل تک پہونچنے کے لئے امیر خسرو نے اپنی مادری زبان میں ضرور طبع آزمائی کی ہوگی اور صلح کل کا پیغام عوام کی زبان کے ذریعہ ہی اُن تک پہونچایا ہوگا۔

امیر خسرو نے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے لئے ایک پیغام چھوڑا ہے کہ قوموں اور تہذیبوں کی بقا کا انحصار وسیع المشربی، رواداری، وسیع النظری اور دوستی پر ہے۔ مذاہب دلوں میں دوری پیدا نہیں کرتے بلکہ دلوں کو جوڑتے ہیں۔ مذہب عشق اور اللہ کی تلاش سے زیادہ افضل کوئی دوسرا مذہب نہیں ہے۔ باقی صفحہ

[1] مثنوی نہ سپہر، ص ۱۹۴، ۱۹۵ [2] مثنوی دولرانی خضر خاں، ص ۱۹۵-۱۹۶ [3] ہشت بہشت عادہ ماف جغرافیہ ہند ۲۶، ۳۳ [4] ملاحظہ تفصیل دیکھئے تذکرہ دولرانی خضر خاں ۱۴۸، ۱۵۰ [5] تذکرۃ الشعراء [6] الف انعام الحق ریحان حسرو مقبول کتابیں ۵۶ ص ۔۵۷، ہشت بہشت (مقدمہ) ۲۳ ۔ امیر خسرو ۲۳۶ ۔ دیکھئے محمد حبیب کی امیر خسرو حیات ۲۹ ـ ۲۸ ۔ باقی صفحہ

حسن الدین احمد

امیر خسرو اور مسئلۂ انسانیت پر چشتیہ سلسلہ کے اثرات

اس نقطۂ نظر سے خسرو کی شاعری کا خاطر خواہ مطالعہ نہیں کیا گیا کہ انہوں نے اپنے کلام میں انسان کا کیا تصور پیش کیا ہے۔ اور انسان کا کیا مقام متعین کیا ہے۔ یہ خسرو شناسی کا تقاضا ہے کہ ان کی انسان دوستی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے اور پھر ان کے حالات کے پس منظر کو تلاش کیا جائے۔

اس موقع پر ہیومنزم یا مسلک انسانیت کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

ہیومنزم وہ فلسفیانہ تصور ہے جس کے بموجب انسان عالم فطرت کی قوتوں کے سامنے بے بس اور مجبور نہیں ہے بلکہ وہ مستقل وجود، عقل و ارادہ اور بے پناہ اقتدار رکھتا ہے اور کچھ حدود کے اندر اپنی زندگی اور اپنی سرنوشت جس طرح چاہے مقرر کر سکتا ہے۔

خسرو کی شاعری کا مرکزی کردار انسان ہے۔ وہ رنگ و بو کی دنیا میں رہتے ہیں جو سوز و درد و داغ و جستجو و آرزو سے عبارت ہے اس لئے ان کی شاعری میں انسانی جذبات ملتے ہیں۔

من نمی دانم کہ چون باشد پری
شکل تو باری مرا دیوانہ کرد

(میں نے پری نہیں دیکھی کہ کیسی ہوتی ہے لیکن تیری صورت نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔)

اس قسم کے ہزاروں اشعار ملتے ہیں جن میں احساسات زندگی کی بھرپور نمائندگی ہے۔

امیر خسرو نے ایسی طبیعت پائی ہے کہ ان کو اگر ایک طرف روحانی لگاؤ اور اپنے حضرت نظام الدین اولیاء سے کمال عقیدت ہے جیسا کہ حسب ذیل اشعار سے۔۔

ہستی تو آں نظام کہ نون خطاب تو
محراب راست کردہ برائے عبادت است
و شمع صبح و شعلہ شوقی کہ از تو خواست
زاں ہر یکے برارہ چراغ ہدایت است

تو دوسری طرف وہ سماج سے بھی رشتہ جوڑے ہوتے ہیں۔

انسانوں کے باہمی تعلق اور رہن سہن سے متعلق وہ یہ اصول قائم کرتے ہیں کہ۔

خسرو مگوی بد کہ درون گنبد از صدا
خلق آنچہ گفتہ اند بما باز رسیدہ اند

(خسرو کسی کو بھی برا مت کہو کیونکہ دنیا میں لوگ جو کہتے ہیں وہی انھیں خود بھی سننا پڑتا ہے)۔

طبیعت کی اس رنگارنگی نے ان کی شخصیت کو انفرادیت عطا کی ہے۔

امیر خسرو کی اصل بڑائی یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی انسانی حقیقت کے معتبر ترجمان قرار پائے۔ انسانی عظمت کا تصور امیر خسرو اور پھر ولی کے ذریعہ اردو شاعری کو ملا۔ اردو کے اساتذہ میں میر، سودا، درد، نظیر، آتش، غالب، انیس سب انسانی عظمت کے علمبردار ہیں۔ اگر آج اردو شاعری عظمت انسانی کی علمبردار ہے تو یہ حضرت امیر خسرو کا طفیل ہے۔ سوائے شیخ سعدی کے اور کوئی فارسی شاعر ایسا نہیں گذرا جس نے خسرو کی طرح عوام کے دلوں میں گھر کر لیا ہو۔ اور جس کا نام زبان زد خاص و عام ہو۔ یہ صحیح ہے کہ سعدی فارسی غزل گوئی میں سب کچھ شہرت حاصل کر چکے تھے لیکن ان کی غزل میں وہ سوز و گداز اور جوش و خروش نہ تھا جو انسان کے جذبات کو ابھارے۔ خسرو کی طبیعت میں ایسی نیرنگی تھی جو انسان کو زندگی کے اسرار تک پہنچنے پر اکساتی ہے۔ اور اس میں جامعیت کی خواہش پیدا کرتی ہے۔

امیر خسرو کا شمار اپنے زمانہ ہی کے نہیں بلکہ ہر زمانہ کے بڑے آدمیوں میں ہوتا ہے ان کے جامع کمالات ہونے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے زندگی سے بھرپور دلچسپی لی۔ اور زندگی سے گوناگوں تجربے کئے۔ ان کو بنیادی طور پر حیات انسانی سے پیار اور لگاؤ تھا۔ اور یہی چیز ان کی شاعری میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔

ہر دم کہ بخوش دلی برآید سرمایۂ حاصل جوانی است

(جو وقت خوش دلی کے ساتھ گزر جائے وہی جوانی کا حاصل اور سرمایہ ہے)

وقت نے حضرت امیر خسرو کے مقابلہ میں اپنی ہار مان لی ہے۔ وقت بڑا ظالم ہوتا ہے

وقت کی چکی بڑے بڑوں کی شہرت اور بڑائی کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ انسان کے اعمال بھی دب جاتے ہیں اور روحانی نشان، عظمت اور بڑائی ختم ہو جاتی ہے۔ حضرت امیر خسرو کا شمار بلاشبہ ان لوگوں میں ہے جن کے متعلق کہا گیا ہے۔

رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

وقت اور زمانہ سے ان کے پیام کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ جیسے جیسے انسان بیدار ہوگا ان کے پیام کی اہمیت بڑھتی جائے گی۔ امیر خسرو کا پیام صلح و آشتی، محبت و اخوت کا پیام ہے آج انسانیت کو اس کی سخت ضرورت ہے۔ شاید آج سے قبل اس پیام کی اتنی ضرورت کبھی نہ تھی۔ آج دنیا کو ان کے محبت بھرے اور دلوں کو جوڑنے والے نغموں کی ضرورت ہے۔

حضرت امیر خسرو حکومتی حلقوں میں رہتے ہوئے بھی عوام کے آدمی تھے۔ انھوں نے بادشاہوں کے درباروں سے وابستہ رہتے ہوئے زندگی ایسے گزاری کہ۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

ایسا انداز صرف وہی آدمی رکھ سکتا ہے جس کا ظرف بڑا ہو

حضرت امیر خسرو نے مسلک انسانیت پر زور دیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مسلک انسانیت کا تصور جدید مغربی فلسفہ کی دین ہے۔ لیکن یہ بات سائنٹفک طور پر کلیتہً درست نہیں ہے لیکن جس ابتدائی تخیل کے ارتقا سے مسلک انسانیت کا موجودہ مفہوم وجود میں آیا وہ یقیناً بہت قدیم ہے۔ بالخصوص تاریخ کے دور میں اسلام نے اس تخیل کو کافی بڑھاوا دیا۔ قرآن شریف کو بجا طور پر عظمت انسانی کو تسلیم کرنے والی پہلی دستاویز اور منشور انسانیت قرار دیا جا سکتا ہے۔

قرآن شریف میں انسانوں کو خدا کا بندہ کہہ کر ان کی حیثیت کا نہ صرف تعین کر دیا گیا بلکہ اس کو تسلیم بھی کیا گیا۔ جب یہ کہا گیا کہ سب انسان خدا سے برابر فاصلہ پر ہیں اور سب انسانوں سے خدا کا رشتہ یکساں نوعیت کا ہے تو اس سے نہ صرف انسانی مساوات پیدا ہوئی بلکہ انسان کی بڑائی کا پہلو بہت واضح انداز میں سامنے آیا۔

قرآن شریف میں بار بار نوع انسان کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ "ہم نے ہی نوع انسان کو عزت بخشی اور اپنی بہت ساری مخلوقات پر فضیلت دی" زمین اور آسمان اور سب چیزیں جو زمین میں ہیں انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ ۲:۲۲، ۲:۲۱ اور ۲:۲۹ خدا نے رات اور دن سورج اور چاند کو انسان کے لئے مسخر کیا ۱۲:۱۶ دریا کو اختیار میں دیا ۱۴:۳۲ چوپایوں کو انسان کے لئے بنایا وغیرہ خدا نے فرشتوں سے کہا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں ۲:۳۴ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ۹۵:۴ کہہ کر انسان کی برتری اور بڑائی کا اعلان کر دیا۔ اور بھلائی اور برائی کے لئے انسان کو ذمہ دار قرار دیا گیا۔ ۹ ۱۰۷، ۲۰، ۲۹:۱۱۸

مندرجہ بالا آیتوں سے کائنات میں انسان کی حیثیت ظاہر ہوتی ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ہم ان کو کی پیش رو اور رہنما قرار دے سکتے ہیں۔ امیر خسرو نے اپنے عہد میں قرآنی تخیل سے بھرپور استفادہ کیا اور اس کو اپنی شاعری کی زینت بنایا۔

یہاں اس علمی اور تاریخی حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ آج ہم جس کو جدید یا مغربی تہذیب کہتے ہیں اس کی بنیاد دراصل اسلامی تہذیب ہی پر ہے۔

اسلامی تہذیب نے اپنی ترقی کے زمانہ میں مسلک انسانیت کے تصور کو بڑی حد تک ابھارا۔ اسلامی تصوف کا بھی اس تصور کو نمایاں کرنے اور ترقی دینے میں بڑا حصہ رہا ہے۔ اہل تصوف کے نزدیک روحانی مرتبہ کمال ہی انسانی زندگی کا منتہا ہے۔ تصوف انسان دوستی کی وہ تحریک ہے جس نے انسانوں کے درمیان تمام امتیازات کو فراموش کر کے انسان کو بحیثیت انسان اہمیت دی۔

خسرو نے اپنی شاعری میں انسان کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی بنیاد اسلامی تصوف کی ایک شاخ چشتیہ سلسلہ کی تعلیمات پر رکھی۔

امیر خسرو کے نظریات کو سمجھنے اور ان کے مسلک انسانیت کی بنیادوں کی تلاش کرنے کے لئے ہمیں چشتیہ سلسلہ کے مسلک کو سمجھنا ہوگا۔

چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے ملفوظات سے اس سلسلہ کی جو نمایاں خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں ان میں انسان دوستی، خدمت خلق، مذہبی رواداری، غیر مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ برابری کا سلوک، حکومت اور حکمراں طبقہ سے لاتعلقی اور دوری شامل ہیں۔

چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں معاشرتی لحاظ سے پسماندہ طبقات کی امیدوں اور تمناؤں کا مرکز تھیں۔ ان بزرگوں کا مقصد ہی خلق اللہ کی خدمت اور مصیبت زدوں کی اعانت تھا۔ مذہب، رنگ، نسل یا عقیدے کی کوئی قید نہ تھی۔

چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں نے سب سے بڑی تبلیغی ضرورت یہ خیال کیا کہ عوام سے ربط برقرار رکھا جائے اور حکمراں طبقے نے جو فاصلے قائم کر رکھے ہیں ان کو حتی الامکان کم کیا جائے۔ ضرورت وقت نے چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کے ذریعہ عوامی بولی کو کے ذریعہ کی حیثیت سے رواج دلائی۔ اسی طرح انھوں نے یہ محسوس فرمایا کہ قوالی کے ذریعہ بھی تصوف کے پیام کو عوام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

چشتیہ سلسلہ کے ایک عالی مرتبت شاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے فرمایا "وہ شخص اللہ کو دوست رکھتا ہے جس کی سخاوت دریا کی سی سخاوت ہو جس کی شفقت آفتاب کی سی شفقت ہو اور جس کی تواضع زمین کی سی تواضع ہو یعنی بلا لحاظ دوست دشمن سب کے لئے یکساں ہو۔"

جب آپ نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو اپنا جانشین مقرر کر کے دہلی بھیجا تو یہ نصیحت فرمائی۔

"جو تمہارے ساتھ دشمنی کرے اس سے دوستی کا برتاؤ کرنا اور کسی کو تکلیف نہ دینا۔"

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا قیام دہلی کے باہر ایک گاؤں میں تھا۔ جو بعد کو کیلوکھری کہلایا۔ آپ نے عوام میں حد سے زیادہ مقبولیت حاصل کر لی۔ شیخ الاسلام نجم الدین صغری کو یہ بات ناگوار گزری۔ انھوں نے اپنے قدیم دوست خواجہ معین الدین چشتی سے جب کہ وہ دہلی تشریف لائے تھے اس بات کا خاص انداز سے ذکر کیا۔ خواجہ معین الدین چشتی نے یہ طے کیا کہ وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو اپنے ساتھ اجمیر لے جائیں گے۔ لیکن اہل دہلی نے وہ آہ و بکا کی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کو اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مرید اور خلیفہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر

تھے۔

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی اپنے مرید اور خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو نصیحت تھی کہ دشمنوں کو رام کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور حقوق کی ادائیگی میں ہرگز کوتاہی نہیں ہونی چاہئے۔ یعنی حق داروں کو ان کا پورا حق دیا جائے۔

حضرت بابا فرید نے فرمایا "نظام الدین تم ایک ایسا درخت ہو گے جس کے سکون بخش سایہ میں لوگ آرام کریں گے"۔

اسی طرح حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

"عبادت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جس کا فائدہ صرف عبادت کرنے والے کو ہوتا ہے جیسے نماز۔ روزہ۔ ذکر و شغل وغیرہ۔ اور دوسری وہ عبادت جس کا فائدہ دوسروں کو پہنچتا ہے جیسے دوسروں کے ساتھ شفقت و مہربانی۔ آپس میں اتفاق کروانا وغیرہ اس کا ثواب بے اندازہ ہے"۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور فتوح پر گزارا کرنا شروع [1]۔ آپ نے امیر خسرو کے ذریعہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے اجازت مانگی کہ کسی گوشہ میں اکیلے عبادت کرنے لگیں لیکن شیخ کا حکم صاف تھا "امیر خسرو! نصیر الدین سے کہہ دو کہ تمہیں خلق میں رہنا اور لوگوں کے ظلم و ستم سہنا چاہئے۔ اور ان کے عوض میں بذل اور ایثار سخاوت کی کوشش کرنا چاہئے"[1]

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا یہ طریقہ کار تھا کہ وہ خود اپنی حد تک اصولوں پر سختی سے پابند رہتے تھے اور جس کو اپنا خلیفہ بناتے ان کے لئے بھی سخت اور عملی معیار مقرر تھا لیکن عام معتقدین کی حد تک وہ سہولتیں دینے اور ان کا پاس کرنے کے قائل تھے وہ وسیع المشرب تھے ان کے معتقدین میں ہر مذہب، ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ وہ اپنے ہر معتقد کو خود ان کی اپنی صلاحیتوں کو ابھارنے کا موقع دیتے۔ ذاتی صلاحیتوں کی نشو و نما پر کسی قسم کا بیرونی اثر ڈالنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنے پیروؤں کو۔ نیک رستہ کی تعلیم دیتے رہے اپنے مشوروں کو ان پر لادتے۔ امیر خسرو کو انسانوں اور انسانیت سے محبت تھی۔ ان کا راج عوامی انداز کا تھا۔ وہ فن کار تھے۔ تو ان کو ان کی فطرت اور اپنی صحبت کی نشو و نما کا موقع دیا اور چشتیہ سلسلہ کی عام تعلیمات نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔

حضرت امیر خسرو کا نقطۂ نظر تھا کہ

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ہر دکھی دو نسواں وہ درد دل یا سوز سینہ تھا۔ اگر یہ رقص بعض کو دل کے معاملہ پر جلانے ہوا جائے کا بعض عبادت مد تصور کرتے ہیں تو اس میں اسی کوئی بات نہ تھی کہ جس پر کے پیر طریقت کو ناراض ہونا جس کو وہ اپنا راہ آخرت تصور کرتے۔ اور یہ اپنی نسوانیت "نرالہ کس" کی دعا کرتے۔ در اصل یہ سوز خیالات کی دنیا میں آگ لگانے والا تھا۔ سو سال بعد آج بھی اس سوز کی جھنکار بار ملتی ہیں جس سے دلوں کو گرمایا جا سکتا ہے انسانیت کے فائدہ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

امیر خسرو نے چشتیہ سلسلہ کے اثر کے تحت رواداری۔ روشن خیالی اور انسان دوستی کا علم بلند کیا اور رنگ نسل اور مذہب کے امتیازات کو فروغی مان کر انسان کو بحیثیت انسان ... ... قابل احترام مانا۔ انھوں نے بادشاہوں کے دربار میں رہ کر بھی عام انسان کو اہمیت دی۔ ایسے دور میں جب کہ عوام اور خواص کی تفریق بڑی سخت تھی اور حکمران طبقہ میں شدید احساس برتری پایا جاتا تھا امیر خسرو عوام میں بھی خوبیوں اور صلاحیتوں کی موجودگی کو تسلیم کرتے ہیں۔

اگر تو آدمی درکار ان نظر میں
کہ بہتر از من و تو ہست صد ہزار بندہ

(اگر تم انسان ہو تو کسی پر طعن و طنز مت کرو کیوں کہ ہزاروں خدا کے بندے ہم تم سے بہتر ہیں)

حکمراں طبقہ میں غرور و نخوت اور مذہبی علماء میں ریاکاری اور خود غرضی کو وہ اسی طرح محسوس کرتے ہیں اور جب سادہ لوح عوام سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں تو عوام ہی ان کو بہتر نظر آتے ہیں۔

بادہ کش دور جہاں بہتر ازیں نقش نہاں
کز پئے خلد بریں طاعت معبود کنند

(جنت کے لالچ میں عبادت کرنے والے زاہدوں سے دور جام کا ایندھن بننے والے شرابی بہتر ہیں۔)

حکمراں طبقہ سے تعلق رکھتے ہوئے بھی انھوں نے طبقاتی اختلافات کو نظر انداز کیا۔ اپنے ذہن کو احساس برتری سے پاک رکھا۔ محکوم طبقہ کی تہذیب زبان اس کے علوم و فنون کو نہ صرف قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا بلکہ ان میں خود بھی دستگاہ حاصل کی۔ اس تمام تجربہ میں جس کو تاریخ عالم کا نہایت دلچسپ اور انوکھا تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے انسان کی عظمت کو بنیادی اور مرکزی اہمیت دی گئی۔

ہندوؤں کی قدیم ستی کی رسم پر عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے اور اس میں وفاشعاری کا جو عنصر شامل ہے اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے امیر خسرو مسلک انسانیت کے اس اونچے مقام پر ہیں کہ اس رسم کے کمزور پہلوؤں پر ان کی نظر نہیں پڑی۔ وہ محض انسانی پہلو کو اہمیت دیتے ہیں اور ان کو اس رسم میں بھی خوبی ہی خوبی نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں ایک سے زیادہ جگہ اس رسم کا ذکر ملتا ہے۔

خسروا در عشق بازی کم ز ہندو زن مباش
کز برائے مردہ سوزد زندہ جان خویش را

مردن اندر دوستی اے دوست زیبد زاہدا
زندہ در آتش سوزان شدن آسان نبود

اندر آں مجلس کہ خود را زندہ سوزند اہل عشق
اے مسلماں گر خدا اکبر از ہندو زنی ہست

گرچہ اسلام روا نیست چنیں
لیک چوں سکار بزرگ ست نہ ہیں

---

[1] حضرت نظام الدین اولیاء ـ حیات اور تعلیمات از پروفیسر محمد حبیب مرحوم صفحہ ۹

گر بہ شریعت بود این لوح روا
جان مہد این سعادت سوا

امیر خسرو کا تصور انسانیت بہت بلند ہے۔ وہ مثالی انسان کو بلند کردار دیکھنا چاہتے ہیں۔

مردکہ از علم توانگر بود
کے نظرش بر زر و گوہر بود

(جو علم سے بہرہ ور ہو وہ سونے موتی کی طرف کیوں نظر ڈالے)

امیر خسرو کے نزدیک زندگی کا مقصد کھانے پینے اور نفسانی خواہشات سے بلند تر ہے

غرض گر تہوست نہ خوردن و آشام
فرق را چہ توان کرد آدمی نام

امیر خسرو عام آدمیوں کی خوبیوں کو اور سوسائٹی میں جو لوگ بڑے گنے جاتے ہیں ان کی کمزوریوں کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔

آشکار اعشق بازی نا مستانی
از بس زہد ریائی خوشتر است

(دکھاوے کی عبادت سے وہ عشق بازی بہتر ہے جس میں خلوص ہو)۔

انسان کے اطمینان قلب کے لئے قناعت کو ضروری سمجھتے ہیں۔

اگر خواہی نہ بینی رنج بسیار
بہ اندک مایہ راحت باش خرسند

حضرت امیر خسرو عقل و خرد انسانیت کے لئے ضروری تصور کرتے ہیں۔

چو اینجا سرمایہ بود با خرد جفت
بہ سامانے خرد را آدمی گفت

اگر دولت کو عقل سے متحد نہ کیا جائے تو بے وقوف شخص کو انسان کہا جا سکتا نہیں۔

پس آنکس مردم آمد از آفرینش
کہ ہستش بر خرد ختالون بینش

(پس روز ازل سے صحیح معنوں میں مرد وہی ہے جس کی نگاہ عقل سے منسلک ہو۔

انسانی زندگی مختصر ہے اس لئے اس کو کارآمد بنانا چاہتے اور ضائع نہیں کرنا چاہئے

ضائع مکن بہ خندہ و بازی بسان گل
این پنج روزہ عمر کہ بر باد می رود

مصروف زندگی کو وہ مبارک تصور کرتے ہیں۔

مرد ہمہ جا بہ سر کار بہ
شخص معطل عمل دشوار بہ

آدمی کو چاہتے کہ وہ کاہل بے کار نہ بنے۔

بہرہ مقصود چو بے رنج نیست
کاہل بے کار بہ بیکار بہ

انسان کے لئے خود شناسی ضروری ہے جو خود شناس نہ ہو وہ خدا کو کیسے پہچانے گا۔

آنکہ خود را شناخت نہ تواند
آفرینندہ را کجا داند؟؟

جب معز الدین کیقباد نے ایک نیا شہر آباد کیا تو امیر خسرو نے اس کا نام "کے لوکہری" تجویز کیا۔ اس میں کیقباد کے نام سے عوام کے لئے لوک اور خدا کا نام ہری تجویز کئے گئے یہ نام بعد کو کیلوکھری ہو گیا۔ اس سے امیر خسرو کے سوچنے کے انداز پر روشنی پڑتی ہے کہ انھوں نے خدائے حقیقی اور مجازی کے درمیان عوام کو شریک رکھا۔ اور نام عوامی زبان میں تجویز کیا۔

اعجاز خسروی کے دیباچہ میں حمد نعت۔ منقبت حضرت نظام الدین اولیاء اور مدح سلطان علاء الدین خلجی کے بعد فارسی کے نو اسلوبوں کا ذکر کیا۔ جس میں عام آدمی کے اسلوب کو زبان سلیس اور مفید مطلب بیان کیا ہے۔

علاء الدین خلجی دیندار آدمی نہ تھا لیکن جب اس نے رعیت کی خوش حالی کے لئے تاجروں کے استحصال سے غریب رعایا کا بچاؤ کیا اور قیمتوں پر نگرانی کی تو خسرو اس کی تدابیر کو خوش آئند تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ عدل وہ داد رتی کو ساتویں سال استوار کر پایا تھا گویا کہ اسے ایک نیا جنم ملا۔

امیر خسرو نے دربارداری کی اور بادشاہوں کے سامنے مودب کھڑے رہتے گزری لیکن ان کا احترام تھا۔

جو کچھ حق کہو جو لکھو حق لکھو مشغل آدمیت کو جھکنے نہ دو۔

اپنے حسن باتھ میں تھامے ہو قلم کم کو اس نام کے آبرو کی قسم۔

ان کے اس موقف میں لغزش نہ آئی۔ انھوں نے مشعل آدمیت کو جھکنے نہ دیا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

باشم را برائے نفس خود راتے
پیش چو خودے ستادہ بر پائے

(نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے صبح سے شام تک مودب کھڑا رہا ہوں)۔

صفدر راہ

امیر خسرو بحیثیت ایک عوامی شاعر

ہندوستان میں باضابطہ عوامی ادب کی ابتدا خسرو ہی سے ہوتی ہے۔ خسرو سے پہلے عوامی زبانوں میں کچھ لوک گیت تھے جن کے بعض اجزا مختلف لسانی علاقوں میں مل تے ہیں۔ لیکن ان گیتوں کے بنانے والے شاعر نامعلوم ہیں۔ جو عوامی ادب باضابطہ طور پر لکھا اس میں سب سے قدیم جن نمونوں کے وہ دوہے ہیں جو جین مذہبوں کی پرانے دھرموں سے برآمد ہوتے ہیں۔ ان دوہوں کی زبان اب کھو چکی ہے اور ان کی عمر ہزار سال سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ یہ دوہے کسی خاص شاعر کی تصنیف ثابت نہیں کرتے بلکہ اس کلام پاشاں سے اب پھر اس عہد کا ایک مبہم لسانی خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

خسرو سے تقریباً ڈیڑھ دو سال پہلے ایک باضابطہ شاعر مسعود سعد سلمان لاہوری (۱۰۴۸ء سے ۱۱۲۱ء تک) ہوتے ہیں۔ خسرو غرۃ الکمال کے دیباچے میں کہتے ہیں کہ ان کے تین دیوان تھے۔ ایک فارسی میں، ایک عربی میں اور ایک ہندوی میں۔ مسعود سعد سلمان کا فارسی دیوان تو تہران سے شائع ہو گیا ہے۔ لیکن ان کے عربی اور ہندوی دیوان کا کوئی پتہ نہیں۔ یہ ہندوی دیوان لاہوری یعنی پنجابی میں ہوگا۔ مسعود سعد سلمان بہت بڑے شاعر تھے۔ لیکن وہ کسی سیاسی جرم میں طویل مدت تک قید خانے میں رہے اور شہرت نہ حاصل کر سکے۔

خسرو سے قبل ایک اور شاعر چند بردائی کا نام لیا جاتا ہے جس نے پرتھی راج راسا (یعنی رزمنامہ پرتھوی راج) لکھا ہے۔ اسے پرتھوی راج کے دربار کا شاعر بتایا جاتا ہے۔ اب یہ مسلمہ طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ چند بردائی مغلوں کے عہد کے کسی راجپوت راجہ کے دربار کا بھاٹ تھا۔ اس کا زمانہ خسرو سے کئی سو سال بعد آتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ خسرو مہر عشق چشتیہ خانوادے کے آفتاب نیم روز ہیں۔ ہندوستان کے بہترین فارسی شاعر ہیں۔ وہ ہندوستانی سنگیت کے مجدد اعظم ہیں۔ ان کی عوامی شاعر کی حیثیت ان تمام حیثیتوں میں سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ سات سو برس سے گیت، ان کی پہیلیاں، ان کی مکرنیاں، ان کے ڈھکوسلے ہندوستان کے گھر گھر میں سب کی زبان پر ہیں۔ ان کی منظوم کتاب خالق باری ہے فرہنگ آمیزی کی مقبول ترین تصنیف ہے۔

بدقسمتی سے اس صدی کی ابتدا میں ہندو فرقہ وارانہ تحریک سے ہوتی جس کا نتیجہ آج ہندوستان اور پاکستان کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ ایک طرف انگریزی، ہندو اور ہندوستان کا نعرہ لگ رہا تھا تو دوسری طرف ہندی کے نقاط سے نفرت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ اردو کے بیشتر محقق صرف ہندی کھڑی بولی ہی کو نہیں بلکہ تمام دوسری علاقائی ہندی بولیوں کو بھی نامہذب اور گنواروں کی زبان سمجھتے تھے۔ نفرت کا جنون یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ خود خسرو کی ہندوی کو ان کی ذات کے لئے دون مرتبہ سمجھا جاتا تھا اور ہر جائز اور ناجائز طریقے پر خسرو کا تعلق ہندوی سے توڑنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

ان محققوں کے سرخیل پروفیسر محمود شیرانی تھے۔ علاوہ مضامین کے انہوں نے مولوی عبدالحق کی اسعانت سے ایک کتاب حفظ اللسان لکھی ہے جس میں خسرو کی ہندوی اور ان کی مقبول ترین کتاب خالق باری کو غیر مستند ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں شیرانی صاحب کی اس کتاب کے لئے ایک ایک نکتے کا جواب اپنی کتاب امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر میں دے چکا ہوں اور ہندو پاکستان دونوں جگہ اہل علم تبصرہ نگاروں نے بلا استثنا میری تائید کی ہے۔

یہ ایک مذہبی حقیقت ہے کہ خسرو خود اپنی نثر و نظم میں ہندوی شاعر ہونے کے مقر ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے ان کی ہندوی اشعار کی تعداد تین لاکھ ابیات سے زیادہ متعین کی ہے لیکن افسوس ہے کہ اب یہ تعداد تین سو مستند ابیات تک بمشکل پہنچ سکے گی۔

خسرو کا عوامی کلام ضائع ہونے کا سبب یہ ہے کہ عوام اپنے ادب سے لطف تو لیتے ہیں، لیکن اس کی تدوین نہیں کر سکتے۔ عوامی ادب کی تدوین کا کام خسرو کے بہت بعد ادیبوں نے شروع کیا۔ مذہبی عوامی ادب کو بھی محفوظ کرنے والے عوام نہیں۔ اسے منظم مذاہب اور مذہبوں کے مرکزوں نے محفوظ کیا ہے۔

خسرو کے عہد میں زبان کے تین انداز تھے۔

۱۔ وہ شائستہ زبان جو خسرو اور دوسرے مقربین دربار ہندوستانیوں کے گھروں

میں بولی جاتی تھی ۔

۲. اُن ہم شائستہ ہندوستانی خاندانوں کی زبان جو دربار سے متعلق رہتے تھے ۔ ایسے گھروں کی عورتیں ایک ایسی زبان بولتی تھیں جس میں کم شائستہ ہندوی لفظ اور گیتوں کے لفظ مخلوط ہو لے تھے ۔

۳. عامیانہ زبان جس میں گنتوں کی روایت سے آتے ہوئے الفاظ کافی تعداد میں ہوتے تھے بلکہ بعض اوقات دیسی ترکی بولیاں بھی اس میں شامل ہو جاتی تھیں

خسرو کا عوامی کلام ان تینوں اسالیب میں موجود ہے ۔ پہلے ان کے کلام میں شائستہ زبان دیکھئے ۔

ریختہ کے ' دلار کا ایک قطعہ ہے

زر گر پسرے چو ماہ پارہ
کچھ گھڑ کے سنوارے پکارا
نقد دل من گرفت و شکست
پھر کچھ نہ گڑھا نہ کچھ سنوارا

اس قطعے کا دوسرا اور چوتھا مصرعہ خسرو کے عہد کی شائستہ ترین زبان کا نمونہ ہے ۔ ان مصرعوں میں فارسی یا عربی کا کوئی لفظ شامل نہیں ہے لیکن ان کی شائستگی کسی طرح فارسی مصرعوں سے کم نہیں ہے ۔ تب سنسکرت لفظ بھی اس بولی میں نہیں آئے ۔ یہی وہ زبان ہے جو اس برصغیر کی پہلی ملک گیر زبان بنی اور جو آج اردو کہلاتی ہے ۔

اسی شائستہ زبان میں لڑکیوں کا ایک گیت دیکھئے ۔

امّاں مرے بابا کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
بیٹی ترا بابا تو بڈھا ری — کہ ساون آیا
امّاں مرے بھیا کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری — کہ ساون آیا
امّاں مرے ماموں کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
بیٹی ترا ماموں تو بانکا ری — کہ ساون آیا

آئینے کی ایک پہیلی میں خسرو نے فارسی، ترکی اور ہندوی میں تینوں زبانوں میں آئینے کا نام فارسی یا ترکی لفظ لائے بغیر بتادیا ہے ۔ جیسے سامنے ہے پہیلی کا اصل ہی کچھ بھی ہے ۔

فارسی بولی آئی نا
ترکی ڈھونڈی پائی نا
ہندی بولی آرسی آوے
کہے خسرو کوئی نہ بتاوے

بھٹے کی پہیلی بچوں کے لئے ۔

آگے آگے بہنا آئی پیچھے بھیا
دانت نکالے بابا آئے برقع اوڑھے میّا

پتنگ کی پہیلی بچوں کے لئے ۔

ایک کہانی میں کہوں تو سن لے میرے پوت
بن پنکھوں وہ اڑ گیا باندھ گلے میں سوت

آگ کی پہیلی بچوں کے لئے ۔

جا گھر لال ملنگا جاتے
تا کے گھر میں گدڑ ماتے
لاکھوں من پانی پی جاتے
دھرا ڈھکا سب گھر کا کھاتے

"جا گھر" اور "تا کے" عالمانہ شائستہ خاندانوں میں بولے نہیں جاتے تھے یہ "جس گھر" اور "اس کے" کی تحریفی شکل بھی ہو سکتی ہے ۔

آسمان کی پہیلی ۔

ایک تھال موتی سے بھرا
سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھال پھرے
ایک نہ موتی اس کے گرے

آری کی پہیلی اسی شائستہ بولی میں دوسرے مصرعہ میں "ہر ہر" کا استعمال آری کی آواز کے لئے کتنا خوبصورت ہے ۔

ادھر کو آوے ادھر کو جاوے
ہر ہر پھیرے کاٹ وہ کھاوے
ٹھہرے جس دم وہ پیاری
خسرو کہے اسی کو آری

بڑی کی پہیلی ۔

ٹوٹی، ٹوٹ کے دھوپ پڑی
جوں جوں سوکھی ہوتی بڑی

دیا (چراغ) کی پہیلی ۔

بارا تھا تب سب کو بھایا
بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں
بوجھو نہیں تو چھوڑو گاؤں

لوٹے کی پہیلی ۔

کھڑا بھی لوٹا پڑا بھی لوٹا
بیٹھا ہے اور کہیں کہ لوٹا
خسرو کہے سمجھ کا ٹوٹا

قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ان مثالوں میں عربی فارسی کا کوئی لفظ نہیں ہے پھر بھی زبان کتنی شائستہ اور رواں ہے ۔ چوں کہ اس عہد کی علمی زبان فارسی تھی لہذا آگے بڑھ کر علمی ضرورتوں کے لئے اسی زبان میں فارسی اور عربی کے ساتھ عربی الفاظ شامل ہوتے ۔ لیکن یہ زبان عہد خسرو سے دکن تک اور دکن سے آج تک فارسی رسم الخط ہی میں لکھی گئی ۔ اس ہندوی کے علاوہ سندھی، پنجابی، کشمیری بلکہ تلگو

قبل ۱۱۹۱ء میں سلطان شہاب الدین غوری نے فتح کیا تھا۔ کیلوکھڑی کیقباد نے جمنا کے کنارے موجودہ ہمایوں بادشاہ کے مقبرہ کے عین جنوب ایک میل کے فاصلہ پر ۱۲۸۶ء میں ایک قلعہ بنوایا اور ایک عالی شان قصر تیار کیا۔ جس کے گرد ایک شاندار باغ بنا ہوا تھا کیقباد نے اس محل کا نام کیلوکھری رکھا۔ یہ نام امیر خسرو نے تجویز کیا۔ بادشاہ نے امیر خسرو سے فرمائش کی کہ محل کا نام ایسا تجویز کیا جائے جس میں اس کی بادشاہی کا اور اس کا ذکر بھی ہو اور خدا کا نام بھی آجائے اور بہت دور تک بھی لکھ سکیں امیر خسرو نے کیقباد کے معنی کے لوگ یعنی عوام بہری یعنی خدا۔ اس طرح کیلوک ہری نام رکھا گیا جو بعد میں چل کر کیلو کھڑی مشہور ہوا۔ ۱۲۸۹ء میں کیقباد کو ترک امراء نے معزول کر کے کیلوکھڑی کے محل میں نظر بند کر دیا۔ جلال الدین فیروز خلجی نے کیلوکھڑی کے پاس شہر آباد کیا تھا کیوں کہ وہ شہر کے رئیسوں سے مطمئن نہ تھے۔ اس نے کیلوکھڑی میں رہائش اختیار کی اور اس کی ناتمام عمارتوں کو پورا کیا دریا کے کنارے باغ، حصار، محل اور پتھر سے مسجد اور بازار بنا کر شہر آباد کیا اس کا نام شہر نو رکھا امیر خسرو نے اس قلعہ کی تعریف میں قران السعدین میں لکھا ہے۔

قصر فلک کہ بہشتی فراخ روضۂ طوبیٰ در او در آماخ

ایک شہر سیری تھا۔ اس کو دار الخلافہ کہتے تھے سلطان علاء الدین اور قطب الدین مبارک شاہ اسی شہر میں رہتے تھے۔ ایک شہر تغلق آباد تھا۔ اس قلعہ اور شہر کو غیاث الدین تغلق نے ۱۳۲۱ء میں امیر خسرو کے آخری دور میں بنانا شروع کیا تھا۔ امیر خسرو کی زندگی ہی میں یعنی ان کی وفات سے دو سال قبل قلعہ اور شہر بالکل تیار ہو گیا تھا۔

عمارتیں

امیر خسرو کے عہد میں دہلی میں جو عمارتیں تھیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

جامع مسجد

اس مسجد کا نام مسجد قوت الاسلام تھا جس کو سلطان قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۱ء اور ۱۱۹۶ء کے درمیان بنایا تھا۔ ابتداً یہ چھوٹی سی تھی۔ ۱۲۳۰ء میں یعنی امیر خسرو کی پیدائش سے ۲۳ سال قبل سلطان شمس الدین التمش نے شمال اور جنوب دونوں طرف اس کی توسیع کی سلطان علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۰ء میں مشرقی جانب توسیع کی اور دروازہ تعمیر کروایا جو علائی دروازہ کہلاتا ہے۔ امیر خسرو نے قران السعدین میں اس کے متعلق یہ لکھا ہے۔

مسجد او جامع فیض اله

زمزمہ خطبہ او تا بماہ

قطب صاحب کی لاٹھ

یہ مینار مسجد قوت الاسلام کے جنوب مشرقی گوشہ میں جمعہ کی اذان کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس کو قطب الدین ایبک نے بنانا شروع کیا تھا۔ سلطان شمس الدین التمش نے ۶۲۶ہجری میں اس کی تکمیل کی۔

مقبرہ شمس الدین التمش

قطب صاحب کی لاٹھ کے پاس یہ مقبرہ ہے یہ مقبرہ غالباً سلطانہ رضیہ نے بنوایا تھا اس مقبرہ کی عمارت باہر سے سنگ خارا کی ہے اور اندر سے سنگ سرخ کی۔ کہیں کہیں سنگ مرمر بھی لگا تھا۔ تمام دیواروں پر آیات قرآنی کندہ ہیں۔ اور پچی کاری کی ہوئی ہے۔

حوض شمسی

قطب صاحب کے نواح میں سلطان شمس الدین التمش نے ۱۲۲۹ء میں یہ حوض بنایا۔ حوض سنگ سرخ کا بنا ہوا تھا۔ اس کا طول دو میل اور عرض ایک میل تھا۔ امیر خسرو نے اس کی تعریف قران السعدین میں یوں کی ہے۔

در کمر سنگ میان دو کوہ آب گہر صورت دریا شکوہ

اس میں بارش کا پانی جمع ہوتا تھا اور اہل شہر اس کا پانی پیتے تھے شہر کی عیدگاہ بھی اس کے قریب تھی۔ جب حوض کے کنارے سوکھ جاتے تو ان میں ککڑی، خربوزے اور تربوز بوئے جاتے۔

حوض خاص

یہ حوض سلطان علاء الدین خلجی نے بنوایا تھا۔ یہ حوض حوض شمسی سے بھی بڑا تھا اس کے گرد اہل طرب رہتے تھے۔

پرانا قلعہ

راجہ انگپال نے ۱۰۶۰ء میں گدی نشین ہوا اس قلعہ کی تعمیر کی۔ اس کے دروازہ پر پتھر کے دو شیر بنے ہوتے تھے۔ جن کے پہلوؤں میں کانسے کے گھنٹے لٹکائے گئے تھے۔ جو بھی رات دن تک ایسی فریاد لے جانا چاہتا ان گھنٹوں کو بجاتا۔ یہ شیر امیر خسرو کے عہد میں موجود تھے۔

قلعہ رائے پتھورا

رائے پتھورا نے ۱۱۴۳ء میں یعنی امیر خسرو کی پیدائش سے ۱۱۰ سال قبل یہ قلعہ تعمیر کیا۔ یہ قلعہ ایک عرصہ تک بادشاہوں کا دار الخلافہ رہا۔ سلطان شمس الدین التمش اس قلعہ میں رہتے تھے۔ کیلوکھڑی کے پاس نیا شہر آباد ہوا تو یہ قلعہ پرانی دہلی کے نام سے مشہور ہوا۔

قصر سفید

قلعہ رائے پتھورا میں سلطان قطب الدین ایبک نے ایک محل بنایا اور اس کا نام قصر سفید رکھا۔ اس قصر میں سلطان ناصر الدین محمود تخت نشین ہوئے۔ ۱۲۶۰ء میں جب کہ خسرو کی عمر ۷ سال کی تھی ہلاکو خان کے سفیر نے بھی اس قصر میں منعقدہ ایک دربار میں شرکت کی۔

بازار سے متعلق کہا جاتا ہے کہ آسمان ستارہ بازار چشم فلک نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ سلطان غیاث الدین بلبن بھی اس قصر میں تخت نشین ہوئے۔

مسجد میری

سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے جامع مسجد جس کو مسجد میری کہتے تھے تعمیر کی علماء اور مشائخ کو انھوں نے دعوت دی کہ جمعہ کی نماز اس میں پڑھیں۔ شیخ نظام الدین اولیاء نے تو کیلوکھڑی کی مسجد میں نماز جمعہ کے لئے جایا کرتے تھے یہ کہلا بھیجا کہ جو مسجد میرے مکان سے قریب ہے اس کا حق ترجیح ہے۔

کوشک لال

سلطان غیاث الدین بلبن نے بادشاہ ہونے سے پہلے بنایا تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد اسی کوشک کے پاس عمارات پورا بنایا جو قلعہ مرغن سے مشہور ہوا۔ یہ اسی نواح میں تھا۔ جہاں حضرت نظام الدین اولیا کا مزار ہے۔ جلال فیروز خلجی کو کیلوکھڑی سے لاکر پرانی دہلی کے تخت پر بٹھایا گیا تو وہ وہاں سے کوشک لال آئے اور سلطان غیاث الدین بلبن کو یاد کرکے اس کے دربار روبرو سے پیادہ پا ہوتے۔ جلال الدین فیروز خلجی اکثر اس کوشک میں رہتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی کوشک سیری بنانے سے قبل اسی کوشک میں رہتے تھے۔

کوشک لال (دنیا شہر)

دوسرا کوشک لال سلطان فیروز خلجی کا بنایا ہوا ہے۔ جو کیلوکھڑی میں تھا امیر خسرو نے اس کوشک کی تعریف میں لکھا۔

ستہا در شہر توکردے حصارے
سر رفت از کنگرہ پا تا قصر سنگ

کوشک سبز

جلال الدین فیروز خلجی نے کوشک لال سے قریب ایک اور محل کوشک سبز بنایا تھا۔ جب ان کو قتل کیا گیا تو ان کے فرزند رکن الدین ابراہیم شاہ کو اسی کوشک میں تخت پر بٹھایا گیا

قلعہ علائی (کوشک سیری)

یہ قلعہ سلطان علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۳ء میں بنوایا۔

قصر ہزار ستون

علاء الدین خلجی نے ۱۳۰۲ء میں بنوایا۔ جب سلطان غیاث الدین تغلق نے خسرو خان پر فتح پائی تو اس قصر میں آکر سلطان قطب الدین اور اس کے بھائیوں کی تعزیت ادا کی۔

بازار

دہلی کے بازار بڑے بارونق تھے۔ امیر خسرو تحفۃ الصغر میں کہتے ہیں۔

"اس کے بازار میں آدمیوں کا اتنا ہجوم رہتا ہے کہ مردم چشم کو بھی دیکھنے والے کی آنکھ میں جگہ نہیں ملتی" دہلی میں زر و سیم کی کثرت تھی۔ امیر خسرو اعجاز خسروی میں کہتے ہیں۔

دریں شہر صد ہزاری زری مست کہ می رود

بازاروں میں بیرونی ممالک کا سامان بھی ملتا تھا۔ اور دور دراز سے تاجر سامان تجارت لے کر یہاں آتے تھے۔ غیر ملکی تاجروں کے خلاف امیر خسرو نے ایک عرضداشت لکھی کہ یہ تاجر دوسرے ممالک سے سرمایہ حاصل کرکے یعنی استحصال کرکے یہاں آئے ہیں سلطان علاء الدین خلجی نے ملتانی سوداگروں کی ایک کمپنی یا کارپوریشن بنائی تھی اور قیمتی کپڑے لانے کا کام ملتانی سوداگروں کے سپرد کیا تھا۔ ان کو سلطنت سے تجارت کے لئے ایک معقول رقم بھی ملتی تھی۔ ان کو سونے کے ٹکے دیئے جاتے تھے۔ کیوں کہ ان تاجروں کو سلطنت دہلی کے باہر سے سامان لانا پڑتا تھا۔ خراسان سے کشمش اور بادام بھی اس زمانہ میں درآمد ہوتے تھے۔

اس زمانہ میں ساہوکاروں کا علیہ تھا جو زیادہ تر ہندو تھے۔ دہلی کے امراء اکثر ان کے مقروض رہتے تھے ان کے سود کی شرح دس فی صدی سالانہ تھی۔

سکے

ہندوستان میں روپیہ کا استعمال شیر شاہ کے وقت سے ہوا۔ ہندوستان کا قدیم سکہ ٹنکہ تھا۔ امیر خسرو کے عہد میں ٹنکہ سرخ۔ ٹنکہ سفید اور جیتل رائج تھے ٹنکہ سرخ خالص سونے کا سکہ تھا جو ۱۰ رتی اور بعض اوقات ۱۱۲ رتی کا ہوتا۔ ٹنکہ سرخ کا استعمال زیادہ تر بیرونی تاجر کرتے تھے ٹنکہ سفید خالص چاندی کا سکہ تھا جو ۸ رتی اور ۱ رتی کا ہوتا بازار میں خرید و فروخت میں جیتل استعمال ہوتا ایک ٹنکہ سفید کے ۴۸ جیتل ہوتے۔ سنگانی اور ہشتگانی سکے رائج تھے جو علی الترتیب چھ جیتل اور ۸ جیتل کے ہوتے۔

سلطان غیاث الدین بلبن اور جلال الدین فیروز شاہ کے زمانہ میں طلائی اور نقرئی سکوں پر ایک جانب خلیفہ عباسی مستعصم کا نام "الامام مستعصم امیر المومنین" اور دوسری طرف علی الترتیب "السلطان الاعظم غیاث الدنیا والدین ابو المظفر بلبن السلطان" اور "السلطان الاعظم جلال الدنیا والدین ابو المظفر فیروز شاہ السلطان" منقوش ہوتا تھا۔ البتہ علاء الدین خلجی کے سکوں پر خلیفہ عباسی کا نام نہ ہوتا تھا ایک طرف "یمین الخلافت ناصر المومنین" اور دوسری طرف "علاء الدین خلجی" منقوش تھا۔

اوزان اور پیمانے

اس زمانے کا من ۴۰ سیر کا ہوتا تھا لیکن فرشتہ کے مطابق علاء الدین خلجی کے عہد میں "من آں وقت چہل سیر بود و دو سیر ہفت و چہار تولہ" اگر ۸۰ تولہ کا سیر قرار دیا جائے تو ۱۲ سیر کا من ہوا۔

نرخ

ہر خورد کے مطابق غیاث الدین بلبن کے عہد میں دو جیتل کا ایک من خربوزہ اور ایک جیتل کی دو سیر میدے کی روٹی بکتی تھی۔

علاءالدین خلجی نے اجناس کی حسب ذیل قیمتیں مقرر کی تھیں۔

گیہوں	۷ ۱/۲	جیتل	فی من
جو	۴	"	فی من
ماش	۵	"	" "
نخود	۵	"	" "
موٹھ	۳	"	" "
شکر تری	۱ ۱/۲	"	فی سیر
گڑ	۱/۳	"	" "
گھی	۱/۲	"	" "
روغن کنجد	۱/۳	"	" "
نمک	۱/۵	"	" "

بول چال

اہل دہلی کی زبان کھڑی بولی تھی جو صرف بول چال کی زبان تھی۔ اور لکھی نہیں جاتی تھی۔ ہندو اور مسلمانوں نے اس بولی کو اپنی زبان بنایا تھا۔ اس کو اور دوسری علاقہ واری زبانوں کو امیر خسرو کے عہد میں ہندوی کہتے تھے۔ امیر خسرو لکھتے ہیں۔

سندی و لاہوری و کشمیر کبر　　دھور سمندری تلنگی و گجر

معبری و گوری و بنگالی و اودھ　　دہلی و پیرامنش اندر ہمہ حد

این ہمہ ہندویست از ایام کہن　　عامہ بکار است بہر گونہ سخن

امیر خسرو کے نانا، ان کی والدہ اور سارا ننھیال دہلی کی شائستہ ہندوی بولتا تھا۔ امیر خسرو کے عہد میں اس بولی پر فارسی کا اثر پڑ چکا تھا۔

پالکی

امیر خسرو کے عہد میں شریف عورتیں ڈولیوں یا پالکیوں میں آتی جاتی تھیں۔ اور مرد بھی عام طور پر بسہولت و آرام پالکیوں کو استعمال کرتے تھے۔ آٹھ آدمی باری باری اس کو اٹھاتے تھے۔ چار آدمی اٹھاتے اور چار ساتھ ساتھ چلتے جن کے پاس نوکر ہوتے وہ ڈولی کو اٹھاتے ورنہ ایسے آدمی جب کہ روزی کا انحصار اس پر تھا اجرت پر یہ کام کرتے۔ بازاروں میں بادشاہ کے محل کے پاس یا امراء کے دروازوں پر یہ لوگ کھڑے رہتے۔

میوے اور غلے

امیر خسرو نے ہندوستان کے جن میووں کا ذکر کیا ہے ان میں آم کو فوقیت حاصل ہے یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ آج بھی اور پیوندی دو قسم کے آم پائے جاتے ہیں۔ پیوندی آم مغلوں کی دین ہے اور بعد میں پرتگیزیوں نے اس فن کو مزید ترقی دی۔ امیر خسرو کے عہد میں صرف تخمی آم ہوتے تھے انھوں نے آم کے بارے میں لکھا ہے۔

نغزک ما نغز کن بوستان　　نغز ترین میوہ ہندوستان

اس زمانہ میں کچے آم کا اچار بنانے کا بھی رواج تھا۔

دوسرے میووں میں کٹھل جامن۔ کھرنی۔ انار۔ انگور۔ خربوزے اور تربوز دہلی میں ہوتے تھے۔

خربوزہ کی تعریف امیر خسرو نے یوں کی ہے۔

خربزہ گوئی کہ صحرا او نشست　　گوئی زلولوء ارغوان بہشت

امیر خسرو نے پان کو بھی ہندوستان کے میوہ میں شمار کیا ہے کہتے ہیں۔

نادرہ برگی چو گل بوستان　　خوشترین میوہ ہندوستان

گرسنہ را گرسنگی کم شود　　سیر خورد گرسنہ در دم شود

جہاں تک اناج کا تعلق ہے خریف کی فصل میں باجرہ۔ لوبیا۔ موٹھ اور ربیع کی فصل میں گیہوں۔ چنا جو بوتے تھے۔ چاول۔ تل اور شکر کی کاشت بھی کی جاتی تھی

کھانے

سات سو سال کے طویل عرصے میں پکوان کے طریقے اور نام بدل گئے ہیں اور ان میں کافی تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں لیکن چند پکوان اس وقت بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کھچڑی۔ سموسہ۔ کھیر اور اچار اس وقت بھی مروج تھے۔ اچار کے متعلق امیر خسرو کا مصرع ہے

نعمہ برد و زیرگر آچار میانی

رسوم

چند مراسم کا ذکر جو اس دور میں رائج تھے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

سیم کی رسم

یہ دستور تھا کہ کسی کا انتقال ہو تو سب اعزہ اور احباب تیسرے دن صبح اس کی قبر پر جاتے اور قبر کے ارد گرد ریشمی کپڑے اور گملے رکھتے اور قبر پر پھول رکھتے ناریل اور لیمو کی ٹھہنیاں بھی قبر پر رکھتے۔ سب لوگ اپنے اپنے کلام اللہ لاتے اور وہاں پڑھتے جب ختم کر چکتے تو لوگوں کو گلاب پلایا جاتا اور گلاب ان پر چھڑکا جاتا۔ اور پان بھی دیئے جاتے۔ پھر سب لوگ واپس ہوتے۔

عید

عید کے دن خطیب ہاتھی پر سوار ہوتا۔ ہاتھی کی پشت پر موجود ہوتا خطیب کالے کپڑے پہنا ہوتا۔ ہاتھیوں پر سوار خطیب کے آگے آگے تکبیر پڑھتے جاتے۔ شہر کے مولوی اور قاضی بھی سوار ہوتے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ صدقہ ہوتا جو عیدگاہ کے راستے میں تقسیم کر دیے جاتے۔ عیدگاہ میں سائبان لگایا جاتا۔ اور فرش بچھایا جاتا۔ جب سب نمازی

صبح ہو جاتے تو خطیب نماز پڑھاتا اور خطبہ پڑھتا۔ اس کے بعد سب لوگ اپنے گھروں کو واپس جاتے۔

ستی

ستی ہونا واجب نہیں تھا۔ اگر کوئی بیوہ عورت ستی ہوتی تو وہ اہل وفا مانی جاتی اور اس کا خاندان معزز مانا جاتا۔ جو عورتیں ستی نہیں ہوتیں ان کو موٹے کپڑے پہننے پڑتے اور طرح طرح کی خواری میں زندگی بسر کرنی پڑتی۔ جب کوئی عورت اپنے شوہر کے مرنے پر ستی ہونے کا ارادہ کرتی تو وہ سولہ سنگار کرتی اور اس کو گھوڑے پر سوار کیا جاتا۔ لوگ اس کے پیچھے چلتے آگے نوبت بجتی۔ برہمن بھی ساتھ ساتھ چلتے۔ بادشاہ کی اجازت کے بغیر جلایا نہ جا سکتا تھا۔ لیکن یہ اجازت دے دی جاتی۔ امیر خسرو کو اس رسم میں ہندوستانی عورت کی وفاشعاری نظر آتی جس کو انھوں نے یوں ظاہر کیا ہے۔

خسروا در عشقبازی کم ز ہندو زن مباش
از برائے مردہ سوزد زندہ جان خویش را

شادی بیاہ کے رسوم

امیر خسرو کے عہد تک تو وارد مسلمانوں نے ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور مقامی آبادی سے ان کا میل جول بڑھ گیا تھا جس کے نتیجے کے طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی تہذیب کے عناصر کو اپنانا شروع کر دیا تھا۔ مسلمانوں نے مذہبی رسوم اور تہواروں کو اپنانے میں دشواری محسوس کی لیکن شادی بیاہ کے رسوم کو آسانی سے اور ابتدائی دور ہی میں اپنا لیا تھا۔ مثنوی دولرانی خضر خاں میں امیر خسرو نے جو تفصیلات پیش کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے علاوہ سارے رسوم ہندوستانی تھے۔

انتظام سلطنت

امیر خسرو کے عہد میں سلطان اقتدار اعلیٰ کا مالک تھا۔ وہی قانون کا منبع اور تمام مقدمات کے آخری مرافعے بھی سماعت کرتا۔ اور وہی فوج کا چیف کمانڈر ہوتا۔ البتہ سلطان مذہبی امور میں علماء سے مشورہ کرتا۔ کیوں کہ اس زمانہ میں شریعت کے احکام کی پابندی ضروری تھی۔ اور سلطنت میں سلطان مجلس وزرا (مجلس خلوت) سے مشورہ کرتا۔ ایسا مشورہ سلطان کے لئے لازمی نہ تھا لیکن اکثر سلطان مشورہ ضرور کرتے۔ سلطان عموماً تین چار امرا سے مشورہ کرتا۔ مجلس خلوت میں وہی شرکت کرتے جنھیں سلطان طلب کرتا۔ کوئی حق کی بنا پر شرکت کا ادعا نہیں کر سکتا تھا۔ اس زمانہ میں سلطنت کی تشکیل میں عرب و ایران کے افکار کا امتزاج تھا۔ اور فوج کی ترتیب ترک و منگول طرز پر تھی۔ طریقہ مال گزاری ہندوستانی تھا۔ اس زمانہ میں دربار دو قسم کے تھے۔ بار عام اور بار خاص۔ بار خاص میں خان، ملک اور امیر شریک ہوتے۔ بار عام میں ہر کوئی شریک ہو سکتا تھا۔ بار عام کا انتظام امیر حاجب کے ذمہ ہوتا۔ اور عوام کی درخواستیں سلطان کو پیش کرتا۔ نائب حاجب اور حاجب اس کو فرائض کی تکمیل میں مدد دیتے۔ جب کوئی شخص دربار میں جاتا تو حاجب اس کو آداب دربار سے واقف کرواتے۔ اور اس کو ہاتھ پکڑ کر ایک خاص مقام پر لے جاتے تاکہ وہاں سے تعظیم بجا لائے۔

باربک [illegible] کے مماثل عہدہ تھا۔ دربار میں مختلف درجہ کے لوگوں کے مقام کا تعین کرنا اس کے فرائض میں داخل تھا۔

وزیر سلطان کی عدم موجودگی میں کاروبار سلطنت انجام دیتا۔ اس زمانہ میں محکموں کو دیوان کہتے۔ مثلاً دیوان اشراف (محکمہ آڈٹ)، دیوان کوہی (محکمہ زراعت)، دیوان عرض (محکمہ فوج)، دیوان انشاء، دیوان عمارت، دیوان وزارت (محکمہ مالگزاری) وغیرہ۔ ہر محکمہ کے صدر کو ممالک کہتے مثلاً مستوفی ممالک (آڈیٹر جنرل)، وزیر ممالک (وزیر خزانہ)، عارض ممالک (وزیر فوج) یہ سپہ سالار نہ ہوتا بلکہ سپاہیوں کا تقرر اور ان کی تنخواہوں کی تقسیم اس سے متعلق تھی۔ قاضی ممالک (چیف جسٹس)۔ بڑے محکموں کے علاوہ کارخانہ جات بھی ہوتے۔

چند عہدوں کے نام یہ تھے۔

صدر جہاں (قاضی القضاۃ) ایک مرکزی افسر تھا جس کے ذریعہ سے ہی علماء کی مدد معاش، مساجد کی تعمیر، اوقاف کے انتظام وغیرہ کا ذمہ دار ہوتا۔

کوتوال شہر میں پولیس کا اعلیٰ عہدہ دار ہوتا تھا۔

خریطہ دار جس کے پاس بادشاہ کا قلمدان ہوتا۔

مہردار۔ بادشاہ کی مہر رکھتا تھا۔

شرابدار۔ بادشاہ کے استعمال کے پانی اور دیگر مشروبات کا منتظم ہوتا تھا۔ سلطان [illegible] شراب نہیں پیتے تھے لیکن اس عہدہ کا نام نہیں بدلا۔

چاشنی گیر۔ دسترخوان پر لانے سے پہلے ہر ایک کھانے کو چکھنے اور اپنی حفاظت میں بادشاہ کے روبرو لانے کا کام اس سے متعلق ہوتا تھا۔

میر داد۔ عہدہ دار قاضی کے ساتھ بیٹھتا۔ اگر کوئی شخص امیر یا بڑے آدمی پر نالش کرتا تو وہ اس کو قاضی کے روبرو حاضر کرتا۔ اس عہدہ کو وکیل سرکار کے مماثل قیاس کیا جا سکتا ہے۔

دواتدار۔ جس کے پاس بادشاہ کی دوات رہتی۔

شیخ الاسلام صرف ایک اعزاز تھا جو بادشاہ کی طرف سے ملک کے سب سے بزرگ شیخ کو دیا جاتا تھا۔ لیکن شیخ الاسلام کی بزرگی کا اعتراف کرنا یا اس کو رد کرنا مسلم ملت کے ہاتھ میں رہتا۔

امیر خسرو کے عہد میں سرکاری خزانہ سے رقومات کی ادائیگی حوالہ جات کے ذریعہ ہوتی تھی۔ اس چٹھی میں یہ درج ہوتا تھا کہ بادشاہ کا حکم ہے کہ خزانہ سے فلاں شخص کو فلاں واجب کی مناسبت سے اس قدر رقم ادا ہو۔ اس چٹھی پر چٹھی لانے والا اور جس کی مناسبت پر رقم ادا کی جا رہی ہو دستخط کرے۔ اس کے علاوہ میں امیروں کے دستخط ہوتے۔ پھر دیوان وزارت کے پاس لے جاتے۔ متصدی اس کی نقل لے لیتے جو پروانہ لکھا جاتا جس پر دبیر خزانچی کو حکم دیتا۔ خزانچی اسے حساب میں درج کرتا۔ ہر دور کے پروانوں کا چٹھا بادشاہ کے سامنے پیش کرتا جس کے لئے بادشاہ کا حکم ہوتا کہ فوراً ادا کرو اسی وقت دے دیا جاتا۔ بعض دفعہ یہ دو دو تین تین سال بعد ملتا۔ اس زمانہ میں دستور تھا کہ جس قدر انعام کا حکم دیا جاتا اس کا دسواں حصہ یعنی عشر وضع کر کے بقیہ رقم انعام ہوتی۔

باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمایں

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

امیر خسرو — ایک عظیم اور سچا محبِّ وطن

برُد ز حسرت وا ہے تذکرہ شکر دادم
کز کام طوطیِ ہندوستان شود شیریں

ہندوستان جنت نشان، ابتدا سے صدہا سدا بہار پھولوں کا گلشن، رشیوں و منیوں کا استھان، دانشوروں اور مفکروں کا مرکز، معلموں اور فلسفیوں کا مخزن اور ادیبوں اور شاعروں کا معدن رہا ہے۔ اس خاک پاک نے ایسے ایسے خلاقِ معانی پیدا کئے، جو نہ صرف اپنے زمانے میں منفرد و یکتا تھے، بلکہ آج تک دنیا ان کا ثانی نہیں پیدا کر سکی۔ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

حضرت امیر خسرو خلاقِ معانی بھی تھے اور غواصِ معانی بھی۔ ان کا شمار ہندوستان کی ان باکمال ہستیوں کی صفِ اول میں کیا جاتا ہے، جو علم و فن اور فضل و کمال کی مجسم تصویر تھے۔ ان کی ہمہ گیر اور دلکش شخصیت نے ایک عالم کو سدا اپنا بنا لیا تھا۔ امیر و غریب، شاہ و گدا، رند و پارسا، ہندو و مسلمان، سب ان کے فدائی، بڑے بڑے جلیل القدر اور عظیم المرتبت سلاطین ان کی قدر و منزلت کرنا اپنا فخر سمجھتے تھے۔ ان کے سرمدی نغمے اور میٹھے بول لوگوں کے دلوں میں کیف و سرور پیدا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری معرفت و تصوف کا گنجینہ ہے۔ ان کے ہندی بول، پہیلیاں اور گیتوں کا آہنگ، صدیاں بدل گئیں، لیکن اس باکمال انسان اور صوفی شاعر کے کلام کی تازگی اور دلکشی کم نہیں ہوئی۔

مادرِ ہند کا یہ قابلِ فخر اور نامور فرزند تیرہویں صدی عیسوی (۱۲۵۳ء) میں بمقام مومن پور پٹیالی ضلع ایٹہ، اترپردیش میں پیدا ہوا۔ یہ روایت مشہور ہے کہ پدر بزرگوار امیر سیف الدین محمود، نومولود کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر وہاں کے ایک صاحبِ حال بزرگ کی خدمت میں لے گئے۔ بچہ کو دیکھتے ہی ان بزرگ نے فرمایا۔

"یہ لڑکا عارف باللہ اور یگانۂ روزگار ہوگا۔ قیامت تک اس کا نام باقی رہے گا، اور وہ قدم خاقانی سے آگے بڑھ جائے گا۔ اس کے بعد دعا دی کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہر دلعزیز کرے۔"

بزرگِ محترم کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ نومولود نہ صرف عارف باللہ اور یگانۂ روزگار ہوا۔ بلکہ صاحبِ سلطنت و قلم بھی ہوا۔ اس نے علم و ادب کے دریا بہا دیئے۔ اس نے فنِ موسیقی میں اضافہ کرکے اس کو دلکشی اور رعنائی عطا کی۔ اس کی شیریں سخنی اور خوش گوئی نے اسے "طوطیِ ہند" بنا دیا۔

امیر سیف الدین محمود چار سال کے بعد خسرو کو پٹیالی سے دہلی لے آئے۔ یہاں ان کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کیا۔ ابھی وہ نو برس ہی کے تھے کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ خسرو کے معصوم اور ننھے دل پر جو بیتی اس کا اظہار انھوں نے برجستہ اس غم انگیز شعر میں کیا۔

سیف از سرم گذشت و دلم دو نیم ماند
دریائے من رواں شد و دُرِّ یتیم ماند[۱]

باپ کی وفات کے بعد خسرو کے نانا، نواب عماد الملک نے اپنے اس ہونہار نواسے کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ نواب عماد الملک بڑے پایہ کے امیر تھے۔ ان کی امارت و سخاوت اور علمی سرپرستیوں کا شہرہ دور دور تک تھا۔ بڑے بڑے علماء و فضلاء ان سے وابستہ تھے۔ ان کی مجلس میں ہر علم و فن کے اربابِ کمال شریک ہوتے۔ علم و فضل و کمال کا ایک چشمہ تھا جو ہر وقت جاری رہتا اور جس سے تشنگانِ علم و فن اپنے کام و دہن سیراب کرتے رہتے۔ شیخ المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کا قیام بھی نواب صاحب کے یہاں اکثر و بیشتر رہتا۔ خسرو کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں علم و فضل، مذہب و تصوف کا ایسا صاف ستھرا اور پاکیزہ ماحول ملا۔ بزرگ نانا کی شفقت اور اس پاکیزہ ماحول کی برکت سے خسرو کی فطری ذہانت اور خداداد صلاحیت کو جلا ہوئی۔ انھوں نے کم سنی ہی میں تمام مروجہ علوم و فنون، فقہ، حکم

[۱] دیباچہ غرۃ الکمال [illegible]

صرف و نحو، فلسفہ، منطق، ادب، تاریخ وغیرہ میں کمال حاصل کرلیا۔ مذہب و تصوف، شریعت و طریقت کے وہ سالک ہوگئے۔ موسیقی میں اختراع و ایجاد سے شہرۂ آفاق ہوئے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی ایسا علم و فن ہو جس پر انھوں نے دسترس نہ حاصل کی ہو۔ وہ بہت سی زبانیں جانتے تھے۔ ترکی، فارسی تو ان کی مادری زبانیں ہی تھیں۔ عربی پر بھی انھیں قدرت حاصل تھی۔ ہندوستان کی متعدد زبانوں سے واقفیت تھی۔ سنسکرت میں بھی مہارت تھی۔ لیکن انھیں ہندوی (ہندی) سے بہت لگاؤ تھا۔ ہندوی زبان کے جاننے پر وہ فخر بھی کرتے تھے۔

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

ہندوی میں شعر گوئی طرۂ امتیاز سمجھتے ہے

"چو من طوطیٔ ہندم راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم"

اس طوطیٔ ہند کی روانی ہر وقت، ہر جگہ شعر کے سانچے میں ڈھلتی رہتی تھی۔ دس سال کی عمر سے ہی عروس سخن کے گیسو سنوارنے میں ایسا کمال حاصل کرلیا تھا، اور اتنی جلد بامعنی شعر موزوں کرلیتے تھے کہ لوگ حیرت زدہ ہوجاتے تھے۔ مشہور ہے کہ بچپن ہی میں خواجہ عزالدین نے امتحاناً چار غیر متناسب الفاظ، مو، بیضہ، تیر اور خربزہ، نظم میں موزوں کرنے کے لیے دیئے۔ خسرو نے برجستہ یہ رباعی کہی۔

ہر موئے کہ در دو زلف آں صنم است
صد بیضۂ عنبریں برآں موئے ضم است
چوں تیر مداں راست دلش زیرا
چوں خربزہ دندانش میان شکم است

"یہ سن کر خواجہ کو سخت تعجب ہوا۔ انھوں نے خسرو کی بے حد تعریف کی اور دعائیں دیں۔

خسرو کی شاعرانہ فطرت میں علمی و ادبی ماحول نے چار چاند لگا دیئے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضری نے خلوص و صداقت، درد و اثر اور سوز و گداز عطا کیا۔

امیر خسرو نے بڑی عمر پائی۔ انھوں نے غیاث الدین بلبن سے لے کر غیاث الدین تغلق کے زمانے تک گیارہ سلاطین کا زمانہ دیکھا۔ بادشاہوں کا عروج و زوال پے بہ پے کئی خاندانوں کی حکومت، سب انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن ان کی علمیت و قابلیت، دانشمندی و ذہانت اور ان سب سے بڑھ کر ان کی روحانی [illegible] کہ ہر سلطان نے انھیں عزت و احترام کے قابل سمجھا اور ان سے رابطہ رکھنے میں سعادت و شرف کا باعث سمجھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ خسرو بے لوث انسان تھے۔ یکتائے روزگار تھے۔ روحانیت کے تاجدار تھے۔ سیاست سے واسطہ نہیں رکھتے تھے، امور سلطنت میں دخل دینے اور کوئی عہدہ قبول کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ اپنے عادات و خصائل کے اعتبار سے وہ مجسمۂ شرافت و انسانیت تھے۔ ان کی شخصیت ہشت پہلو نگینہ کی طرح ہے۔ ان جیسا صاحبِ کمال، ظاہری و باطنی علوم کا ماہر، مرجع خلائق، ہر دلعزیز، بے تعصب، نیک اور پارسا، و حق صفات حسنہ کا مجموعہ صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں امیر خسرو۔

"امیروں میں امیر، فقیروں میں فقیر، عارفوں کا سردار، شاعروں کا تاجدار، شعر و ادب کے دیوان اس کی ادبی عظمت کے گواہ، خانقاہیں اور سجادے اس کے مرتبۂ روحانی سے آگاہ، سر شاہ آجائے تو حیرت میں اسے پائے، خاندان چشت اہل بہشت کے کوچے میں آنکلے تو حلقۂ ذکر و فکر میں سرِ مسند جلوہ اس کا دیکھیے اچھے اچھے شیخ اس کا دم بھر رہے ہیں۔ معرفت و طریقت کے حرف شناس کلمہ اس کے نام کا پڑھ رہے ہیں[۱]"

خسرو کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی حب الوطنی ہے۔ اپنے وطن ہندوستان سے انھیں بے پناہ اور والہانہ محبت تھی۔ جس پاکیزہ ماحول میں وہ پروان چڑھے تھے، جن بزرگوں کی صحبت سے وہ مستفیض ہوئے تھے ان کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ وطن کی محبت کو اپنا ایمان سمجھیں۔ اور ے

خاک وطن از ملک سلیماں خوشتر
خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

کو حرزِ جاں بنائیں۔ شاعری کی طرح وطن کی محبت بھی خسرو کی طبیعت میں طوفانِ اضطراب برپا کیے رہتی تھی۔ انھوں نے ہندوستان اور اس کی ایک ایک چیز کی جیسی اور جتنی تعریف اور بڑائی کی ہے شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے اس عقیدت کے ساتھ لکھی ہو۔ انھیں یہاں کے ذرہ ذرہ اور چپہ چپہ سے عشق تھا۔ وہ ہندوستان کو تمام دنیا سے بہتر اور افضل سمجھتے تھے۔ یہاں کے انسان، مذہب، رسم و رواج، طور طریق، زبان، لباس، عمارتیں، باغات، چمن، میوے، پھل، پھول، پرندے، جانور، دریا، پہاڑ، سبزہ زار، میدان، غرض ہر چیز ان کی نظر میں تمام دنیا سے بہتر اور اعلیٰ ہے۔ اپنے وطن اور وطن کی ہر چیز سے یہ والہانہ محبت اسی کو ہوسکتی ہے جو سچا محب وطن ہو۔ جسے اپنے وطن کے بنانے اور سنوارنے کی دھن ہو۔ جو اس کی تعمیر و ترقی، فلاح و اصلاح کا دل سے خواہشمند ہو۔ جب ہم اس نقطۂ نظر سے خسرو کی حیات، ان کے خیالات اور کارناموں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ہندوستان کے وہی ایک ایسے اور پہلے سپوت نظر آتے ہیں جنھوں نے مادر وطن کی عظمت و فضیلت کو دلائل و براہین سے ثابت کردیا کہ خطۂ ارض پر ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انعامات کی بارش کی ہے اور جس کو ہر قسم کی دولت اور خوبی سے مالامال کیا ہے۔

یوں تو ارباب حکومت اور سلاطین سے وابستگی کی وجہ سے وہ ہندوستان

۱۔ انشائے ماجد (ص ۱۹-۲۱۸)

کہ مختلف مقامات پر جاتے رہے اور وہاں کے حالات وکوائف سے واقفیت حاصل کرتے رہے۔ لیکن ان کا مستقر دہلی رہا وہ خود دہلی پر دل و جان سے فدا تھے۔ اس لئے قدرتاً انہیں دہلی اور دہلی والوں سے زیادہ محبت تھی۔ دہلی کی تعریف میں ان کا قلم بڑا پرجوش و نشاط انگیز ہو جاتا ہے۔ قرآن السعدین میں لکھتے ہیں کہ "دہلی کی صفات اور خصوصیات ہیں ارم کی طرح ہے۔ عدن کی جنت ہے۔ انتہا یہ ہے کہ حضرت نے دہلی کو مکہ معظمہ سے بھی زیادہ محترم بتایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:
"اس بوستاں کا قصہ سن کر مکہ بھی اس کا طواف کرنے لگے۔"[1]
یہاں کی آب و ہوا، محصول، میوے، باغات، عمارتوں اور باشندوں کی تعریف کی ہے۔

حضرت دہلی کنف دین و داد
جنت عدن ست کہ آباد باد
گر شنود قصہ این بوستان
مکہ شود طائف ہندوستان[2]

عمارتوں میں قلعہ، جامع مسجد، قطب مینار، حوض شمسی، قصر ہوکی تعریف کی ہے۔ اسی طرح مردان و تبانِ سادہ دہلی کے لئے لکھتے ہیں

مردم او جملہ فرشتہ سرشت
خوش دل و خوش خوئے چو اہل بہشت
بیشتر از علم و ہنر بہرہ مند
و اہل سخن خود کہ شمارد کہ چند

چوں ز سخن بگذری آہنگ و ساز   نغمۂ مرغان بریشم نواز
و از سر بیرہ و پیکان و تیر   ہر کہ درآید بہ نظر لے لطیف[3]

حضرت نے ہندوستان کی عظمت و فضیلت کے اسباب بھی بتائے ہیں کہ اسے دنیا کے تمام ملکوں پر کیوں برتری اور شرف حاصل ہے وہ کہتے ہیں کہ:
"لوگ مجھے طعنہ دیتے ہیں کہ میں ہندوستان کو روم، خراسان، ختن، عراق و خطا سے کیوں بہتر سمجھتا ہوں جو صاحب انصاف ہیں وہ میری تعریف کرتے ہیں لیکن جو کینہ پرور اور حاسد ہیں وہی نفریں کرتے ہیں۔"

منصف دانندہ تحسیں کند ش   حاسد پر کینہ نفریں کند ش

حضرت کے نزدیک ہندوستان کی ترجیح کے دو نمایاں اسباب ہیں:

دو ہم باعث ایں کار شد ہ   کاں دو سبب حجت گفتار شدہ
آں ست یکے کیں زمین از دور زمن   ہست مرا مولد و ماویٰ و وطن
دیں ز رسول آمدہ کاں ہر دو دیں   حب وطن ہست ز ایماں بہ یقیں
من ہمہ دہ کردم از ینجا روی علم   گر وطنے ہست زا کوئی تو ہم
دومش آں کیں زمیں قطب نماں   ہست چو راجح ز ہمہ ملک جہاں
گرچہ کہ ترجیح بہ راجح نہ روا   از پئے تاکید شد ایں بانگ و نوا

معذرت خود ہمہ دادم چو بروں   ہاں بنگر تا کندوں روش سحر و فسوں[4]

وہ اسی پر بس نہیں کرتے وہ ہندوستان کی فضیلت علوم و فنون کی مرکزیت ایجادات نعرہ و سرود اور دوسرے کمالات کی وجہ سے بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک کم از کم دس وجوہ ایسی ہیں جن میں ہندوستان یکتائے زمانہ ہے:

(۱) پہلا سبب یہ ہے کہ یہ ملک علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔ یہاں ہمیشہ علم کی اتنی فراوانی رہی ہے کہ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

اولش آں شد کہ دریں ملک دروں   علم ہمہ جاست ز اندازہ فزوں
لیک دگر جائے بدارند ہنر   رائج کہ در ہند علوم است و ہنر

(۲) دنیا میں ہندوستانیوں ہی کی یہ صفت اور خصوصیت ہے کہ وہ ہر زبان کو آسانی کے ساتھ سیکھ لیتے ہیں۔ جبکہ دوسرے ملکوں کے باشندے اس خوبی سے محروم ہیں وہ نہ تو یہاں (ہندوستان) کی زبان اتنی جلد سیکھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں۔

ہست دوم آنکہ ز ہند آدمیاں   جملہ بگویند زباں ہا بہ بیاں
لیکن از اقصائے دگر ہیچ کسے   گفت نیارد سخن ہند بسے
زہرہ نہ باشد دگرے را کہ گہے   از سر قوت کند ایں سو نگہے

(۳) دنیا میں ہندوستان ہی صرف ایسا ملک ہے جو ہمیشہ سے علوم و فنون کا مرکز رہا۔ دنیا کے چپہ چپہ سے لوگ یہاں علم حاصل کرنے کے لئے آتے رہے ہیں۔ کسی ہندوستانی کو کبھی یہ ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ تحصیل علم کے لئے باہر کسی دوسرے ملک میں جائے۔

حجت سوئم شنو از من بہ خرد   کاں زرہ عقل بدولت انزرد
کایں طرف از ہر طرفے اہل ہنر   در طلب علم و ہنر کردہ گزر
لیک بہ تحصیل حکم برہمن ہیچ طرف   برہمن از ہند نہ شد ہیچ طرف

(۴) ہندوستان ہی کو یہ فخر و شرف حاصل ہے کہ وہ علم ہندسہ، ریاضی اور صفر کا موجد ہے۔

حجت چارم رقم ہندسہ ہیں   کاہل حساب، وضع نہ دیدند چنیں
ہم سیکے صفر کہ نقشے است تہی   بس چہ رموز است خوش حلیت دہی
علم ریاضی کہ خرد شد خوش ازو   وضع مجسطی شد و اقلیدس ازو
آں ہمہ علم و عدد ش زیر و زبر   بر رقم از نیست خطا صفر قمر
چوں حکما حملہ از وجستہ مدد   پس ہمہ شاگرد برہمن بہ عدد

(۵) کلیلہ دمنہ جیسی مفید، دلچسپ اور بے مثل کتاب یہیں لکھی گئی جس سے تمام دنیا مستفید ہوتی ہے۔

حجت پنجم بہ بیاں شرح کنم   مدعیاں را بخرد جرح کنم
دمنہ کلیلہ ز دو دام سخن   وانکہ ہم از ہند شد ایست کہن
حکمت از ینجا بہ چہ بود کز ہمہ سو   سوئے شے آرند حکیماں ہمہ رو

(۶) علم و فن ہی نہیں ہندوستان نے ایسے ایسے کھیل ایجاد کئے ہیں، جو انسان کے ذہن و دماغ کو روشن کرتے ہیں۔ اور اس کا غم غلط کرتے ہیں:

---

[1] قرآن السعدین ص ۲۸ تا ۳۴ [2] قرآن السعدین ص ۲۸ تا ۳۴ [3] حوالہ بالا [4] مثنوی نہ سپہر ص ۱۴۹ تا ۱۵۱

حجت ششم بازی شطرنج شو   رنج کہ از سینہ رو رنج سمو
گر بہ اندازہ اقلیم دگر   وضع شدی علمی ارباب ہنر
برتری از ہند بخندند ہمہ   معترف عجز نشستند ہمہ

(۶) چوتھی پانچویں اور چھٹی حجت یعنی ہندسہ کلیلہ و دمنہ اور شطرنج سے تمام دنیا کو فائدہ پہنچا۔ خسرو نے ان ملکوں ایجادوں کے عمومی فوائد کو ساتویں حجت بتائی ہے

حجت ہفت آنکہ کلی ہر سہ ہنر   ہندسہ و دمنہ و شطرنج نگر
ملک جہاں راست چو دستور شدہ   رونق بر جملہ معمور شدہ
جملہ جہاں زیں دو سہ ترتیب گرفت   فائدہ گیری بود از ہند زمیں

(۸) ہندوستان کی فضیلت کا ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ

حجت ہشت آنکہ سرود خوش ما   کوست بسوز دل و جاں آتش ما
ہر ہمہ دانستہ کہ در جملہ جہاں   نیست بریں گونہ دلایست بہاں

اس سرود کو غیر ملکی، مدتوں سیکھتے رہیں تو بھی

زہرہ نہ بود کش کیکے صوت نیک   گرم بگیرد ز چہ از طبع خنک

(۹) ہندی نغمہ تر اپنی تاثیر میں اتنا بڑھا ہوا ہے انسان، حیوان سب اس کے شکار ہیں

حجت نہم آنکہ از نغمہ تر   تیر خورد آہوے صحرا دجگر
دو حشہ رمیدہ نہ تیر و کماں   جاں دہد از زخمہ آں ہم بر باں

خسرو نے سرود و نغمہ تر میں اپنی اختراع پسند طبیعت سے نئی نئی چیزیں ایجاد کیں آج تک راگ راگنیوں میں ان کی ایجادات پر فخر کیا جاتا ہے۔

(۱۰) خسرو جیسا شہنشاہ اقلیم سخن دعا دو نگار شاعر اسی سرزمین ہندوستان کی آغوش میں پروان چڑھا، جس کا ثانی دنیا کے پردے پر نہیں ہے۔

حجت دہ آنکہ چو خسرو سخن   سحر گرے نیست بہ چرخ کہن
گرچہ عطارد بنہ آید ز فلک   ریں دم مدہوش بود شبہ و شک

غرض جیسے سحر طراز شاعر اور ہمہ صفت انسان نے ہندوستان کی فضیلت اور ترجیح کے یہ دس اسباب بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا، وطن کی تعریف کرنے میں ان کا جی نہیں بھرا۔ ان کا قلم ادر وطن کی محبت میں ایسا سرشار ہے کہ وہ اسے جنت سے بھی بہتر ثابت کر دیتا ہے۔ خسرو کہتے ہیں کہ میرا ہندوستان سچ مچ دنیا میں جنت سے بھی بڑھ کر ہے۔ قدرت نے اپنی فیاضیوں سے اس کو اتنا زیادہ نوازا ہے کہ جس کو بھی اس پر رشک آتا ہے بلکہ ہندوستان میں سات ایسی خوبیاں ہیں جن سے وہ کرۂ ارض پر جنت کہے جانے کا حق رکھتا ہے۔

[1] در ہند است بہشتے بزمیں   مختش اینک برخ صورتیں
جنت ثابت چو ازیں نیست شکے   ہفت بگویم بدرستی نہ یکے

حجت اول یہ ہے کہ جب حضرت آدم کو جنت سے نکال دیا گیا تو اسی ملک کی آغوش میں انہیں بھیجا گیا۔ اور یہیں ان کو امن اور سکون نصیب ہوا ہے

اولش اینست کہ آدم بجناں   چوں ز عصی خستگی یافت چناں
آمدن از خلد بہ ہندش بد از آں   کاں گل جنت کہ روش باد خزاں
گر بخراساں و عرب یا بہ چیں   یک نفسے بہرہ گرفتی ز زمیں
گرمی و سردی خراساں و عرب   و آں بہ سے و چیں عذابیست عجب
ہند چو از خلد نشاں بود درو   زاں سبب اینجا قدم آسود درو
ورنہ بداں تازگی از جائے دگر   آمدی از رنج فتادی بہ ضرر

دوسری اور تیسری دلیل یہ ہے کہ جنت الفردوس کے جانور، مور اور سانپ کا مسکن بھی ہندوستان ہے۔ اگر ہندوستان جنت کی طرح تمام خصوصیات نہ رکھتا ہوتا تو نہ تو مور یہاں رہ سکتا تھا اور نہ سانپ۔

حجت دیگر کہ ز طاؤس گشتم   مرغ خرد را بہ زمیں بوس کشم
گر نہ بہشت است ہمیں ہند چرا   از پے طاؤس جناں گشت سرا
بود ہمیں جا چو ز فردوس اترے   جاے دگر نہ فتادش گزرے
حجت سیوم گر بہ شکیے   کامدن مار ز باغ فلکے
بدکہ سر راحت جاں زاد درو   مار بداں کار رفیقتاد درو
مار بسے ہست گر اینجا بزمیں   مار بہاں کی طلبد بندہ نہ ایں

چوتھی حجت یہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان سے باہر نکلے تو وہ فردوس کی تمام نعمتوں سے محروم ہو گئے۔ یعنی ہندوستان کے علاوہ کسی دوسرے مقام یا ملک کو یہ خصوصیت نہیں حاصل ہے کہ وہاں جنت کی کوئی خوبی پائی جائے اس لئے حضرت آدم کو محرومی کا سامنا کرنا پڑا۔

حجت چارم مگر اینست کہ چوں   رد قدم آدم ز حد ہند بروں
بعد دو سہ روز دراں نو سفرش   خواست نشد خورد شام درش
نعمت فردوس کہ بودش بشکم   از گشت کشت دراں جا ہمہ کم
آنچہ فرو ریخت از آں گشت تلی   راست چو برزفت بیالا اخبلی
بر دگماں کانست کہ خلد دگر   بد بود ایں جا رچناں مار اثر
گر نہ بہشت است ہمہ ہند چرا   در حدش آں مار بیفتاد روا

پانچویں حجت یہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین عیش و عشرت مسرت و انبساط کی سرزمین ہے۔ یہاں وہ تمام سامان نشاط و سکون موجود ہیں جن سے دل کو فرحت، دماغ کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوتا ہے عطریات اور خوشبویات کی یہاں ایسی اور اتنی فراوانی ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں پایا جاتا۔ مثلاً روم وغیرہ ہے اور دمشق وغیرہ بھی چمن اور باغات کے لئے مشہور ہیں لیکن وہاں صرف دو مہینے ہی پھول رہتے ہیں، جبکہ ہندوستان کی سرزمین خوشبودار پھولوں سے ہمیشہ گل و گلزار رہتی ہے۔

حجت پنجم ستو کیں کہ ہمہ کس   نزد ہمہ خلق رسیدہ است نفس
ہند ہمہ سال کہ گل روے بود   زیں بود و گل ہمہ خوشبوے بود
نے چو بروم کہ گل نیست دراں   جز دو سہ ماہ کہ در آید گزر آں
واں ہمہ زاں سال کہ گل لالہ ستاں   بوے ندارد ز یخ و زالہ نشاں

---

[1] مثنوی نہ سپہر صفحہ ۱۲۶ تا ۱۴۲

چھٹی حجت یہ ہے کہ ہندوستان میں انواع و اقسام کی نعمتیں پائی جاتی ہیں دنیا کا
کوئی خطہ اس کی مثال نہیں پیش کر سکتا۔ ان نعمتوں نے اس کو رشک جناں بنا دیا ہے۔

ہشت ششم حجت کایں ہست حصر   راحد مرسل آ۔ تحقیق سحر
نعمت دنیا کہ رحمت سزا   از پے گبراں است بہشتی بجزا
بس بہمہ حال رحول و سہی   ہند بہشت است باتیات رہی

ساتویں حجت یہ ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک تمام دنیا ایک قیدخانہ ہے لیکن
ہندوستان کو وہ بھی خلد بریں سمجھتے ہیں۔

حجت ہفتم شنو اس محکم و بہ   پیش تو آراستہ چوں رشتہ بد
کانچہ در ہند مسلمانست بحق   ما یتعلق از انرجانست رمق
گرچہ کہ بر نسبت فردوس نہاں   با ہمہ لطفیش چو زندان است جہاں
لیک یہ ہنداست سیلتش دگر   کانش در ولایتی دہد از حسب اثر
زاں سبب خاص را صحاب نقیس   ہند تواں گفت کہ خلد است بریں[2]

خسرو نے دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان دنیا کی جنت
ہے پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی اور ساتویں حجت مذہبی حیثیت رکھتی ہیں اور
پانچویں، چھٹی دنیوی جس میں ہندوستان کی پیداوار اور نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔

کسی ملک میں انواع و اقسام کی پیداوار نعمتیں، اس کی بہترین زمین، موسم،
اور آب و ہوا پر منحصر ہے۔ خسرو نے اس اعتبار سے بھی ہندوستان کا جائزہ لیا۔ وہ
لکھتے ہیں کہ میں نے بدلائل ہندوستان کو جنت ثابت کیا ہے۔ اب میں اس کی آب
ہوا کی خصوصیات بھی بتانا چاہتا ہوں کہ اس حیثیت سے بھی ہندوستان اپنا ثانی
نہیں رکھتا۔ خراسان اور دوسرے ممالک سے دس اسباب کی بدولت یہاں کی
آب و ہوا بہتر اور مفید ہے۔

ہند چو فردوس شد از حجت مس   ہر ہوا بش کنوں آیم بہ سخن
دہ شمرم حجت قاطع کہ درد   بہ ز خراسانست ہوا، در ہمہ سو

پہلی حجت یہ بتائی ہے کہ ہندوستان کی سردی نقصان نہیں پہنچاتی ہے۔

اولش آں شد کہ درو آدمیاں   از دمۂ سرد نہ بیند زیاں

دوسری حجت ہے کہ ہندوستان کی گرمی، خراسان کی سردی سے بہتر ہے خراسان
کی سردی جان لیوا ہوتی ہے سردی کی شدت سے لوگ اکڑ جاتے ہیں۔ اور اپنی جان سے
ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں

دوئم ست آں کاہل خراساں گر   ہو کہ بیاں سوخت ز سرما شدہ کر
خندہ دایں گفت و بیایں اوجناں   طعنہ گرماش زند شعلہ زناں
آنکہ بر گرما سپ مارحبت و بس   لیک سود کشتہ ز سرما ہمہ کس

تیسری حجت یہ ہے کہ ہندوستان کی سردی بے ضرر ہے وہ کسی کو نقصان نہیں
پہنچاتی۔ یہاں کی سردی اور سرد ہوا فرحت بخش ہے۔

سیومش آں کیں طرف از نیم ہوا   کم طلبد مفلس کم مایہ نوا
بر لب جوز آب خنک برہنہ‌ناں   غسل کند آخر شب عوطہ زناں
خود گرگرما نمود شاں غم حز   سایۂ شاخے بس و از کلبہ دوگز

چوتھی یا پانچویں اور چھٹی حجت میں ہندوستان کے سدا بہار پھولوں کی تعریف
کی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں سال بھر گل دل کی بہار رہتی ہے یہاں کے پھول، گل بابونہ
کی طرح خوش رنگ و دلکش ہوتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خشک ہو
جانے پر بھی، خوشبودار رہتے ہیں۔

چارم شاں کیں طرف از سبزہ گل   ہست ہمہ سال بہار گل دل

پنجم از یاں گل شاں رنگ بردی   رنگ خوش چوں گل بابونہ دردی

حجت ششم اینکہ مگر گر بود آراں   خشک شود، بوزند زد بحراں
ایں گل بالعکس اگر خشک شود   طلہ دروں تا در از مشک شود

ساتویں اور آٹھویں حجت میں ہندوستان کے تر و تازہ میوے اور پھل کا ذکر
ہے یہ بھی بتایا ہے کہ ہندوستان میں خراسان کے سب میوے پیدا ہوتے ہیں۔ جبکہ
خراسان میں ہندوستان کا ایک میوہ بھی نہیں ہوتا۔

ہفتمش آں کاں طرف از میوہ تر   ہست چو امرود چو انگور دگر
میوہ دگر کم نگری کر خلش   لاچی و کافور و ترنعل بدلش

ہشتمش آں شد کہ لیے میوۂ شاں   ہست بہ ہند دموی شاں زیں نشاں

ہندوستان میں دو نادر تحفے ہوتے ہیں ایک کیلا دوسرا پان، نویں اور دسویں
حجت میں خسرو نے کیلے اور پان کو ہندوستان کا بے مثل تحفہ بتایا ہے۔

ہست نہم آنکہ دریں کشور خوش   ہست دو تحفہ کہ بود نادرہ وش
میوۂ بے خستہ کہ نہ بود در جہاں   برگ کہ چوں میوہ خورد میہماں
موز ہماں میوۂ بے خستہ نگر   برگ ز تنبول نگر نائب خور
ہست دہم آنکہ چوں تنبول گزیں   میوہ نہ باشد بہمہ روئے زمیں[1]

خسرو نے پان کی تعریف اپنی ایک اور مثنوی قران السعدین میں بھی کی ہے۔ ان
کے نزدیک یہ ہندوستان کی بہترین نعمت ہے۔ کہنے کو تو گھاس ہے۔ لیکن انتہائی
مفید، اس کے کھانے والا جذام اور برص سے محفوظ رہتا ہے۔ اس سے خون صاف پیدا
ہوتا ہے۔ یہ منہ کی بدبو کو دور کرتا ہے اور دانتوں کو مضبوط بناتا ہے۔ اس کے کھانے
سے بھوک زیادہ ہو تو کم بھی ہو جاتی ہے۔ اس کے کھانے سے بھوک بڑھتی بھی ہے
اس کو چھوٹے بڑے امیر غریب، شاہ و گدا سب پسند کرتے ہیں۔

نادرہ برگے چو گل بوستاں   خوب تریں نعمت ہندوستاں
تیز چو گوش فرس تیز خیز   صورت و معنی بصفت ہر دو تیز

۱؎ مثنوی نہ سپہر صفحہ ۱۵۱ تا ۱۵۰، ۲؎ مثنوی نہ سپہر صفحہ ۱۵۸ تا ۱۶۱

تیزی او آلت قطع عدام — ول سی رفت علیہ السّلام [1]
طرفہ مناتے کہ شد درد مہن — کوس چو حیواں مدر آید زتن
فربہ دین آں بوتے دہن گم کند — بسی دنداں ہمہ محکم کند
سیر تو ر گرسنہ ردم شود — گرسنہ را اگر سنگی کم شود
حرمتش از پیشگہ دیائے گاہ — ہم نگرا محرم و ہم شاہ [2]

دول رانی خضر خاں میں بھی مول کے متعلق لکھتے ہیں۔

خراسانی کہ ہندی گردش گول — جسے باشد نہ نزدش برگ تنبول
شناسد آنکہ مرد ہندگانی است — کہ دو برگ جانی در جانی است [3]

مختلف مقامات کے پھول، پھل اور میوہ جات کا ذکر خسرو نے قریب قریب اپنی تمام مثنویوں میں کیا ہے۔ وہ اپنے وطن کی ایک ایک بات کو بڑے کیف نشاط کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور وطن کی حکایت انہیں اتنی لذیذ ہے کہ بار بار بیان کرنے پر بھی ان کا جی نہیں بھرتا۔

ہندوستان زبانوں کا جزیرہ رہا ہے، اس وسیع و عریض ملک کے ہر خطے کی زبان اور بولی الگ الگ ہے۔ خسرو نے ہندوستان کی عظمت کا ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ اس ملک میں جس کثرت سے مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ دنیا کے کسی خطے میں نہیں بولی جاتیں۔ انھوں نے یہاں کی زبانوں کی کثرت اور خوبیاں بتاتی ہیں۔ خاص طور پر ہندوی، پارسی، عربی، سندھی، لاہوری، کشمیری، کبر، دھور سمندری، تلنگی، گجر، معبری، گوری، بنگالی، اودھ اور سنسکرت کا تذکرہ کیا ہے۔ سنسکرت کو وہ برہمنوں میں سے بھی صرف چند کی زبان بتاتے ہیں لیکن اس کی وسعت اور برتری کے قائل ہیں اس کو عربی سے تو نہیں پارسی سے بہتر سمجھتے ہیں۔

آنست زملئے نہ صعب ور دری
از عربی کمتر و برتر ز دری

تمام زبانوں کا ذکر تاریخی اعتبار سے اس طرح کیا ہے۔

ہند ہمیں قاعدہ دارد سخن — ہندوی بود است در ایام کہن
غوری و ترک آمد و تا امرا — پارسی بود بہ ہندار دہان
الوطن ار پارسی و ترک دلت — سہدہ باشد کہ کم دل ر طرب
من چو ز ہندم بود آب کہ کسے — از محل خویش بر آرد نفسے
سندی و لاہوری و کشمیری و کبر — دھور سمندری، تلنگی و گجر
معبری و گوری و بنگال و اود — دہلی و پیرامنش اندر ہمہ حد
این ہمہ ہندیست کہ ز ایام کہن — عامہ بکار است بہر گونہ سخن
ہست زبانیست دگر کز سخنان — آن گزین بر ہمہ برہمنان
سنسکرت نام ز عہد کہنش — عامہ ندارد خبر از کن مکنش

برہمنش داند و ہر برہمنے — نیز نداند حد ر آں ہمے [4]

مثنوی دول رانی خضر خاں میں اردو زبان ہند کو والہانہ انداز میں بیان کیا ہے

غلط کردم گر از دانش زنی دم — نہ لفظ ہندیست از پارسی کم
بجز تازی کہ میر ہر زبانست — کہ بر گلہ زباں ہا کامرانست
زبان ہند ہم تازی مثالی است — کہ آمیزش درآنجا کم مجال است

دگر بر سبیل دانش از معانی — درآں سرار دگر ہا کم مدانی
اگر از صدق و انصاف دہم شرح — حد ہندی کمی گفتار من شرح
کسے کز گنگ ہندوستاں بود دور — رہیل و رحلہ لاقدر ہست معذور
چو در چین دید ملک بوستاں را — چہ داند طوطی ہندوستاں را [5]

جس ملک میں بکثرت زبانیں بولی جاتی ہوں، وہاں کے باشندوں کو یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف و متضاد زبانوں کو آسانی کے ساتھ بول سکیں، ہندوستانیوں میں بھی یہ خصوصیت اور وصف پائی جاتی ہے کہ وہ ہر زبان (ملکی یا غیر ملکی) آسانی سے سیکھ لیتے ہیں۔ اس کو صحیح صحیح بول سکتے ہیں۔ ان کا تلفظ اور لہجہ درست ہوتا ہے۔

امیر خسرو نے اس صفت میں بھی ہندوستان اور ہندوستانیوں کو تمام دنیا سے بہتر اور افضل بتایا ہے۔ وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ یہاں کے جانوروں کو بھی دوسرے ملکوں کے جانوروں سے چند خصوصیات کی بنا پر برتر بتاتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے طوطا، مینا، سارس، کوا، گوریا، مور، بگلا، مرغ، سقا (پانی بھرنے والا پرندہ)، گھوڑا، بکری، بندر اور ہاتھی، وغیرہ کی خوبیاں اور خصوصیات لکھی ہیں انھوں نے ایک ایسے جانور کا بھی ذکر کیا ہے جو ہرن کی شکل کا ہوتا ہے اور گدھے کی طرح بولتا ہے۔

طوطے کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

میں محض بر صف آدمیاں — ہر چہ بشنیدہ است گوید بیاں
فاتحہ و اخلاص و دعا در دہنش — ناس و لو ہم من و تو سخنش

اسی طرح انھوں نے ہر جانور کی خصوصیت لکھی ہے۔

خسرو کا مسلک صلح کل رہا ہے، وہ انسانیت اور انسانی عظمت کے قائل ہیں وہ خدا کے ہر بندہ سے محبت کرتے ہیں۔ ان کا دل نفرت و تعصب سے پاک ہے محبت اور خلوص سے لبریز ہے۔ ان کے یہاں من و تو کا جھگڑا نہیں ہے۔ وہ اپنے وطن ہندوستان کو اس لحاظ سے بھی عظیم اور برتر بتاتے ہیں کہ یہاں کے مردوں، عورتوں اور جوانوں میں اوصاف حمیدہ پائے جاتے ہیں۔ وہ بڑے وفادار، خلیق، شجاع، خوبصورت اور مہمان نواز ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اہل ہنود کا شویہ، پارسی، عیسائی، مجوسی، ستارہ پرست جیسے فرقوں سے موازنہ کیا ہے اور ان سب سے ان کو بہتر ثابت کیا ہے۔

معترف وحدت و ہستی و قدم — قدرت ایجاد ہمہ بعد عدم

---

[1] حدیث بجوری میں ہے کہ ہندوستان میں یک درخت ہے جس کے پتے گھوڑے کے کان کی طرح ہوتے ہیں اور اس کے کھانے والے جذام و برص سے محفوظ رہتے ہیں۔ [2] قران السعدین صفحہ ۱۸۵-۱۸۶۔ [3] دول رانی خضر خاں صفحہ ۴۴ [4] نہ سپہر صفحہ ۱۷۸ تا ۱۸۱ [5] دول رانی خضر خاں صفحہ ۴۱-۴۲۔

رزق ہر چہ جز بہ ہنر سے — عمر بہ جہاں وہر جا ور سے
حاصل ہمہ ز دیاری بہ عمل — عالم ہر کل دحر دری دار ل

دوسروں فرقوں پر ترجیح کے اسباب۔

ارسطو بہ مدہ ئی رفتہ سخن — گفتہ کہ ہندو و شکر شہ بجن
مسویاں رو ح در اندیشہ برد — ہندوار یں حس بہ پوست برد
قوم تحستم رزم حسم زدہ — برہمناں لے دم ارں قسم زدہ
احترباں معنت خدا اگر دو یقیں — ہندوی توحید سرا منکر از یں
منصفاں بار خدا بردہ گماں — گفتہ کہ ہندو تا ست بہاں
قوم متے سوے تشہ سدہ — ہندو از بہا سں تمریہ سدہ
وا بچہ کہ معبود برہمں ، العرق — معترف است او کہ بہ مثلش رق

خسرو کی وسیع المشربی، انسان دوستی اور ہندستان سے بے پناہ محبت کا سرچشمہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کا جذبہ حب وطن ہے۔ ان کے اس جذبہ کو تقویت اسلام نے عطا کی۔ بزرگوں کی صحبت اور حضرت نظام الدین اولیاء کی تعلیم و تربیت نے جلا بخشی، تصوف اور روحانیت نے پختگی عطا کی۔ وہ اپنے وطن ہندوستان کے ایسے گرویدہ اور عاشق تھے کہ اس کی ایک ایک چیز میں انہیں محاسن ہی محاسن نظر آتے تھے وہ ہندوستانیوں کو علم و عمل کا پیکر، کردار گفتار کا دھنی، شرافت و انسانیت کا مجسمہ بتلاتے

ہیں، وہ ہندوستان کی ترقی و تعمیر کے دل سے خواہاں ہیں، وہ اس کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے کوشاں ہیں۔

"ولیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید"

"جس طرح صحیح ہے، اسی طرح "ہندوستاں را بچشم خسرو باید دید" بھی صحیح ہے ان کی ہر تصنیف میں کسی نہ کسی پہلو سے ہندوستان کی مدح و ستائش موجود ہے۔[1] یہی لے خسرو کو عظیم اور سچا محب وطن اسی لئے کہا ہے کہ آج تک کسی ایک شخص بلکہ ایک جماعت نے ہندوستان کی اتنی زیادہ خصوصیات نہیں بیان کی ہیں اور اس کی ایک ایک چیز سے یہیں ثابت کیا ہے کہ وہ تمام دنیا سے افضل و بہتر ہے۔ کہنے کو تو دنیا کی حب بہتوں نے کہا لیکن سب سے پہلے یا صرف خسرو نے ہی کیا۔ اور یہ فرض وہی انجام دے سکتا ہے جس کا دل حب وطن سے سرشار ہو، جس کا مطالعہ و مشاہدہ گہرا ہو۔ جو روحانیت و انسانیت دونوں کا علمبردار رہا ہو، اور جس کو خدا نے ہمہ صفت موصوف انسان بنایا ہو، ایسی جامع الصفات ہستی صدیوں بعد پیدا ہوتی

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جس ہند کے اس دیدہ ور کے لعاب اور اس کی تعلیمات آج بھی دلوں میں "حب وطن" کے جذبات بیدار کر رہے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔

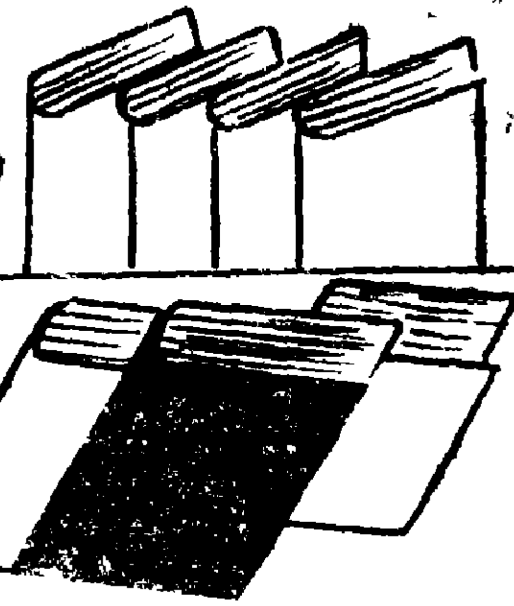
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

[1] مثنوی نہ سپہر صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۶ [2] خسرو کی ان تصانیف میں ہندوستان اور اس کے متعلق باتوں کا ذکر ہے۔ مثنوی قران السعدین، مفتاح الفتوح، شیریں خسرو، ہشت بہشت، نہ سپہر، دول رانی خضر خاں، نہایت الکمال اور غرۃ الکمال۔

امیر خسرو دھلوی کی ساتویں سوسالہ تقاریب کی قومی کمیٹی

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر

تالیفاتِ خسرو کا ایک جائزہ



یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ فارسی شاعری کا انداز چودھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی سرزمین میں وہی رہا جو اس وقت ایران میں تھا۔ شیخ سعدی شیرازی کی ادبی شخصیت ایران پر جس طرح حاوی رہی اسی طرح امیر خسرو دہلوی کا سکہ ہندوستان میں جاری رہا۔ خسرو کا زمانہ شباب سعدی کے عالمِ شیب سے ملا ہوا تھا۔ دونوں شخصیتیں فطرت کے شعر پرور رجحانات کا شاہکار ہیں۔ جو ہمیشہ پیدا نہیں ہوتیں بلکہ مدتوں کے بعد ایک تہذیب ایک تمدن اور ایک ثقافت کی یادگار بن کر سامنے آتی ہیں۔ دونوں کی شاعری میں آشوب وقت کا ردعمل تھا دونوں کے کلام میں تصوف کی چاشنی تھی۔ اور دونوں کے شعر جذبات کی تصویر کشی کا مرقع تھے اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی آب وہوا نے خسرو کے کلام کو بے ساختگی اور بانکپن بخشا اور واقعیت اور مترنم انداز کا مجموعہ بنا دیا۔

اس ضمن میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سعدی کو شہزادہ محمد ملتان نے دعوت دی لیکن سعدی نے بڑھاپے کا عذر پیش کیا اور ہندوستان تشریف نہیں لائے۔ تاہم انھوں نے اس خط میں اپنا خراج عقیدت اس طرح پیش کیا: "در ہند خسرو بس است"

اسی طرح حافظ شیرازی خسرو کی شیریں کلامی کا ذکر یوں کرتے ہیں ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اور مولانا جامی اپنی تصنیف بہارستان میں خسرو کی مثنویوں کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے بھی نہیں لکھا۔"

تین سو سال کے بعد بھی عرفی شیرازی جیسے اکبری دربار کے قادر الکلام شاعر بھی خسرو کی شاعرانہ صلاحیت کا اظہار کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں ؎

بروحِ خسرو از ایں پارسی شکر دارم
کہ کامِ طوطیِ ہندوستاں شود شیریں

امیر الشعراء ابوالحسن یمین الدین خسرو معروف۔ امیر خسرو ۶۵۱ھ مطابق ۱۲۵۳ء میں پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ کہتے ہیں کہ جب خسرو پیدا ہوئے تو ان کے والد ماجد امیر سیف اللہ محمود بچہ کو خرقہ میں لپیٹ کر ایک صوفی مست بزرگ کے پاس لے گئے جنھوں نے بچہ کو دیکھتے ہی فرمایا: "قیامت تک اس کا نام زندہ رہے گا اور خاقانی (شروانی) سے دو قدم آگے بڑھ جائے گا۔"

خسرو زمانہ طفولیت سے ہی شعر موزوں کر لیتے تھے۔ اور بعد ازاں خسرو جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد بزرگوار نے انھیں مکتب میں بٹھایا اور خوش نویسی کی مشق کے لئے خطاط زمانہ قاضی اسد الدین کے سپرد کیا۔ خسرو کی طبیعت کی روانی اور ان کی شاعری کا ملکہ دیکھ کر انھیں ان کے استاد خواجہ عز الدین کے پاس لے گئے۔ اور کہا کہ یہ میرا شاگرد ہے لیکن خطاطی سے زیادہ شاعری کا ذوق رکھتا ہے۔ خواجہ صاحب نے پہلے خسرو سے پڑھنے کے لئے کہا خسرو نے چند شعر خوش الحانی سے پڑھے۔ خواجہ صاحب بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ مو، بیضہ، تیر اور خربزہ ان چار بے جوڑ چیزوں کو موزوں کرو۔ خسرو نے برجستہ عرض کیا ؎

ہر موئے کہ در دو زلفِ آں صنم است — صد بیضۂ عنبریں بر آں موئے ضم است
چوں تیر مداں راست دلش را زیرا — چوں خربزہ دندانش میاں شکم است

خسرو کی یہ رباعی سن کر خواجہ صاحب بہت متحیر ہوئے۔ تعریف کی اور گلے سے لگا لیا تمہارا تخلص سلطانی ہونا چاہیئے یہ تخلص تمہارے لئے فال نیک ہوگا۔" اور یہی وجہ ہے کہ ابتدائی کلام میں خسرو اسی تخلص کے نام سے نظر آتے ہیں۔

خسرو نے کبھی بھی استادوں کی استادی سے انکار نہیں کیا بلکہ وہ تمام اساتذۂ فن کا احترام کرتے تھے۔ البتہ اپنے کلام کے بارے میں صرف کہتے ہیں کہ میں سرقہ نہیں کرتا اور نہ ہی میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر ہے تاہم ان کی غزلیں سوز وگداز اور والہانہ محبت کا پیکر ہیں۔ اور ان کی مثنویاں مطرب نگاری اور منظر کشی کا مظہر ہیں ان کے قصیدے معنی آفرینی اور باریک خیالی کا مرقع ہیں اور ان کے مرثیے درد والم اور رنج واندوہ کا مخزن ہیں۔ خسرو اس بات کا اعتراف کرنے سے دریغ نہیں کرتے کہ غزل میں سعدی، مثنوی میں نظامی، قصیدے میں خاقانی اور اخلاقیات میں سنائی جیسے شعرائے قدیم کے مقلد و پیرو ہیں۔

خسرو نے اپنی بہتر سالہ زندگی میں ہندوستان کے سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ہے۔ اور انھیں اپنے معاصرین میں ایک خاص حیثیت اور مرتبہ حاصل تھا۔ ایک طرف خسرو دربارِ شاہی

سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسری جانب حضرت نظام الدین اولیاء کے معتقد تھے۔ امارت اور ولایت کے غیر معمولی امتیازات کے باوجود خسرو کے کلام کی مسلمہ خوبیوں نے ان کے کلام کے بیشتر قابل قدر حصے کو زمانے کے دستبرد سے بچا لیا۔ خسرو نے اپنے کلام کے بیشتر حصے کو اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا اور اپنی تالیفات کے دیباچوں میں اشعار کی تعداد، سن تصنیف اور موضوع تدوین و ترتیب جیسی بہت سی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ نظم میں پانچ دیوان، مثنویاں اور غزلیات کے متفرق مجموعے موجود ہیں۔ نثر میں اعجاز خسروی، خزائن الفتوح اور افضل الفوائد قابل قدر تصانیف ہیں۔

تحفۃ الصغر خسرو کا پہلا دیوان ہے جو انھوں نے ۶۷۱ھ میں مرتب کیا۔ اس میں تقریباً ان کی جوانی کا کلام شامل ہے۔ جو انھوں نے سولہ[۱۶] سال سے انیس[۱۹] سال کی عمر تک لکھا ہے۔ ابتدا میں خسرو نے خاقانی، انوری اور سنائی جیسے مسلم الثبوت اساتذۂ فارسی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی، گو انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ دیباچہ میں خسرو نے اپنی زندگی کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ ہر ایک قصیدہ کے شروع میں ایک شعر ہوتا ہے جو قصیدہ کے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ ان تمام شعروں کو یکجا کرنے سے ایک قصیدہ ہو جاتا ہے۔ یہ خسرو کی ایجاد ہے۔ قصائد زیادہ تر سلطان غیاث الدین بلبن اور اس کے بیٹے شہزادہ نصرت الدین محمد کی مدح میں ہیں۔ ایک ترکیب بند میں خسرو نے اپنے نانا عماد الملک کا مرثیہ لکھا ہے جو سلطان غیاث الدین بلبن کے مقربین میں تھے۔ اس دیوان میں خسرو اپنا تخلص سلطانی کرتے ہیں۔

وسط الحیات کو خسرو نے ۶۸۴ھ میں ترتیب دیا۔ اس میں ان کے چوبیس[۲۴] اور تینتیس[۳۳] سال کی عمر کا کلام ملتا ہے۔ اس میں خسرو نے اپنی زندگی کے بعض اہم واقعات پر روشنی ڈالی ہے اور دیگر تین دیوان مرتب کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ زیادہ تر قصیدے سلطان نصرت الدین محمد کی مدح میں ہیں۔ اور ایک ان کا مرثیہ ہے۔ تاریخی اعتبار اور ادبی لحاظ سے اس دیوان کے قصیدے زیادہ دلچسپ ہیں۔ ان قصیدوں میں انھوں نے کبھی خاقانی شیروانی کی پیروی کی ہے تو کبھی کمال اصفہانی کے انداز کلام کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔

غرۃ الکمال خسرو کا تیسرا دیوان ہے جو انھوں نے ۶۹۳ھ میں تمام کیا۔ اس میں چونتیس[۳۴] سے تینتالیس[۴۳] سال کی عمر تک کا کلام شامل ہے۔ اس کے مقدمہ میں خسرو نے ہندوستان کی فارسی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ اور عربی شاعری پر اس کی فوقیت کو واضح کیا ہے۔ یہ سب سے بڑا دیوان ہے۔ اس میں قدیم شعرائے ایران کی پیروی کی ہے۔ خسرو کے مشہور قصیدے، جنات البحار، مرآۃ الصفا اور دریائے ابرار اسی دیوان میں پائے جاتے ہیں۔ قصیدوں کے علاوہ اس میں ترجیع بند اور قطعے بھی ہیں۔

بقیہ نقیہ خسرو کا چوتھا دیوان ہے۔ اس کو ۷۱۶ھ میں ترتیب دیا ہے۔ اس میں زیادہ تر بڑھاپے کا کلام ہے۔ اور قصیدے بھی قدیم اساتذۂ ایران کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ ایک مرثیہ سلطان علاء الدین خلجی کا بھی ہے۔

نہایۃ الکمال کو خسرو نے سلطان غیاث الدین تغلق کے انتقال اور سلطان محمد تغلق کی تخت نشینی اور ان کے انتقال سے کچھ پہلے تالیف کیا ہے۔ یہ دیوان نادر ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی کا مرثیہ اور اس کے ولی عہد کی مدح ہے۔ چند قصائد میں تصوف اور حقائق و معارف کے مسائل بیان کئے ہیں۔ یہ پانچواں دیوان خسرو کے آخری دنوں کا ہے۔

نہ سپہر کو خسرو نے ۷۱۸ھ میں مکمل کیا۔ یہ مثنوی نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ معاشرتی اعتبار سے بھی ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں نو باب ہیں۔ اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے۔ اور اسی مناسبت سے اس کا نام نہ سپہر رکھا گیا۔ مختلف بحروں کا ایک ہی مثنوی میں استعمال کرنے کا طریقہ خسرو کی جدت ہے۔ ایک باب ہندوستان سے متعلق ہے جس میں انھوں نے ہندوستان کی عظمت و اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں علم و فن نے تمام ملکوں سے زیادہ وسعت حاصل کر لی ہے۔ ہندوستان میں دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ تحصیل علم کے لئے آتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ دنیا کی ہر زبان پر عبور حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان نے اور ملکوں کے مقابلے میں فن موسیقی میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے۔ ہندوستان کی ایجادوں میں "شطرنج" اور "صفر" بھی ہیں۔ ہندوستان میں دین حسی قابل قدر تالیف ملتی ہے۔ جو مذہب، سیاست، سنگیت اور معاشرت کا مرقع ہے۔ ہندوستان کی تخلیقات میں پنچ تنترہ بھی ہے جس کا ترجمہ عربی، فارسی، ترکی کے علاوہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہوا ہے۔ اور ہندوستان ہی میں خسرو جیسے سحر البیان اور جادو قلم پیدا ہوئے ہیں۔ سلطان قطب الدین مبارک نے اس مثنوی کی تکمیل پر ہاتھی برابر تول کر روپے دیئے۔ خسرو لکھتے ہیں ؎

چو میراث ثنہ پیل زر دادم — نہ زیباست ربی پیل زر دانم
شہا گنج بخشا کرم گسترا — معانی شناسا سخن پرورا
چنیں بخشش کر توجم یافتم — در ایام پیشینہ کم یافتم

سلطان غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات کا تفصیلی ذکر ایک تاریخی مثنوی تغلق نامہ میں کیا ہے۔ یہ تاریخی مثنویوں کے سلسلے کی آخری کڑی ہے جس کو خسرو نے اپنے انتقال سے کچھ پہلے مرتب کیا۔ یہ مثنوی تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہے۔ اس میں بعض ایسی باتیں ملتی ہیں جو کسی بھی تاریخ میں درج نہیں ہیں۔ دراصل تغلق نامہ عہد تغلق کی مفصل تاریخ ہے۔

نے بحز نظامی گنجوی کے خمسۂ نظامی کا جواب انھوں نے خمسۂ خسرو کے نام سے ۶۹۸ھ اور ۷۰۱ھ کے درمیانی عرصہ میں تکمیل کیا۔ بقول خسرو ان مثنویوں کی تالیف کا زمانہ کل سوا دو برس ہے۔ جو خسرو کی قادر الکلامی اور پُرگوئی کا حیرت انگیز معجزہ ہے۔ مولانا جامی بجا فرماتے ہیں کہ "خمسۂ نظامی را ازوی کسی در جواب نگفتہ"۔

خمسۂ خسروی کے سلسلہ کی پہلی مثنوی "مطلع الانوار" ہے جو نظامی کے "مخزن الاسرار" کا جواب ہے۔ اس مثنوی کو خسرو نے ۶۹۸ھ میں ترتیب دیا اور یہ مذہبی اور اصلاحی نکات پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی کو صرف دو ہفتے میں لکھا ہے۔ دوسری مثنوی شیریں و خسرو ہے جو نظامی کی خسرو شیریں کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ اس کا سن تالیف ۶۹۸ھ ہے۔ اس میں خسرو نے ہر قسم کی شاعری کے مواقع پیدا کئے اور کمال دکھلایا ہے۔ تاہم نظامی گنجوی کے سامنے خاکساری سے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے ؎

ہی داد چو نظم تا مراجی
ناتی نگذاشت بہر ما ہیچ

• "مجنوں ولیلیٰ" کو خسرو نے ۶۹۹ھ میں نظامی کی لیلیٰ مجنوں کے نمونہ پر تالیف کیا۔ اس مثنوی کا سب سے پُر اثر حصہ وہ شعر ہیں جس میں خسرو نے اپنے بھائی اور ماں کی وفات کا ماتم کیا ہے

امسال دو نور ز اختر م رفت

ہم مادرم و ہم برادرم رفت

چوتھی مثنوی "آئینہ سکندری" کو خسرو نے نظامی کے "سکندر نامہ" کے جواب میں لکھا ہے اس مثنوی کو بھی ۶۹۹ھ میں مکمل کر لیا ہے۔ اس میں خسرو نظامی کے دوش بدوش ہیں اس سلسلہ کی آخری مثنوی "ہشت بہشت" ہے۔ جو نظامی کے "ہفت پیکر" کے طرز پر لکھی گئی ہے اس کا سن تالیف ۷۰۱ھ ہے اور اس میں بہرام کی حکایت کو بیان کیا گیا ہے اس مثنوی میں خسرو کی شاعری پختگی اور پرکاری کی آخری حد تک پہنچ گئی ہے۔ اس کے خاتمے میں ایک بات کی صراحت کی ہے کہ خمسہ تین سال کی مدت میں لکھا گیا ہے اور اس زمانے کے ایک عالم و فاضل قاضی شہاب الدین نے ان پانچوں مثنویوں کا مطالعہ کر کے تصحیح کی ہے

؎ یارب از چوں زیچ نامۂ من   در بیروں خطائی خامۂ من

نامۂ او کہ حرز جانش باد   رقیامت خط اِلتش باد

ان شعروں سے ظاہر ہے کہ شہاب نے پانچوں مثنویوں کو اصلاح دی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خسرو بڑے متلون تھے۔ جہاں ان کو اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی وہاں استاد کی رائے کو تسلیم نہیں کرتے تھے اگر ادب کا پاس اب بھی ملحوظ رکھتے تھے۔

؏ عیب آں بر من است۔ بروی

خسرو کی طبیعت کی جولانی اور فکر رسا نے جہاں اقسام شاعری میں وہ جوہر دکھائے ہیں جن کا مقابلہ آج تک کوئی نہ کر سکا، وہاں نثر نگاری میں بھی ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ اعجاز خسروی وہ نثری کارنامہ ہے جس میں خسرو نے زبان و بیان کے اصول منضبط کر دیئے ہیں اور سیکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں۔ یہ تین جلدوں میں ہے اور اس کو انھوں نے ۷۱۹ھ میں تالیف کیا۔ خزائن الفتوح جو تاریخ علائی کے نام سے بھی موسوم ہے خسرو نے ۷۱۱ھ میں مکمل کی اس میں سلطان علاء الدین کی فتوحات اور اس زمانے کے پس منظر اور حالات کو نفیس پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے بڑی اہم تصنیف ہے۔ سلطان علاء الدین نے اس تاریخی تالیف پر خسرو کے لئے ایک ہزار تنکہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ ایک اور نثری کارنامہ افضل الفوائد کے نام سے مشہور ہے جس میں خسرو نے اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات شامل کئے ہیں۔ اس کے ایک حصہ کو خسرو نے ۷۱۹ھ میں اپنے مرشد کی خدمت میں پیش کیا جو انھوں نے پسند کیا۔

خسرو نے جس قدر فارسی میں لکھا ہے اسی قدر بھاشا (ہندی) میں بھی ہے۔ غرۃ الکمال کے دیباچہ میں خسرو لکھتے ہیں "جزوی از نظم ہندی نیز نذر دوستان کردہ ام" خسرو ترکی بھی جانتے تھے اور عربی میں ادبائے عرب کے ہم پلہ ہیں لیکن انھوں نے کبھی بھی دعویٰ نہیں کیا۔ سنسکرت میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ نہ سپہر میں اپنی سنسکرت دانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ؏ من قدر رسیدم ار آن کار رسیدم؛ بہر کیف سیر الاولیاء کے مؤلف امیر خورد کے مطابق خسرو نے ننانوے کتابیں تالیف کی ہیں نفحات الانس کے مصنف مولانا جامی کی رائے میں خسرو ۹۲ کتابوں کے مؤلف ہیں۔

خسرو کی تالیفات کا مطالعہ ہندوستان کی تیرھویں صدی عیسوی کی وہ تصویر پیش کرتا ہے جس میں ملک کی ملی جلی تہذیب و تمدن کے نقوش نظر آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں خسرو کی تصانیف نہ صرف اپنے عہد کی ترجمانی کرتی ہیں بلکہ اس کے زمانے کے ہندوستان کے مزاج و ذہنیت کی عکاسی بھی کرتی ہیں۔ خسرو کی ذات ہندوستان کے لئے قران السعدین تھی جس میں دو تہذیبوں، دو معاشرتوں اور دو تقاضوں کا سنگم نظر آتا ہے مختصراً خسرو اپنے عہد کے اساتذہ ایران کے معاصر ہونے کے باوجود ہند و ایران کے مابین ثقافتی سفیر کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کی تالیفات ایک طرف قوم و ملک کو اپنے شاندار ماضی کی یاد دلانے کا ذریعہ ہیں تو دوسری جانب ان کی تخلیقات ہند و ایران کے تعلقات کو مستحکم کرنے کا ایک ثبات ہے۔

گوری سووے سیج پے، مکھ پے ڈارے کیس

چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چو دیس

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت امیر خسرو کو ترک اللہ کا لقب دیا تھا۔ فرماتے ہیں۔

"روز حشر امید دارم کہ ہر کہ را سوز سینۂ این ترک بہ بخشند"

اور ان اشعار کو بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔

خسرو کہ بہ شاعری نظیرش کم خاست

در ملک سخن وری حقیقی خسرو است

این خسرو ماست، ناصر خسرو نیست

زیرا کہ خدائے ناصر خسرو ماست

امیر حسن عابدی

امیر خسرو بحیثیت فارسی غزل گو

حضرت امیر خسرو دہلوی[1] جیسی جامع اور رنگارنگ شخصیت فارسی ادب میں شاید ہی کوئی دوسری نظر آتی ہو۔ آپ ایک زبردست شاعر، ایک بلند مرتبہ نثر نگار، ایک عظیم الشان صوفی، ایک قابل قدر درباری، ایک اچھے دوست، ایک وسیع المشرب اور رند انسان، ایک بڑے موسیقی دان، ایک وطن پرست ہندوستانی، ایک بڑے معرکۂ سبک ہندی کے بنیاد گزار، ہندی کے شاعر، ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے نمایندہ اور علمبردار، صاحب رزم و بزم اور مالک سیف و قلم رہے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہوں گے۔"[2]

اس تنوع اور ہمہ گیری کے باوجود آپ کا خاص میدان فارسی شاعری ہے اور آپ ہندوستان کے سب سے بڑے فارسی کے شاعر مانے گئے ہیں، نیز آپ کے اشعار کی تعداد لاکھوں تک بتائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کہتے ہیں "امیر خسرو فارسی کے پرکارترین شعرا میں سے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس لحاظ سے بے نظیر ہیں۔ خود امیر خسرو کے قول کے مطابق ان کے اشعار چار لاکھ سے زیادہ اور پانچ لاکھ سے کم ہیں۔ شاہرخ کے بیٹے مرزا بایسنغر نے ان میں سے ایک لاکھ بائیس ہزار اشعار کو جمع کیا تھا۔ بے کسی تردید کے خسرو دہلوی ہندوستان کے سب سے بڑے فارسی کے شاعر اور فارسی کے شہرہ آفاق اور زبردست شعرا میں سے ہیں۔ امیر خسرو اپنی طبع رواں، خدا داد ذوق اور ذہن کی تیزی کی مدد سے، نیز اس وجہ سے کہ انھوں نے فارسی ادب کے بہترین ماحول میں تربیت پائی تھی اور ایک نیا لہجہ، تازہ ترکیبیں اور خاص قسم کے افکار ان کے حصے میں آتے تھے، ان کے اشعار میں بہت سی تازگیاں پائی جاتی ہیں اور بہت سے نئے مضامین اور منتخب اشعار ان کے آثار میں دکھائی دیتے ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بعد کے آنے والے شعرا اور لکھنے والوں نے ان کو ستائش کے ساتھ یاد کیا ہے مثلاً جامی ان کو داستان سرائی میں نظامی کے بعد رکھتے ہیں۔ نیز نظامی کے کلام کو "گوہر" اور خسرو کے کلام کو "زر دہی" سے تشبیہ دی ہے"[3] شبلی کہتے ہیں "فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے جم ہیں لیکن ان کی حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتے۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ سعدی قصیدے کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا۔ حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، سب کچھ داخل ہے، اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی مستزاد، اور صنائع بدائع کا تو شمار نہیں۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعوی نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے۔ صائب نے ایک لاکھ سے زیادہ شعر کہے ہیں۔ لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں۔"[4]

امیر خسرو نے مثنویوں میں نظامی کی پیروی کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اگر چہ اس درجہ تک نہ پہنچ سکے، مگر اس صنف سخن میں نظامی کے بعد اگر کسی کا درجہ ہے تو آپ کا ہے۔ اس کے علاوہ کثرت سے قصیدے، قطعے اور رباعیاں کہی ہیں۔ شبلی لکھتے ہیں "مثنوی میں نظامی کے بعد آج تک ان کا جواب نہیں، غزل میں سعدی کے دوش بدوش ہیں، قصائد میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی، لیکن کلام موجود ہے قصائد لے کر دیکھو، کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں۔"[5] اس میں شک نہیں کہ علامہ شبلی نے امیر خسرو کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا ہے، مگر اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ ان جلیل القدر شعرا کے بعد ان صنفوں میں ان کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

---

[1] ۶۵۱ - ۷۲۵ ہجری / ۱۲۵۳ - ۱۳۲۵ عیسوی [2] شعر العجم، جلد دوم، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۴۵ء، ص ۱۱۸

[3] تاریخ ادبیات در ایران، جلد سوم، بخش دوم، دانشگاہ تہران، ۱۳۵۳ ہجری شمسی، ص ۷۷۸ - ۷۷۹

[4] شعر العجم، جلد دوم، ص ۱۱۸ - ۱۱۹ [5] شعر العجم، جلد دوم، ص ۱۱۸ - ۱۱۹

امیر خسرو کے اشعار اور کلام کا مطالعہ صرف شعری خوبیوں کے لئے نہیں بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ان سے ہمیں ہندوستان کی اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے مطالعہ میں مدد ملتی ہے، اور اس عہد کی ایک اچھی خاصی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ مرحوم ڈاکٹر تارا چند صاحب نے ان کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

"امیر خسرو کی تصنیفوں کا مطالعہ ہندوستان کی تیرہویں اور چودھویں صدی کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس میں ملک کی طرز حکومت و تہذیب کے نقش صاف نظر آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی مسلمان عالم، شاعر اور ادیب اس زمانہ میں کیسے خیالات رکھتا تھا۔ اسے ہندوستان کے ساتھ کیسی والہانہ محبت تھی اور وہ کس طرح اپنے وطن کو تمام دنیا کے ملکوں سے جن میں اسلامی ملک شامل تھے، ترجیح دیتا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر ہندوستان کا کتنا گہرا اثر تھا اور ہندوستانی معاشرہ کس قدر اس کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ اصل یہ ہے کہ خسرو کی ذات قران السعدین تھی جس میں دونوں تمدنوں کا سنگم نظر آتا ہے۔ خسرو صوفی منش درویش انسان تھے، ان کی نگاہ بلند تھی اور ان کے دل میں وسعت تھی۔ شاعری بھی ان صفتوں کی حامل ہے۔ ان کے کلام میں تیرہویں چودھویں صدی کے ہندوستان کی ذہنیت کا بڑا ستھرا عکس دکھائی دیتا ہے، سیاست کی رنگین تصویریں ہیں، اخلاقی قدروں کا کامل نقشہ ہے، زندگی کی رنگا رنگ جھلکیاں ہیں، راہ عشق کے پیچ و خم محبت کے مستانوں کے راز و نیاز کے تذکرے ہیں، آرزوؤں کی سنہری دنیا کی سیر ہے اور ناکامیوں کا الم، پند و نصیحت، حکمت و تدبیر، تصوف و معرفت کیا کچھ ہے جو خسرو کے سخن کے قلمرو سے باہر ہے۔ خسرو کا کلام ہندوستان کی محبت سے لبریز ہے۔ چھ سو سال گذرنے پر بھی خسرو کا کلام ہمارے لئے وہ مشعل ہدایت ہے جو منزل مقصود کی طرف ہماری راہبری کرتا ہے۔"[1]

فارسی شاعری کی سب سے بڑی صنف غزل ہے جو عشق و عاشقی کے مضامین کے لئے مخصوص ہے بشبلی کہتے ہیں "عشق و محبت انسان کا خمیر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کوئی قوم شاعری سے خالی نہیں اس لئے کوئی قوم عشقیہ شاعری سے بھی خالی نہیں ہو سکتی لیکن ایران اس خصوصیت میں اور تمام ملکوں سے بڑھا ہوا ہے"[2]۔ یوں تو حضرت امیر خسرو نے تمام اصناف سخن میں قدرت کلام کا اظہار کیا ہے، مگر ان کا خاص میدان غزل ہے جو فارسی اور اردو شاعری کی جان ہے۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق لکھتے ہیں "امیر خسرو کی غزلیں معمولی غزل کی حد سے باہر نہیں نکل سکی ہیں اور ان کے مضامین زیادہ تر عاشقانہ ہیں۔ ان میں آرزوئے دیدار، ہجران یار، نرگس بیمار، سوزش شمع، یار کرشمہ ساز، زلف کمند انداز، سیل اشک، خدنگ نرگس مست، کمان جیسے ابرو اور رشک خون تمام سے بحث کی گئی ہے اور زاہد و پارساؤں کے زہد کا اور لوگوں کے زیر سے مقابلہ کیا گیا ہے، یہ چشم زیبا اور ان کے حالات اور شکلوں کا کثرت سے ذکر کیا گیا ہے"[3] مگر میرا خیال ہے کہ انھوں نے امیر خسرو کی غزل گوئی کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا ہے اور ایک چلتا ہوا اوپری نظریہ پیش کر دیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں علامہ شبلی نعمانی اور محمد حافظ محمود خان شیرانی تو مؤرخ بھی فرماتے ہیں "آج خسرو کی تمام شہرت کا زیادہ تر دار و مدار ان کی غزلوں کی وجہ سے ہے اور اہل دل آج بھی اسی طرح سر دھنتے ہیں جیسے کہ ان کے زمانے میں"[4]۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے سب سے زیادہ امیر خسرو کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "خسرو کی غزلوں میں جو سوز و گداز ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے زمانے سے لے کر آج چھ سو سال سے زائد گذر چکے ہیں لیکن سماع اور قوالی کی محفلوں میں غالباً اب بھی سب سے زیادہ ان ہی کی غزلیں مقبول اور رائج ہیں اور اس قسم کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ ان کا کوئی شعر ہی پڑھ کر دسترس کر بعض لوگوں پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہو گئی کہ وہ جان سے گذر گئے"[5]

تصوف کو فارسی شاعری کی جان کہا گیا ہے، جس کے بغیر فارسی شاعری کا قالب بے روح ہے معمولی عشق و محبت اور مجازی اور مجازی عشق زیادہ سے غزل میں وہ گہرائی کہاں پیدا ہو سکتی تھی جو روحانی اور حقیقی عشق سے پیدا ہوتی ہے اگر بڑے بڑے غزل گو شعرا کو دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کی عظمت کا راز ان کی صوفیانہ اور روحانی شاعری اور عشق و محبت میں پوشیدہ ہے۔ غزل اگرچہ رودکی سے شروع ہوتی ہے۔ مگر ابتدا میں اس میں وہ کشش نہیں جو بعد میں تصوف کی ملاوٹ سے پیدا ہوتی ہے۔ شبلی لکھتے ہیں کہ غزل کی ترقی کی تاریخ تصوف سے شروع ہوتی ہے۔ تصوف کی ابتدا اگرچہ تیسری صدی کے آغاز میں ہوئی ہے، لیکن پانچویں صدی اس کے اوج شباب کا زمانہ ہے اور یہی غزل کی ترقی کا دور ہے"[6]

حضرت امیر خسرو کی غزلوں کی حلاوت اور دلکشی کا راز بھی اسی میں ہے کہ ان کی عشقیہ شاعری تصوف سے اور صوفیانہ شاعری عشق و محبت کے رموز و اسرار و معرفت کی باریکیوں سے لبریز ہے، اس میں عشق حقیقی اور مجازی دونوں کا بہتر سے بہتر تناسب موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کی غزلیں قوالوں کی زبان سے سنی جاتی ہیں اور محفل سماع کو آج بھی گرما رہی ہیں۔ یہ صاحبان دل و جگر کو آج بھی مجاز سے حقیقت تک پہنچانے میں مدد دیتی ہیں۔

بہرحال حضرت امیر خسرو نے شیخ سعدی جیسے عظیم غزل گو کے بعد اور لسان الغیب حافظ شیرازی جیسے بزرگ تر غزل گو سے پہلے میدان سخن میں قدم رکھا تھا شبلی، سعدی اور خسرو کا اس طرح ذکر کرتے ہیں "شیخ سعدی ایک مدت تک عشق و عاشقی میں بسر کر چکے تھے اخیر اخیر تصوف کے حلقے میں آئے وہ فطرتاً شاعر تھے، زبان خداداد تھی، ان باتوں نے مل کر ان کی غزل میں یہ اثر پیدا کر دیا کہ تمام ایران میں آگ لگ گئی۔ ان کے بعد خسرو اور حسن نے اس شراب کو اور تیز کر دیا"[7] شبلی نے امیر خسرو کی غزلوں کی خصوصیات میں جذبوں کی فراوانی، سوز و گداز، جدت اسلوب، واقعہ گوئی اور معاملہ بندی، زور

اور عام بول چال، جدت مضامین آفرینی کو شمار کیا ہے۔ پھر وہ لکھتے ہیں "غزل کی جان کیا ہے؟ درد، سوز و گداز، جذبات، معاملات عشق، فکر و دنیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ یہ جذبات اور معاملات جس زبان میں ادا کئے جائیں وہی زبان ہو جس میں عاشق معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے، یعنی سادہ ہو، لے تکلف ہو، نرم ہو، لطف ہو، پیا آمیز ہو۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحریں ہوں جملوں کی ترکیبوں میں نام کو بھی کوئی الجھاؤ نہ ہو، غریب اور مبہم خیالات ہوں۔ اس حد تک امیر خسرو شیخ سعدی کے روش بدوش ہیں، لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں انھوں نے غزل کی اصلیت کے علاوہ کمال شاعری کی بہت سی جدتیں اضافہ کیں اور ایجادات و اختراعات کے چمن کھلا دیئے۔"

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے سعدی اور امیر خسرو پھر امیر خسرو اور حافظ کے شعروں کا مقابلہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔[1]

سعدی کہتے ہیں۔

فراق دوستانش باد یاراں	کہ مارا دور کرد از دوستداراں
لبکہ در منظر تو حیرانم	صورت وصف نمی دانم
شکست عہد مودت نگار دلبندم	برید عہد وفا یار سست پیوندم
کس نگذشت در دلم تا آنجا	کہ کس از درون خانہ بیروں نمی رانی

اور امیر خسرو کہتے ہیں۔

ہمی ریزی ماری خون یاراں	ہمی ماند سزای دوستداراں
ای وجود تو دیدۂ جانم	جسم پیدا و جان پنہانم
چوں من از دوست بداغ و درد خرسندم	ز دوستی بود از دل نہ مرہمی بندم
ای رخسار تنگ نو یافتہ دیدہ روشنی	چندر شوخی و جفا قصد ہلاک من کنی

حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں۔

عزم آن دارم کہ از دل نقد جان بیروں کنم
آرزوئے در پیش وجود را از میان بیروں کنم

حال خود با زلف آن دلبر نمی بینم
بار کار دل خود زیر و زبر می بینم

اور حافظ شیرازی اپنے خاص انداز میں کہتے ہیں۔

دوش سودای رخت گفتم ز دل بیروں کنم
گفت کو زنجیر تا تدبیر این مجنوں کنم

این چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

ویسے تو حضرت امیر خسرو نے پانچ دیوان تیار کئے تھے اور ان کا نام تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ اور نہایت الکمال رکھا تھا، پھر ان پر مقدمے لکھے تھے۔ ان میں سے سب سے زیادہ اہم دیوان غرۃ الکمال ہے۔ مگر قسمتی سے

ابھی تک یہ دیوان ٹھیک سے چھپ سکے اور نہ اب تک کوئی منتخب دیوان ایڈٹ ہو کر منظر عام پر آ سکا۔ ایک بات یہ بھی کہہ دی جاتی ہے کہ اگرچہ خود امیر خسرو نے ان دیوانوں کو الگ الگ مرتب کیا تھا مگر لوگوں نے خاص کر کاتبوں نے اس ترتیب اور درجہ بندی کا خیال نہیں رکھا اور عام طور سے دیوان امیر خسرو کے نام سے بکثرت قلمی نسخے ملتے ہیں جو درحقیقت تمام دیوانوں سے انتخاب ہوتے ہیں۔ یوں تو دیوان میں قصیدے، رباعیاں، قطعے اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی ہوتی ہیں مگر دیوان کی خاص چیز غزلیں ہوتی ہیں اور اکثر دیوان ایسے بھی ملتے ہیں جن میں سوائے غزل کے اور صنف سخن نہیں ہوتی۔

فارسی نثر و نظم میں تین سبک ہیں جن کو سبک خراسانی، سبک عراقی اور سبک ہندی سے یاد کیا گیا ہے۔ سبک ہندی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آورد ہوتی ہے، تصنع سے کام لیا جاتا ہے، دور از کار اور مصنوعی حالات و افکار کو جگہ دی جاتی ہے، تشبیہیں، استعارے وغیرہ بھی غیر طبعی ہوتے ہیں۔ حضرت امیر خسرو کو سبک ہندی کا بانی کہا گیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی نثر میں سبک ہندی کا بہترین نمونہ کہی جا سکتی ہیں جن میں ثقل زبان و بیان بہت زیادہ دکھائی دیتا ہے اور آورد ہی آورد ہے۔ بلکہ آپ نے بہت سی صنعتوں کا ایجاد کیا تھا اور نثر میں ان کو صرف بھی کیا گیا ہے مگر نظم خاص کر غزل میں یہ بات نہیں ہے۔ ان کی غزلیں انتہائی رواں دواں ہوتی ہیں، پھر ان میں آمد ہی آمد دکھائی پڑتی ہے اور غزل کی تمام خوبیاں بدرجۂ اتم نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا ایران کے بہت بڑے استادوں اور محققوں میں سے ہیں۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے فارسی ادب کی بڑی مفصل تاریخ لکھی ہے جس کی بہت سی جلدیں تہران یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں اور کچھ شائع ہونے والی ہیں۔ بہرحال یہ خوش قسمتی ہے کہ اس کتاب کی تیسری جلد کا حصہ دوم ابھی حال ہی میں منتشر ہوا ہے کہ اس میں ساتویں صدی ہجری کی ابتدا سے لے کر آٹھویں صدی ہجری کے آخر تک کے فارسی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، نیز اس جلد میں آپ نے حضرت امیر خسرو کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ستائیس صفحے ان کے لئے مخصوص کئے ہیں۔ آپ نے امیر خسرو کے دیوانوں کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے پھر ان کے دیوان وسط الحیات، بقیہ نقیہ اور غرۃ الکمال سے چند غزلیں منتخب کر کے نقل کی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا انتخاب خود اس قابل ہے کہ حضرت امیر خسرو کی بہترین تخلیقات میں شمار کیا جائے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ امیر خسرو کی غزلوں یا اشعار کا اپنے ذوق کے مطابق انتخاب کر کے پیش کیا جائے بہتر ہوگا کہ انہیں کی منتخب کردہ غزلوں کو یہاں نقل کیا جائے، تاکہ اس سے حضرت کی عظمت اور سبک کا اندازہ ہو سکے، پھر ایرانی ذوق کا پتہ چل سکے۔ اب یہاں تاریخ ادبیات در ایران سے حسب ذیل غزلیں نقل کی جاتی ہیں جو ہم ہندوستانیوں کے لئے بھی سند کا کام کریں گی۔

---

[1] شعر العجم، جلد دوم، ص ۱۵۲ [2] بزم مملوکیہ (مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء) ص ۲۱۶ - ۲۱۷

مسی شب با مهی بودم کجا شد یارب آن شبها
کنون هم هست شب اما سیه ارو دیارها

خوش آن شبها که با وی بود می گرمست و گه سرخوش
جهان بر من شود تاریک چون یاد آرم آن شبها

همی کردم حدیث ابرو و مژگان او هردم
چو طفلان سورهٔ نون والقلم خوانان بمکتبها

چه باشد گر طبیبی پرسد که در تنهائی تبهائی
عدوی زرد یار تن چگونه می کند تبها

مرنج از هجر جانی خسرو اگر می کشد یارت
که باشد خوبرویان را بسی زینگونه مکتبها

ای باد برقع بر فگن آن روی آتشناک را
دی دیده گر صحرا کنم آبی بزن این خاک را

بری کو خون بر آستان شویم من از اشک روان
تا تو دیدن چون توان آن آستان پاک را

زآن غمزه عزم کین مکن تاراج عقل و دین مکن
تاراج دین تلقین مکن آن هندوی بیباک را

سرهای سرداران دین بستی چو بر فتراک زین
ریحان میفگن بر زمین دنبالهٔ فتراک را

تا شمع حسن افروختی پروانه دارم سوختی
یک ذره بندی آموختی آن دامن صدچاک را

جانم چو رفت از تن برون وصلم چه کار آید کنون
این زهر بگذشت از فسون منما تو این تریاک را

گوئی بر آمد گاه خواب اندر دل شب آفتاب
آمد که آه صبح تاب آتش زنم افلاک را

تا بر سر بازار ز مستی قدمش رفت
بس خون مردان که به باد ستمش رفت

هر صبر و سلامت که دل سوخته را بود
اندر شکن سلسلهٔ خم بخمش رفت

یوسف چو گذر کرد به بازار جمالش
هر مایه که او داشت بعهدهٔ درمش رفت

یک روز بشادی وصالش نرسیدم
آن عمر گرامایه که با ما بغمش رفت

آلوده شد بیچگی دامن بارش
زآن خون عزیزان که بزیر قدمش رفت

بسا بسر افگنده بیسر سپاست
ای دولت آن سر که بتیغ کرمش رفت

رفت از قلم حکم که در عشق رود جان
القصه جهان رفت که اندر قلمش رفت

بربادوی امشب شب خسرو بدر زاری
کوتاه شد گره مهی متن و کمش رفت

نه مرا خواب بچشم نه مرا دل بر دست
چشم و دل هر دو بر خسار تو آشفته و مست

پرده بدرید کس این راز نخواهد پوشید
عهد بشکامت سرش بار نخواهد پیوست

ای که از سحر دو چشم تو پری بسته شود
آدمی مست که چشم از تو تواند بربست

بنگر از جهان سر و بلند بر خاست
هر جائی که نشاند بدلستان تست

بهر خون ریز مرادست چه حالی چندین
خون من نه که بریزی و بمالی بر دست

هر که جان در ره جانان ندهد مرده بود
مرده هم نه بود اگر در تن او جانی هست

چشم خسرو تو ان بست که در خواب بیس
منع هندو نتوان کرد که مور است پرست

دل رفت و آرزوی تو از دل نمی شود
دل ما ره گشت و درد تو زایل نمی شود

مه می شود مقابل روی تو هر شبی
یک روز با رخ تو مقابل نمی شود

روییم زراست در ره در تو خاک می کنم
وصل تو کیمیاست که حاصل نمی شود

سد اشک من حایل گردون ز دست تو
دستم بگردن تو حمایل نمی شود

دل منزل غم آمد و از رهروان هجر
یک کاروان صبر بمنزل نمی شود

خسرو در اوفتاد بغرقاب آرزو
چون کشتی مراد بساحل نمی شود

کجا بودمن نه بهتر زاهد زنار
که کیج کعبه رو سر مغان نداشتم باز

چو موی از من صافی نمی کشد پرهیز
مباش منکر زردی کشان شاهباز
بس است مطرب مفلس نوای سوختگان
چو بلبل سحری می کند سماع آغاز
بدان طمع که کند مرغ وصل خوبان صید
دو دیده ام شده از شام تا سحرگه باز
خیال زلف دراز تو گر نگیرد دست
که بر سر آرد از این ظلمتم شبان دراز
تو در تنعم و نازی رهاکن اندیشی
که بار ما نه نیاز است و نازش تو بار
اگر ز خط تو چون موی سرنگردانم
مسد و چون سر زلفم مرا فتاب انداز
گذشت شور شعری و سوزش از گردون
چراکه از پی آوازه می رود آواز
خرد مجوی ز خسرو که اهل معنی را
نظر نقش حقیقت بود نه عقل مجاز

جان ز من بردی و در جانی هنوز
دردها دادی و درمانی هنوز
آشکارا سینه ام بشکافتی
همچنان در سینه پنهانی هنوز
ملک دل کردی خراب از تیغ کین
واندرین ویرانه سلطانی هنوز
هر دو عالم قیمت خود گفته ای
نرخ بالا کن که ارزانی هنوز
من ز گریه چون نمک بگداختم
تو ز خنده شکرستانی هنوز
جان ز بند کالبد آزاد گشت
دل بگوی تو ز زندانی هنوز
پیری و شاهد پرستی ناخوش است
خسروا تا کی پریشانی هنوز

تن پیر گشت و آرزوی دل جوان هنوز
دل خون شد و حدیث بتان بر زبان هنوز
عمرم به آخر و روزم به شب رسید
مستی و می پرستی من همچنان هنوز
عالم تمام پر ز شهیدان فتنه گشت
ترک مرا خدنگ بلا در کمان هنوز
بیدار مانده شب همه خلق از فغان من
وان چشم نیم مست به خواب گران هنوز
هر دم کرشمه [illegible]
خسرو رسید او با امید امان هنوز

کج کلها ستمگرا تنگ قبای کیستی
خوش گرا دلبرا عشوه نمای کیستی
[illegible]
[illegible]
هر کسی بار کرده زین داده بهره تیغ کین
ساخته آمده چنین بار برای کیستی
سینه بنده جای تو دیده بر برای تو
ما همه در هوای تو تو هوای کیستی
تا رخ خود نموده ای جان ز تنم ربوده ای
آتش من فزوده ای مهرفزای کیستی
خانه جان همی بری داغ دل همی خوری
بیک بلند می پری مرغ هوای کیستی
خسرو خسته را بکش [illegible]
طوطی شکرین من نغمه سرای کیستی

حسن الدین احمد

امیر خسرو کا عوامی لب و لہجہ

خسرو کا لب و لہجہ خود وہ اس بولی کے لحاظ سے ہو جو خسرو کے زمانہ میں دہلی اور اس کے آس پاس بولی جاتی تھی یا ان کے مزاج، طرز فکر اور رکھ رکھاؤ کے لحاظ سے ہو، ان کا انداز یکسر عوامی تھا۔

جب قدرت کو انسانیت کے مفید مطلب اور تاریخ ساز کام لینا ہوتا ہے تو حکمراں اور محکوم طبقوں کے درمیان کے فاصلوں کو کم کرنے کے لئے خاص اہتمام ہوتے ہیں۔

امیر خسرو بھی حکمراں طبقہ کے ایک فرد تھے۔ انھوں نے عوام سے قرب حاصل کرنے کے سلسلہ میں جو مقام حاصل کیا اس کے معراج کو اچھی طرح محسوس کرنے کے لئے ہم کو پچھلی تاریخ میں ایک واضح مثال ملتی ہے اور وہ ہے حضرت موسیٰ کی۔

موسیٰ یہودی نسل سے تعلق رکھتے تھے جو اس وقت محکوم تھی۔ ملک میں قہار و جبار فرعونوں کی حکومت تھی۔ موسیٰ اپنا تاریخی کام انجام نہ دے سکتے تھے اگر معجزاتی طریقہ پر ان کی پرورش خود فرعون کے محل میں نہ ہوتی۔ موسیٰ حکمراں طبقہ کے نمائندہ، اقتدار کے مالک اور اہرام کی تعمیر کے نگراں تھے۔ وہ نہ جان گئے تھے کہ وہ یہودی النسل ہیں۔ اور اہرام کی تعمیر میں حصہ لینے والے بیشتر مزدور ان کے ہم نسل ہیں۔ یہی خاص احساس تھا جو بنا آخر دمزدور کی کش مکش کے۔ بنا کی تاریخ میں پہلی بار مزدوروں کے لئے اوقات کار کے تعین یعنی ہفتہ میں چھ دن کام کرنے کے بار ہونے کو وجود میں لانے کا باعث بنا۔

کچھ ایسی ہی بات امیر خسرو کے ساتھ رہی۔ خسرو اس نووارد حکمراں طبقہ کے نمائندہ تھے جس نے کچھ ہی عرصہ قبل اس ملک کو اپنا وطن بنایا تھا۔ لیکن اپنی والدہ کی طرف سے جو عماد الملک کی صاحبزادی تھیں وہ ہندی الاصل تھے۔ اس طرح ان کے لئے عدالتی سطح پر حکمراں اور محکوم طبقوں کے درمیانی فاصلہ کو عبور کرنا مشکل نہ تھا۔ اس صورت حال کو خود ان کی طبیعت کے انداز نے اور صوفی طریقت کے سلسلہ چشتیہ کی تعلیمات نے کافی بڑھاوا دیا اور امیر خسرو نے ایسا عوامی لب و لہجہ اختیار کیا جو آج سات سو سال گزر نے کے بعد بھی اپنی آپ مثال ہے۔

جہاں تک بولی کا تعلق ہے امیر خسرو کی مادری زبان مغربی ہندی تھی جس پر ان کے زمانہ میں علاقائی زبانوں کے اثرات مرتب ہونے شروع ہو گئے تھے۔ امیر خسرو نے اپنی مشہور مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کی بارہ زبانیں گنوائی ہیں اور ان سب کو ہندوی کہا ہے۔ انھوں نے سندھی۔ لاہوری۔ کشمیری۔ ڈوگری۔ تامل۔ تلنگی گجراتی گھاٹی بہاڑی۔ بنگالی اودھی اور دہلوی زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح خود امیر خسرو کی مادری زبان کو ہم دہلوی ہندوی کہہ سکتے ہیں جو امیر خسرو کو اپنی والدہ اور نانا عماد الملک سے ورثہ میں ملی تھی۔ یہ بول چال کی زبان تھی جو مالوہ سے آگرہ تک خفیف سی علاقائی تبدیلیوں کے ساتھ رائج تھی۔ امیر خسرو کے عہد میں دلی کی زبان کھڑی بولی کی بنسبت زیادہ آگرہ کی زبان برج کی پیش رو تھی یعنی قیاس چاہتا ہے کہ اس دور میں دہلی اور آگرہ کی زبان کم و بیش ایک طرح کی رہی ہوگی۔ خسرو کا ہندوی کلام ان ہی دو زبانوں پر مشتمل ہے۔

امیر خسرو نے کھڑی بولی کے الفاظ اور فقرے فارسی کلام کے بیچ میں شامل کئے ہیں جیسے۔

رفتم بہ تماشائے کنار جوئے
دیدم بہ لب آب زنِ ہندوئے
گفتم صنما بہائے زلفت چہ بود
فریاد برآورد کہ درِ در موئے

آخری فقرہ کی خوبی یہ ہے کہ بیک وقت فارسی کا بھی ہے اور کھڑی بولی کا بھی۔ فارسی کلام میں ہندوی اجزا کو پیوند کرنے کے متعلق سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ اس کا مقصد ظرافت کا سامان مہیا کرنا تھا۔ لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی۔ امیر خسرو نے عوامی بولی کی قدر افزائی کرنے اور اس کی توجہ خاص کام کر جانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا تھا اور یہ تجربہ کامیاب کہ دنیا کی ادبی تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ کوشش شعوری تھی اور بامقصد۔

اسی طرح امیر خسرو نے خالص کھڑی بولی میں بھی خاصا کلام لکھا اور اپنے دوستوں میں تقسیم کیا۔ خسرو ہندوی میں شعر کہنے کو زبان سخن سمجھتے تھے بلکہ اس پر انھیں فخر تھا۔ یہ کلام خود خسرو کی زندگی میں عوام میں مقبول تھا۔ افسوس کہ امتداد زمانہ کے باعث یہ کلام اب ناپید ہے اور جو چیدہ چیدہ کلام سینہ بہ سینہ ہم تک آیا ہے اس میں زبان کی تبدیلی کا بھی امکان ہے اور اس کا بڑا حصہ الحاقی بھی سمجھا جاتا ہے۔

خسرو کے دور کی عوامی بولی کے مقابل ایک طرف تو ملک کی زبان سنسکرت تھی جو ہندی عالموں، پنڈتوں اور اعلیٰ ذات والوں کی زبان تھی۔ امیر خسرو کے عہد میں سنسکرت کے پنڈت بھی اس دیسی بولی کو حقارت سے دیکھتے تھے اور فارسی کے عالم بھی۔ خسرو نے ہندوی میں شاعری کی اور فارسی شاعری میں ہندوی الفاظ

استعمال کیا اور اس طرح اس زبان کے بولنے والوں میں جو احساس کمتری پیدا ہو گیا تھا اس کو دور کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس عوامی بولی کے دلدادہ تھے اور اس میں گیت دوہے پہیلیاں لکھ کر اس کو بڑھاوا دیا۔ انھوں نے اس زبان کے گیسوؤں کو سنوارا۔ اس کی شاعری میں فارسی کے اوزان استعمال کیے۔ اور اس طرح اس زبان کے ارتقا میں نہایت اہم رول ادا کیا۔ آج اہل سندھی ہوں یا اہل اردو ہر دو امیر خسرو کو ہر دو زبانوں کا محسن اول مانتے ہیں۔

امیر خسرو کو درباری اور سپاہی کی حیثیت سے ملک میں سفر کرنے کے کافی مواقع ملے۔ انھوں نے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں بولی جانے والی مختلف بولیوں کا دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ انھوں نے ملک کے عوامی لٹریچر سے جو تحریری ہو یا زبانی بھرپور استفادہ کیا۔ اس کے الفاظ، خیالات اور محاوروں کو اپنے کلام میں استعمال کیا۔

یہ تو اس بولی کی بات تھی جو ان کی مادری زبان تھی لیکن جو شاعری انھوں نے فارسی میں کی ہے اور جس کے ذریعہ ایران کے اہل زبان سے بھی لوہا منوایا ہے اس کا لب ولہجہ بھی عوامی ہے۔ اپنی شاعری میں انھوں نے اپنے عہد کے عوام کی زندگی اور ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کی عکاسی کی ہے۔ ان کے تخلیقی کارنامے ان کے اپنے وطن کے عوام سے جڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے لئے بیشتر موضوعات عوامی زندگی سے لئے اور اپنی شاعری میں انسانی جذبات اور احساسات کو پیش کیا ہے انھوں نے عام آدمی کی زندگی کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے کلام میں ہم کو مختلف پیشہ وروں اور اپنے اپنے فن کے ماہر کاریگروں کا ذکر ملتا ہے۔

خسرو کے عوامی لب ولہجہ پر سب سے زیادہ اثر صوفی طریقت کے چشتیہ سلسلہ کا پڑا۔

تصوف کا مزاج ہمیشہ سے جمہوری رہا۔ تصوف مخلوق خدا کے ساتھ محبت کی تعلیم دیتا ہے اس تصور کا بنیادی خیال یہ ہے کہ خدا سے سچی محبت کرنے والا اس کی مخلوق خصوصاً انسان سے بلا امتیاز مذہب و نسل محبت کرتا ہے۔ تصوف میں بھی دوسرے سلسلوں کے اور خصوصاً سہروردی سلسلہ کے مقابلہ میں چشتیہ سلسلہ اپنے رجحانات کے اعتبار سے جمہوری رہا اور جمہوری روایات چشتیہ سلسلہ میں برقرار رہیں۔ جس کا ثبوت ان کی تمام تعلیمات سے فراہم ہوتا ہے حضرت نظام الدین اولیا کا عوام پر کافی اثر تھا انھوں نے بھی کوئی سرکاری ملازمت یا جاگیر قبول نہیں کی۔ شیخ فرید نے اپنی خانقاہ میں کام کی تقسیم کر دی تھی۔ نذرانہ مناسب اور مساوی طور پر تقسیم ہوتا۔ چشتی بزرگوں کی تعلیمات کے موجب ذاتی محنت سے کمائی ہوئی آمدنی ہی جائز سمجھی جاتی تھی۔ چشتیہ سلسلہ کا خاص مشن تھا کہ وہ مسلمانوں اور نومسلموں میں تال میل اور یکجہتی پیدا کریں اور ان کو ناگنا راور سیا مسلمان بنا کر مذہبی علماء کی احساس برتری اور ترک سرداروں کے غرور اور نسلی برتری کے جذبات سے بڑی حد تک محفوظ کریں یہی وجہ تھی کہ چشتیہ سلسلہ کی تعلیمات پسماندہ طبقہ کے لئے کشش اور جاذبیت رکھتی تھیں۔ امیر خسرو نے تصوف کو اپنا لیا اور اس کے رنگ و روپ سے اپنی فارسی شاعری کو آب و تاب دی۔ ان کے کلام کا بڑا حصہ چشتیہ سلسلہ کی انسان دوستی کے خیالات کی ترویج کا ذریعہ تھا۔ خسرو نے اپنی عملی زندگی اور شاعری دونوں میں مخلوق خدا سے محبت کا ثبوت دیا۔ وہ ہر مذہب کے پیروؤں سے خلوص اور محبت کا اظہار کرتے۔ وہ مخلوق خدا سے ہمدردی رکھتے تھے۔ انھوں نے حکمرانوں کو ہمیشہ انصاف سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ اور کہا کہ تم اقتدار حاصل کرنے کے خواہشمند ہو تو تمہیں عوام اور رعیت سے اچھا سلوک کرنا ہوگا۔ اس طرح خسرو نے تمام عمر اپنے عوامی لب ولہجہ کو برقرار رکھا۔ اور اپنے مرشد کے مزار پر ان کے منہ سے آخری دوہے کے بول نکلے زبان پر آئے وہ بھی اس عوامی زبان کے تھے جس کو انھوں نے اپنا لیا تھا۔

بقیہ - امیر خسرو اور عصر جدید

محاربات کے بیان کی بات اور ہے کہ ایسے مواقع پر خسرو بھی اپنے ہم عصر مؤرخین کے محاورے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی ان کا قلم کہیں دربار نہیں ہوتا ایک مؤرخ کے لئے امیر خسرو اطلاعات و معلومات کا بے پناہ ذخیرہ پیش کر سکتے ہیں منگولوں کے غولوں کا سیلاب اور سلاطین دہلی کی دفاع اور سرکوبی کی کوششیں، عہد بلبن میں بنگال کے حاکم کی بغاوت اور اس کا فرو کرنا، عہد خلجی میں راجپوتانہ گجرات اور دکن کی مہمات، علاءالدین کی اصلاحات، مبارک شاہ خلجی کا قتل، ... غیاث الدین تغلق کے معرکے اور تخت نشینی وغیرہ ایسے واقعات ہیں جن کے بارے میں امیر خسرو کے بیانات حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔ امیر خسرو نے اپنے عہد کے پہلے مؤرخ ہیں جنھوں نے مروجہ رسوم و رواج، صنعت و حرفت، معیشت و معاشرت، علوم و فنون اور عقائد و مسالک پر توجہ کی اور بیش قیمت معلومات ہمارے لئے چھوڑیں اس عہد کے بعض اہم واقعات کی تاریخوں کا تعین امیر خسرو کی اعانت کے بغیر ناممکن تھا۔

امیر خسرو کے سوانح نگار ڈاکٹر وحید مرزا ان کی بذلہ سنجی اور نکتہ لطیف کو، ان کی رواداری اور وسیع المشربی کو، سخاوت کو، صاف گوئی اور غیر منافقانہ رویے کو، ان کی ہمہ گیر شہرت و مقبولیت کے اسباب میں شمار کرتے ہیں۔

امیر خسرو کی اہمیت اور معنویت اس وقت ختم نہ ہوگی جب تک کہ انسان، اس کی تاریخ اور اس کے احساس و اظہار کے تجربات میں ہماری دلچسپی ختم نہ ہو جائے۔ اپنے عہد کے سب سے بڑے سیاسی سربراہ یعنی بادشاہ کے مصاحب، اپنے عہد کے سب سے بڑے ولی کامل یعنی حضرت نظام الدین اولیاء کے چہیتے مرید اور اپنے عہد کے سب سے بڑے فن میں یکتا فنکار شاعر، حضرت امیر خسرو بیک وقت متناقض و متخالف جہتوں میں سفر کرنے کے سلسلے میں ایسے چراغ راہ ہیں جسے بدلنے والے ادوار بجھا نہیں سکتے۔

یک سبب زار میں تو امید خرید کس
زیرا کہ کس بہشت بریں را بہانہ کرد

نقی محمد خاں خورجوی

امیر خسرو کی موسیقی

واقعات سے ظاہر ہے کہ انہی کے زمانے میں ہندوستانی موسیقی پر عموماً، مقصد وضع یک گانوں تک محدود تھی جو سنسکرت اور برج بھاشا میں گائے جاتے تھے امیر نے سب سے پہلے عجمی موسیقی کے انداز پر ترانہ، قول نقش و نگار گل وغیرہ گانے ایجاد کیے۔

باوجودیکہ اسلام میں علماء نے موسیقی کو ناجائز قرار دیا تھا لیکن ایک گروہ صوفیوں کا ہر زمانے میں ایسا ہی رہا ہے جو تصوف کی غزلیں گا کر روحانی سرور حاصل کیا کرتے تھے۔ چنانچہ شمس الدین التمش کے زمانے میں ان کے قاضی سعد الدین عمادی اور منہاج السراج کے اثرات سے موسیقی غیر اسلامی شعار قرار دے دی گئی تھی۔ لیکن چشتیہ قاضی حمید الدین ناگوری کی تبلیغ اور اثر سے دہلی کے لوگوں میں دوبارہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ بلکہ ایک زمانے میں تو وہ صحبت ہائے سماع کے رکن تھے۔

شمس الدین التمش نے بھی پابندی کے حکم کو منسوخ کر دیا تھا۔ اور دربار میں بھی اس کی اجازت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اس کا بڑا لڑکا فیروز شاہ بھی موسیقی کا بحد دلدادہ تھا۔ یہاں تک کہ اس نے ۶۳۴ھ مطابق ۱۲۳۷ء یعنی ایک ہی سال میں اپنی سلطنت اس شوق پر قربان کر دی۔

شاہ بلبن کے دور میں بھی موسیقی مقبول رہی۔ اس کے دربار میں عبداللہ ترکی ایک مشہور گویا بھی تھا۔ اور شیخ بہاء الدین زکریا کے مریدوں میں سے تھا وہی زمانہ امیر خسرو کا تھا جنہوں نے اپنی "قران السعدین" میں کیقباد کی موسیقی کے حالات درج کیے ہیں۔

اس کے پچاس سال بعد ۶۸۶ھ میں جب کہ معز الدین کیقباد تخت نشین ہوا اس کے زمانے میں موسیقی کا عروج تھا اور تمام ہندوستان سے گانے والے اور گانے والیاں سمٹ کر دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔

جلال الدین فیروز خلجی کے زمانے ۶۸۹ھ میں نامور مغنی محمد شاہ چنگی جو تاج، نصرت خاتون اور مہر افروز وغیرہ موسیقار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علاؤ الدین خلجی کے زمانے ۶۹۵ھ میں زیادہ تو نہیں لیکن کچھ سلسلہ موسیقی کا جاری رہا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ محمد تغلق کے دربار کا سب سے بڑا گویا اور اس کا داروغہ ارباب نشاط امیر شمس الدین تبریزی تھا۔ الغرض اس زمانے میں دکن اور خصوصاً دولت آباد میں موسیقی کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اس طرح تمام ہندی موسیقی پر عجمی موسیقی کا کافی اثر پڑا۔ اور جس طرح عجم اور عرب نے عربی کی دھنیں فارسی گانوں میں منتقل کر دیں اسی طرح بادشاہوں کے مغنیوں نے اسے ممالک کی دھنیں ہندوستان میں آن کر گائیں اور نئے نئے راگوں کی بنیادیں قائم ہونا شروع ہو گئیں یہ اسی میل جول کی برکت ہے کہ عجمی موسیقی کے عام پسند راگوں میں رنگ جس کو ایمن کلیان اور حجاز کو حجاز اور زیلف کو ہم بیان کر چکے ہیں۔ اسی طرح زیلف، ایمن، درباری، عشاق، سرپردہ، کھماج وغیرہ اسی موسیقی کی پیداشدہ یادگاریں ہیں، جو آج مقبول عام ہیں

بحر اور اوزان

چونکہ گانے کا تعلق نظم سے ہے اور نظم بلا کسی بحر کے نظم نہیں کہی جا سکتی اور بحر کے واسطے اوزان کا ہونا ضروری ہے کیونکہ بلا اس کے تال اور ردھم کا سامنا نہیں ہو سکتا اس وجہ سے امیر خسرو نے بحر اور وزن اور تال سم کے بھی قواعد مقرر کیے ہندی گانوں کا دارومدار شُر نے اور تال سم پر ہے۔ فارسی میں اسی کو نغمہ، دائرہ اور اوزان کہتے ہیں اور تمام عجمی گانوں کا دارومدار دائرہ اور نغمہ پر ہے۔

ہندی تالوں میں ساڑھے بارہ تالیں تلائی جاتی ہیں۔ اور امیر نے چودہ بحور میں تالیں ایجاد کیں جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

بحر ہزج، بحر ترکی، بحر دوبک، بحر دور، بحر ثقیل، بحر خفیف، بحر چہار ضرب، بحر دراز، بحر آس، بحر ضرب الفتح، بحر فاختہ، بحر رمل، بحر متقارب، بحر طویل، بحر رجز، بحر کامل، بحر بسیط، بحر مضارع، بحر منسرح، بحر سریع، بحر مجتث، بحر مربع، بحر مقتضب، بحر وافر۔

قواعد تقطیع

تقطیع کو زیادہ سریع الفہم بنانے کی غرض سے ہر بحر کا تعلق اوزان اور موسیقی سے بتلانے کی غرض سے ذیل کا طریقہ پیش کیا جاتا ہے تقطیع اوّل متقارب المثمن کو طبلہ کے ایک تال ٹھیکہ کے ساتھ سمجھئے۔

کریما ببخشائے بر حال ما ۔۔۔ کہ ہستم اسیر کمند ہوا

یہ لو ہے شعر۔ بحر اس کی فعولن فعولن فعولن فعول ہے۔ اس بحر کے گویا چار حصے ہیں۔

موسیقی سے ان ٹکڑوں کی یکسانیت پیدا کرنے کی غرض سے ایک تال ٹھیکہ

مقرر فرمایا ہے ۔ یعنی دھی ۔ ترکٹ ۔ دھنا ۔ دِنا ۔ تو ۔ تا ۔ کتا ۔ گانے میں اس تال کی ضرب بار بلی خالی ہے ۔ اور دوسری تک پر صورت ختم کی ہے ۔ اور تحریر اس لفظ سول رکن چہارم پر ظاہر ہوتا ہے اور آٹھویں بحر الشمس اسالم میں بھی کہ جس کے چار لفظ حصے برابر ہیں ۔ ٹھیکہ ایک تالا نہایت موزوں ہے اور ٹھیکہ جھپ تالے میں بھی یہ وزن ہم ہوتا ہے ۔ ضرب کے علاوہ دونوں تالوں کی ایک صورت ہے ۔ چنانچہ چوتالا دھرپد کا ایک ہی طرح ایک تالے میں گانا بجانا ممکن ہے ۔

حضرت امیر خسرو نے بحر رمل الشمن المحذوف کا وزن تالا تال فارسی میں موزوں کیا ہے ۔ یہ تالا چار ضرب کا ہے یعنی تین بھری اور ایک خالی ۔ اور ان تین میں سے دوسری یعنی منجھ کی ضرب پر سم ہے ۔ اس طرح ہر چار رکن بحر مذکور کے ہیں مثلاً فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن ۔

تقطیع بحر یہ ملاحظہ ہو ۔ مصرع یہ ہے ۔

" اے پیارے کے میانت بچھو موتے ورکر "

اے پیارے	کے میانت	بچھو موتے	ورکسر (خالی)
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلن (خالی)
تا دھن دہا دہا	دھن دہا دہا	دھن دہا دہا	تن تا (خالی)

غور فرمائیے کہ تن تا کا درجہ خالی رہا اور فاعلن آخری رکن خالی پر پڑا اور لفظ ورکر کے مقابلہ میں خالی دی اور دوسرے رکن کے فاعلاتن پر سم ہے اور اس سے پہلے لفظ کے اوپر سم ا اور اس سے مقابلہ میں دوسری دھی پر سم ہے ۔

یہ تال چار ضرب کی کہلاتی ہے جس میں تین ضرب بھری اور ایک خالی ہے ۔ بحر خفیف المسدس المحذوف جس کا وزن تال سول فاختہ پر ہے ۔ اس میں چپک تال ہے اور یہ دونوں تین تین ضرب کی ہیں ۔

اے محلت رشک مشک تاتارے ذوق بحر خفیف گرد آرے

سول فاختہ میں دو ضرب اوّل کی برابر ہیں اور ایک ضرب آخر میں وقفہ دے کر پڑتی ہے ۔ پہلی ضرب فا پر اور دوسری ضرب لا پر اور تیسری ضرب مفاعلن کا مد چھوڑ کر بطور وقفہ حصہ سوم کے لفظ لن پر پڑتی ہے ۔ مذکورہ بالا شعر کا وزن اور ٹھیکہ یہ ہوگا ۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن ۔ یہ ٹھیکہ سات لفظ کا ہے ۔ یعنی دہ دہ تک دہ دہ ۔ دہ ۔ تک ۔ اس کی اوّل ضرب خود سم ہے ۔ پہلی دہ پر اور دوسری تک پر اور تیسری ضرب دوسری تک پر اور تیسری ضرب دوسری تک پر ہونی چاہئے اور تال چپک میں ضرب اول کے حرف فا پر اور دو ضرب برابر رکن دوم فاعلن کی ضرب کا آخری حصہ دوسرے رکن سوم کی طرف فا پر ۔ اور تیسرے لفظ لن پر پڑنا چاہئے صرف اسی قدر فرق سول فاختہ اور چپک میں پایا جاتا ہے البتہ منقلب کرنے سے تال تبدیل ہو جاتی ہے ۔

امیر کی ایجاد تال سم

اسی ایجاد کے سلسلے میں ماہر موسیقی دولت شاہ اور حکیم محمد کرم خاں وغیرہ نے لکھا ہے کہ امیر نے پکھاوج کی بجائے ڈھولک اور طبلہ ایجاد کیا ۔ اور ان کے بجانے کے قواعد مقرر کر کے امیر نے سترہ تالیں قائم کیں ۔ جن میں فارسی کے قواعد کو بھی ملحوظ رکھا ۔ یعنی اوّل حسب پانچ تال سواری چار تال، فرودست پانچ تال، پہلوان چار تال چپت تین تال، رباعی سواری پانچ تال اور سات تال، پشتو ایک تال اور اگر ضرب کی دم دی جائے تو تین تال کی صحیح ہے ۔ آڑا چوتالا چار تال، قوالی تین تال، زود کم س تال، جھومرا تین سال دروپک تال ہندی ہے) سول فاختہ تین تال رہتا ہے ہندی کی چپک تال سے (جس کے معکوس کرنے سے سول چپک اور چپک سول ہو جاتی ہے ۔

فارسی ترانہ مع تال اور سم

تنھم درنا نادر در نم — تہ در نانادر در نم

دو یک — دو رویہ
وش وستس لو ن — وش وش لوں وتی وش لون

رواں — بسیت
وش تک وشن لو ں — وتس لوں وش وتی لو ن

یم دور — چپ انداز
وش لو ں تک وشں — وش نہ وشں لون

وس وتی لوں

تالہ — یم ثقل
وشں نہ وشں لو ں — تک تک تکاوتی تکاوتی تک تک
تکاوتی تکاوش وش لو ں

خمر — مخمس
وتی لوں لکہ وتس وشں — لکہ لکہ لکاوتس لکاوس
لوں وتی وتی لوں لو ں — لوں وش وس لکہ لکہ لکھاوتی

سماعی — دو رحقیقی
وش وتی لوں لکہ وتی لو ں — وش لوں لوں وش لو ن
وتس وتس ـــــ لوں — لوں وتی لوں وتی لو ن
وتی وش لو ں وشں لوں

تنگ ضرب — وش لکہ وش لکہ
لکہ لکہ لکاوتس — ضرب فاختہ
وتی وش لوں لوں وش وتی — وتس وتی لو ن

قلبانہ

قلبانہ کی اصل قلبۃ ہے ۔ امیر خسرو نے زبان عربی کو ہندی میں ملایا ہے ۔ تال سواری اور ترتالہ استائی بول ہیں ۔ لقد صدق قولہ تعالیٰ " اقرا " امیر خسرو بل بل جاویں حضرت نظام الدین اولیاء کے دربار کا دیں ۔

قلبانہ اور قول کہ جس کی اصل قول ہے کچھ عربی اور کچھ الفاظ ترانے کے ملاکر

ایجاد کیا ہے۔ اسمائی تال تتالہ۔ حی در در تالا لائے۔

حسن و نظام الدین اولیا۔ دیم یم در دیر در رتے۔ تان یہ ہے تلے تنانا نانا نا نا نا نا تِرا۔ ہے نا ما تو لوسمع وجہ اللہ در رم، رتم توم تنا ما ما ما۔ در دے لے تلے در اجام دیم یم در در در در تے تان لے ما نا ما اس کے بھی انترے سے تال بدلتی ہے اور نقش گل میں تال نہیں بدلتی ہے۔ اکثر یہ تال پشتو اور قوالی میں گائی بجائی جاتی ہے۔

نقش سے مراد رباعی اور گل سے مت ہے گویا مختصر سا ایک شعر ہے۔ بقیہ اوروں میں تالیں بدلتی ہیں اور دہرپد کی بجائے کہ اس میں چار یا پانچ چرن ہوتے ہیں (اور بعض میں دو چرن بھی ہوتے ہیں) امیر نے خیال مقرر کیا۔ جس میں صرف دو ہی چرن ہیں۔ لیکن تاہم اس میں ترانہ بھی زمزمہ پر رکھیں جس کو بی ربار گٹکری کہتے ہیں۔

اصلیت یہ ہے کہ ہندی میں پہلے گٹکری تھی اور اب بھی اس میں والے کا پڑھا عیب میں داخل ہے۔ اسی وجہ سے امیر نے اس کی بجائے پر بند کا ترانہ بنایا اور وہ ایسا مقبول ہوا کہ سب والوں کے علاوہ جو گانے والے بھی محو حیرت رہ گئے۔

ڈھولک اور طبلہ بھی پکھاوج پر غالب آگئے۔ اسی طرح ستار کے بولوں نے بین کے بولوں کو ترما دیا۔ اس زمانے میں بھی قوال تقریباً ہر جگہ موجود ہیں لیکن ایسے سب کم ہیں جو قول اور قلبانہ سے بخوبی واقف ہوں۔ ورنہ عام طور پر جو خیال وغیرہ گاتے ہیں وہ بھی قوال کہلاتے ہیں۔

جیسا کہ شروع میں بیان ہو چکا ہے کہ امیر نے دہرپد، دھوا، ماتھا، چھند و پرتند، گیت، وہرپد، کی بجائے خیال، قول، قلبانہ، نقش گل اور ترانہ ایجاد کئے اور جس طرح پر دہرپد، ماتھا اور چھند کی تالیں بدلتی ہیں اسی طرح قول قلبانہ وغیرہ میں بھی تالیں بدلتی ہیں۔

قدرتی طور پر جوش اور جذبہ کی حالت جو الفاظ ماتے ہو وغیرہ کے نکلتے ہیں۔ ان کو حضرت امیر نے ان الفاظ میں منتقل دیا۔

تاتو ن بر ورن تو۔ وان بر ورن جاں وایں مقرر کر کے الاپ موزوں کہاں مقرر کیا۔ اس سے زیادہ الاپ اس قسم کی قوالی یعنی خیال، قول، قلبانہ، نقش گل اور ترانے میں نہیں ہیں اگر ہیں تو معیوب ہیں۔

یہ راگ گویا امیر کی امانت ہیں ان میں ترمیم تسخ اور اس امانت میں خیانت نا روا ہے کیوں کہ ایسا کرنے سے رفتہ رفتہ یہ راگ معدوم ہو جائیں گے یا ان کی شکل تبدیل ہو جائے گی۔ الاپ یا مُرکی اور گٹکری ایک حد تک جو چیز ہے تو گانے کو پُر لطف بناتی ہیں۔ لیکن ان سے اشعار کے الفاظ کٹ جائیں اور ناقابل فہم ہو جائیں تو وہ عیب میں داخل ہے۔ اس کے گانے میں جو تال لی جائے وہ بھی اسی راگ کی ہونی چاہئے جس میں وہ غزل گائی جا رہی ہو۔ اگر ان دونوں باتوں کا لحاظ نہ رکھا گیا تو قوالی بے لطف ہو جاتی ہے۔

ترانہ

ترانہ بہ وزنِ فسانہ ونقطتنا بروزنِ شتا، سیم و زر بروزنِ سر اور نا بروزن جا اور توم بروزن موم، تنا بروزن دھا، اس کے علاوہ اور حروف معروفات مثلاً تا، دال، نون، الف، یا، میم، را، واؤ یہ آٹھ حروف ہیں۔ ان کے علاوہ ہر کٹ ترنٹ بروزن سلوٹ مستعمل ہیں اگر آٹھ حروف سے زیادہ ہوتے تو ترانے کے شمار سے باہر ہو جاتے ہیں۔

امیر نے ترانہ بزبان فارسی ایجاد کیا یعنی درآ آ۔ درآ آ۔ ورتم۔ درآ جان من درآ۔ درآ۔

تنگ آمدہ ام جیدا انتظار کشم
بیا بیا کہ ترا تنگ در کنار کشم

ترانہ سوہے کا اور تال فرودست کی ہے۔ دراصل اس کی تال جس کی ہے ترانہ یہ ہے۔ درا درا تلے۔ درا لے تا اتل لائیے۔ اتل لائیے تلا یلے۔ پہلے کی خالی سے شروع ہے۔

بردی دستو کی ہم چو خسرو
ہزاراں عاشقاں ترکندہ باشی

ستار

امیر نے بین کی بجائے ستار ایجاد کیا۔ بین میں سات تار دو دو اور چار بین ہوتی میں اور دو مضراؤں کو چھنگلیا انگلی میں پہن کر بجائی جاتی ہے وہ ستار جس میں تار ہونے میں ان کے بجانے کے صرف دو ہی طریقے ہیں یا تو مضراب سے یا ناخون کے کانچہ سے۔ مضراب کو تت اور کانچہ کو تب کہتے ہیں۔ اور لکڑی کے ٹکڑے کو جس سے بجاتے ہیں۔ اس کو گُص کہتے ہیں۔

ستار کا اصلی ابتدائی نام سہ تار اور سرود کا سہ رود ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان دونوں باجوں میں پہلے صرف تین تار تھے اور تین تانت تھیں۔ امیر نے ستار میں ایک تار آہنی اور دو ریشمی لگا کر بعض تو سہ سے میں کی مثال بنا دیا۔

ستار میں ایک سپتک کامل اور دو سپتکیں ناقص ہیں۔ یعنی سپتک اول مدھم سے سپتک میانہ تک اور دو سپتک دوم) سپتک میانہ سے گندھار تک۔ ایک سپتک زائد چڑھی ہوئی خط گندھار تک ہوتی ہے جس کو امیری سپتک کہتے ہیں۔ البتہ بیچ کی سپتک کامل ہے۔

حضرت امیر نے جو قواعد مقرر کئے وہ یہ ہیں۔

بیچ کی سپتک کو کامل کیا، جب یہ تین سپتکیں مقرر ہو گئیں تو ترتیب کے ساتھ اس میں چھ تار اس طرح پر رکھے کہ۔

اوّل تار بات کا، دو تار ریشمی کھرج کے، ایک تار آہنی پنچم کا، ایک ریشمی گنڈہ اور پھر ایک تار آہنی اس کے بار جس کو چکاری کہتے ہیں، جو تار ریشمی ہیں وہ کھرج کہلاتے ہیں، جو باج ہیں ان کو بہ حساب مدھم کوک کہتے ہیں سیدھے ہاتھ کی طرف کھرج آہنی اور ریشمی ہوتی ہے، پنچم اور چکاری ہم درد مدھم ہوتے یا ٹر کے مطابق ہوتے ہیں اور سپتک دوسری اور تیسری میں کام آتی ہے۔

امیر کے ایجاد کردہ راگ

امیر کے گانے اور انکی ترکیب

مرتبہ ۔ سید رشید آغا ۔

گانے سیکھنے کے دو ہی طریقے ہیں ۔ بہترین طریقہ تو یہ ہے کہ حلق سے آواز نکال اس کے اتار چڑھاؤ کو سمجھا جائے ۔ یا آوازوں کے ایسے نشانات اور علامات مقرر کئے گئیں جن سے ان کی شناخت ہو سکے ۔ ایسے علامات کو نوٹیشن کہتے ہیں جو حسب ذیل ہیں ۔

(۱) سرگم ۔ سا ۔ رے ۔ گا ۔ ما ۔ پا ۔ دھا ۔ نی ۔

یہ بیچ کی سپتک کے چڑھتے سُر ہیں ۔ جو تیور ہیں ۔

(۲) سا ۔ رے ۔ گا ۔ ما ۔ پا ۔ دھا ۔ نی ۔ ان میں جو حروف کٹے ہوئے ہیں وہ بیچ کی سپتک کے اُترے ہوئے سُر ہیں ۔ جو کومل ہیں ۔

(۳) سا ۔ رے ۔ گا ۔ ما ۔ پا ۔ دھا ۔ نی ۔

یہ اوپر کی سپتک کے چڑھے ہوئے سُر ہیں ۔ جو تیور ہیں ۔

(۴) سا ۔ رے ۔ گا ۔ ما ۔ دھا ۔ نی ۔

جو حروف کٹے ہوتے ہیں وہ اوپر کی سپتک کے اترے سُر ہیں جو کومل ہیں ۔ ۔

علامات زیر کی ہیں ۔

(۵) سا ۔ نی ۔ دھا ۔ پا ۔ ما ۔ گا ۔ رے ۔ سا ۔

ان زیر کی علامات کی وجہ سے یہ نیچے کی سپتک کے چڑھے سُر ہوتے جو تیور ہیں ۔

(۶) سا ۔ نی ۔ دھا ۔ پا ۔ ما ۔ گا ۔ رے ۔ سا ۔

ان علامات کی وجہ سے یہ کومل ہوتے ۔

راگ مجیب یا مجیر

یہ راگ کافی ٹھاٹ کا ہے اور تاڈو سمپورن ہے ۔ آروہی میں گا ورجت ہے ۔ یعنی معدوم) اور امروہی میں وکرت ہے، جس میں شروع کا گا مارے سا ہے ۔ اس میں رے ما گا ما رے سا کی تان آتی ہے جس سے ملار کا رنگ یعنی صورت کا شبہ ہوتا ہے ۔ اس میں وصوت وادی اور گندھار سم وادی ہے ۔ اس وجہ سے دن کے وقت گا یا جاتا ہے ۔ اس میں امیر خسرو کی قوالی کا رنگ بدرجہ اتم موجود ہے ۔ یہ زیادہ تر درت لے میں گایا جاتا ہے اور خاندانی قوالوں کے گھرانے کا خیال کہلایا جاتا ہے ۔

یہ راگ مخرمیل یعنی ایک سے زیادہ راگوں سے مرکب ہے ۔ آروہی اس کی سا رے ما پا دھانی سا ہے ۔ اور امروہی اس کی سا نی دھا پا ما پا نی گا ما رے سا بول اس کے یہ ہیں ۔

حضرت نظام الدین اولیاء پیر مشائخ نور
آن پڑے دربار تہارے عشق پر کر پا
کرو بہ ماتے اسیا ء پیر مشائخ نور
راگ سارنگی

یہ بار دو ٹھاٹ کا سمپورن راگ ہے ۔ اس کا سروپ یعنی شکل نتی ہے ۔ گا اس کا وادی سُر ہے ۔ اس میں دونوں دھیوتوں کا رواج ہے، جانے میں تیور اور آنے میں کومل ہے ۔ اس میں کھاداؤ اور مدھم کی سنگیت ہے ۔ تیور مدھم کی لگائی جاتی ہے، گانے کا وقت شام کا ہے، یہ راگ پوریا اور پورنی کے ملنے سے پیدا ہوا ہے، چونکہ رنگ پوریا کا ہے لہذا اس کو مندر اور مدھ استہان سے گانا چاہئے ۔

آروہی اس کی نی ۔ رے ۔ سا ۔ نی ۔ دھا ۔ نی ۔ رے ۔ گا ما گا ما ۔ پا ۔ دھا ۔ نی ۔ سا ہے ۔

امروہی ۔ سا ۔ نی ۔ دھا ۔ پا ۔ دھا ۔ ما ۔ گا ۔ رے ۔ سا ۔

خیال ایک تالہ الفاظ یہ ہیں ۔

چنگے کام ہووے آسان ۔ مت میں پر بیٹھے ہی ۔ دربار ہووے اپن آرام ۔
اولیا کے چرن پر ہووے تمام سب جس مٹ دلدر دہام ۔

راگ ایمن کلیان

کلیان ٹھاٹ کا پہلا راگ ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ معارف النغمات " صفحہ ۱۰۱ میں ہے ۔ اس راگ میں گندھار گرہ انس اور نیاس کا سُر ہے ۔ راگ کا وقت سام، شام کے گانے کا ہے ۔ بعض پرانے پنڈتوں نے بھی اپنی کتابوں میں اس کو تسلیم کیا ہے کہ یہ راگ ملک ایران کا ہے ۔ موسیٰ دکن کی پرانی سنگتوں میں بھی یہ راگ موجود ہے اور ان میں گانے کا وقت بھی شام ہی کا درج ہے ۔

تان سین کی مت میں ہے کہ شدھ کلیان ایمن اور ملادل ملا کر ایمن کلیان راگ بنایا گیا ہے اس لئے گانے وقت ان تینوں راگوں کا ثبوت ملنا چاہئے ۔ یہ راگ سمپورن ہے اور آنے جانے میں ساتوں سُر لگتے ہیں ۔ اور دونوں مدھم سے گایا جاتا ہے گا ما رے سا ۔ شدھ کلیان کا ثبوت ہے باقی سُر ایمن کے ہیں ۔

آروہی ۔ سا رے گا ما پا دھا نی سا ۔

امروہی ۔ سا نی دھا پا ما گا ما گا رے سا ۔

وادی ۔ نی سمواد ی گا ہے ۔ گانے کا وقت غروب آفتاب کے بعد ہے ۔

گانے کے الفاظ یہ ہیں ۔

گی جاؤ گی سجا لو گی میں موہے جو گی گی رکر وحت نہر دھیان کرو ۔ مورکھ ماورے ۔ جب کرتار کی مہربانی ہو ۔ تب گی لے سانچی تان ۔

طبلہ کے بول ۔ دھاگے دھن ناتا ۔ دھن نا نا ۔ دھن دھن نا ۔ کلیان ٹھاٹ تین تال ۔

راگ عشاق

یہ راگ سب سارنگ اور للت سے مرکب ہے ۔ تا ڈو یعنی چھ سُر جاتے ہیں ۔ اور چھ آتے ہیں ۔ اس میں گندھار نہیں لگتی ۔ سامنے اور پانک سارنگ کی چال ہے اور پاسے سانک بسنت کی چال ہے ۔ یہ راگ گانے میں آسان ہے ۔ اس کا

وادی نرنا ہے اور سم وادی سا ہے۔ دن کے وقت گایا جاتا ہے۔
آروہی۔ اس کی سا۔ رے۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ سا۔ ہے۔
امروہی۔ سا۔ نی۔ دھا۔ پا۔ ما۔ رے۔ سا۔ ہے۔
خیال اس راگ کا ایک تال کا ہے، الفاظ یہ ہیں۔

ساجن دھن ساجن مورن، ساجن راگ ساجن تان
جو کوئی گاوے تال سُر من واکو گنی مان
تال سُر ن سمجھ جانے کال اکالی پہچانے
جو آپ کو جانو ستر و واکو بڑو گیان

راگ موافق

یہ راگ گوڑتی مالتی اور دوگاہ سے بنایا ہے۔ آخر الذکر فارس کا راگ ہے۔ پا اس کا وادی ہے اور سا سم وادی ہے۔ صبح کا وقت گانے میں برا دیتا ہے۔ گوڑتی میں دھا وادی ہے۔ اور مالتی میں رے۔
آروہی۔ اس کی سا رے گا ما پا دھا نی
امروہی۔ سا دھا پا گا رے سا۔
خیال۔ تین تال۔

ن کے پیچھے پیچھے ماورے ایسی من بھاتی ما لو رے۔
تار تانکی نادرانی جھوم رہی سب تن کی ڈاری۔
پن گھٹ کی بہاری ٹھاڑی پھول گئی خسرو بہیا مورکو

راگ غنم

یہ راگ اوڈو اوڈو یعنی پانچ سُر کا ہے۔ پوربی اور ترمینی جس کو تروَن کہتے ہیں، اس سے بہت ملتا ہے۔ پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ امیر نے پوربی راگ میں تھوڑا سا تغیر کر دیا ہے۔ یعنی پوربی میں کڑی مدھم ہے اور اس میں مدھم نہیں ہے۔ بھیروں میں اتری رکھب وادی ہے۔ اور اس میں پا وادی ہے پوربی میں سرگا۔ وادی کہے ہیں۔ یہی فرق ہے تروَن شری راگ کے نام سے گایا جاتا ہے۔ اور اس کی طرز پوربی راگ کی طرح پر ہے۔ گانے کا وقت شام کا ہے۔
آروہی۔ سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ سا۔
امروہی سا۔ نی۔ دھا۔ پا۔ گا۔ رے۔ رے۔ سا۔
خیال راگ غنم تال تین تال۔ الفاظ یہ ہیں۔

ارج سنو موری آج پیر مورے چرن چھوئے
کی لاج راکھو مورے پیارے۔ تمہیں تو بدھاؤ
دیہہ مورے پیر

راگ زیلف

یہ بھیروں ٹھاٹ کا سمپورن راگ ہے۔ اور امیر کی ایجاد ہے۔ عام گوئیے

اس کو کرم گاتے ہیں۔ یہ راگ مشرمل کا ہے اور کئی ٹھاٹ ملا کر بنتا ہے، اسکی آروہی میں کاڑے اور بھیروں کا رنگ دکھلاتا ہے۔ امروہی میں رکھب ورجت ہے دھیوت کا سُر وادی اور گندھار کا سُر سمواوی ہے۔ گانے کا وقت پہلا پہر دن ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ اس میں جونپوری اور رکھنٹ بھی شامل ہے۔ اس لئے اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے۔ اس راگ کو بھیروں سے الگ کرنے کے لئے رکھب کا سُر بہت کمی کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے۔
"سرمایہ عشرت" میں لکھا ہے کہ اس راگ کا ٹھاٹ کا لنگڑے کی طرح رہے یعنی کھرج پنچم، اچل رکھب مدھم اور دھیوت کومل ہیں گندھار اور نکھاد تیور ہیں اور اوچار اس کا دھیوت سُر سے ہوتا ہے۔ اس لئے گانے کا وقت آخر شب ہو سکتا ہے۔
آروہی۔ سا۔ رے۔ گا ما پا دھا نی سا
امروہی۔ سا نی دھا پا دھا ما گا ما سا
ترانہ ٹھاٹ آساوری۔

تال جھپ تال

درد ر توم نادر در توم نادے رے تا تا
نادا رے دانی تا آتوم تا نانے تے نا نا
تے دارے دانی
پائے سگ وسیدہ بوں ملق پر مگسی
گفت ایں سگ گانے گاہے کوئے لیلیٰ رفتہ بود

خیال۔ ٹھاٹ بھیروں، تال تین تال بول یہ ہیں۔

سب گھر آسار بدھاوا لاری بالیاں
پھولن دے سہرا سب جگ میں بھیو اجیارا
سب حضرت حسن یوسف منگل گایو

راگ فرغانہ

یہ راگ دیس کار، دیو سالکھ، گوجری، گونڈ، سرتھی، سندھو، سدھوی، وسنت، مادھونٹ تروَن، کھوپالی اشٹ منگل، بھیروں، ماروا اور بنگال، وغیرہ امام کے راگوں سے زیادہ ملتا ہے۔ گوڑا اور کلی سے یہ راگ مرکب ہے۔
آروہی۔ گن کلی بھیروں ٹھاٹ۔ سا۔ رے۔ ما۔ پا۔ دھا تا۔
امروہی۔ تا دھا پا ما رے سا۔
بھیروں ٹھاٹ کی گوری آروہی۔ سا رے گا ما پا ما دھا نی سا۔
امروہی۔ تا نی دھا ما گا رے سا۔
فرغانہ تین تال بھیروں ٹھاٹ
آروہی۔ سا رے ما گا۔ پا۔ نی۔
امروہی۔ دھا۔ نی۔ سا۔ سا۔ نی۔ دھا۔ پا۔ ما۔ پا۔ گا۔ ما۔

وادی ۔ رکھب ۔ سا ۔
سموادی ۔ ما ۔
گانے کا وقت دن کا ہے ۔

بول

مے صے نظام الدین جگ تارن تاینس پراں کروار ن
خسرو کہے پر بجوا احمد کے پوست تن من اور دھن کرون تارن

راگ سرپردہ

یہ بلاول ٹھاٹ کا سمپورن راگ اور بلاول کی ایک قسم ہے اسکے گانے کا وقت پہلا پہر دن ہے ۔ بعض اس میں گندھار کو وادی مانتے ہیں اور بعض دھیوت کو ۔ کیوں کہ یہ راگ صبح کا مانا گیا ہے، اس میں تو گندھار کا وادی ہونا صحیح نہیں ہے ۔ طرح اور سم وادی سمروادی سُر ہیں ۔

امروہی میں بلاول کی شکل کا ظاہر ہونا ضروری ہے ۔ بیہاگ کی بھی شکل نظر آتی ہے ۔ لیکن بیہاگ میں رکھب درپل یعنی کمزور ہے اور اس میں صاف ہے ۔
بعض کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ راگ ایمن ایا اور گوڑ سے مرکب ہے ۔
آروہی ۔ سارے گا ما دھا پا دھا نی سا ہے ۔
امروہی ۔ سا نی دھا پا نی دھا پا ما گا ما رے سا ہے ۔
خیال راگ سرپردہ تال تین تال ۔ بول یہ ہیں ۔
" سلطان جی صاحب نظام الدین اولیا تو ہے
بل بل جاؤں موہے پیر لوسوں دیا چرن تیرے
گئے خسرو پایا میں نے ایسا الیسو پیر مورے تم نظام الدین اولیاء "

راگ باغرو

اس میں ایک راگ فارسی شامل ہے ۔ جس کے نام کا پتہ نہیں چلا ۔ اس میں گا وادی اور دھا سموادی ہے ۔ گانا آسان ہے ۔ اس راگ کا کوئی خاص وقت معین نہیں ہے ۔ راگ سمپورن ہے ۔
آروہی ۔ سارے گا ما پا نی سا ہے ۔
امروہی ۔ سا نی دھا پا ما گا رے سا ہے ۔
خیال راگ باغرو تین تال الفاظ یہ ہیں ۔
دل من دل من دل من این آوارہ ۔ دل من
پارہ پارہ دل من، این بے چارہ ۔ دل من
دل من دل من دل من این دیوانہ دل من عاشق
جاناں دل من، این پروانہ دل من
خسرو در عشق خراب، ہم چو ماہی بہ سراب ہو تے
دل من بہ شتاب ۔ این دیوانہ دل من

راگ صنم

یہ راگ کلیان اور بلاول کو ملا کر بنایا گیا ہے ۔ بعض کا یہ بھی خیال ہے کہ ایمن کلیان اور ایک فارسی راگ ہے جس کو نوروز اور نورچکا بھی کہتے ہیں یہ راگ آسان بھی ہے اور مدھر بھی ۔ شدھ سارنگ اور نام کلیان سے ملتا ہے ۔ مگر آج کل تو شدھ سارنگ مروج ہے اس میں کومل نی یعنی نکھاد اور تیور گندھار نہیں ہے ۔ کافی ٹھاٹ کی مانند کومل گندھار اور کومل نکھاد ہے پس ان دونوں سروں کا شدھ سارنگ میں نہ ہونا اس راگ کو قاعدہ میں سہی منے دیتا ہے ۔ شدھ سارنگ میں گندھار نہیں ہے اور صنم میں گندھار مدھر ہو کر موجود ہے ۔ شدھ سارنگ میں کومل نکھاد لوادی سُر ہے صنم راگ میں یہ سُر لگانے نام ہے ۔ شدھ سارنگ کا بیان یعنی حاتم (نی) پر ہے اور اس میں (رے) پر ہے تمام کلیان اور شدھ سارنگ میں دونوں مدھم ہیں اور اس میں بھی دونوں مدھم ہیں ۔ اس طرح پر آروہی میں تیور اور امروہی میں کومل ہے، شدھ سارنگ اوڈو اوڈو یعنی پانچ پانچ سُر کا راگ ہے اور صنم شاڈو سمپورن ہے ۔ یعنی چھ سات کا ۔
آروہی ۔ سارے ما پا دھا نی سا ۔
امروہی ۔ سا نی دھا پا ما گا ما رے سا ۔
گانے کا وقت رات کا ہے ۔
خیال صنم ایک تال ۔ الفاظ یہ ہیں ۔
" اندھیری گھٹا کالی جس چراغ علاج دل ناکس خسرو کہے پائے "
خیال دیگر صنم تین تال الفاظ یہ ہیں ۔
نظام الدین پیر اولیا نظام الدین شان انما خسرو
آن پڑے جرن میں کہ پاکر دہسر کبریا

راگ زنگولہ

اس راگ کا تعلق دو راگوں سے ہے یعنی بھیروں اور آساوری اس لئے اس میں دونوں دھنیں لگائی جاتی ہیں ۔ مگر شدھ دھیوت کی کے ساتھ لگتی ہے جس میں بلاول کی صورت نظر آتی ہے مگر اصلی رنگ بھیروں ہی کا رہتا ہے ۔ گانے کا وقت صبح کا ہے ۔ اس میں دھا وادی ہے اور رے سموادی ۔
آروہی ۔ سارے گا ما پا دھا نی سا ۔
امروہی ۔ سا نی دھا پا ما گا رے سا ۔
خیال ۔ ایک تال بھیروں ٹھاٹ
من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی
سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی
دھرپد راگ زنگولہ آساوری ٹھاٹ تال ایک تال
بھور بھئی سکھی ری پل کا ہے، کوکرت ہے آئی چور اچائی رے ۔ سات سکھی مل منگل گاویں ہوویں چوک پرا اور چاور ے ۔
انترہ دیگر بیمائی متان میں رے تم بھو بایک خسرو کرت استنی گن گا پورے ۔
من شمع جاں گدازم تو صبح دل کشائی ۔ سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی

ماہرؔ القادری

اے شہنشاہِ تغزل اے امامِ فکر و فن ۔۔۔ تیرے شعروں کی روانی موجۂ گنگ و جمن
اللہ اللہ تیری غزلوں کا مزاجِ رنگ و بُو ۔۔۔ جس طرح غنچے کنول کے، جیسے گلہائے سمن
تیرا لہجہ نغمگی کی روح، موسیقی کی جان ۔۔۔ لفظ و معنیٰ کی جوانی تیرا اندازِ سخن
سعدیؔ و حافظؔ کی صف کے شاعرِ شیریں نوا ۔۔۔ تو کہ اپنی ذات سے تھا فارسی کی انجمن
بس ترے خوانِ کمالِ شعر کے زلّہ ربا ۔۔۔ رند ہو یا پارسا ہو، شیخ ہو یا برہمن
امتزاجِ شعر و نغمہ، ربطِ آہنگ و نوا ۔۔۔ ہے اسی فن کی بدولت اتحادِ جان و تن
کہہ مکرنی ہو پہیلی ہو کہ ہوں وہ لوگ گیت ۔۔۔ طفلِ اُردو کو پہنایا تو نے پہلا پیرہن
تو ہے خود اپنی جگہ شعر و سخن کی روشنی ۔۔۔ جگمگا اٹھے ترے افکار سے کوہ و دمن
نُدرتِ لفظ و بیاں بھی، جدّتِ تخئیل بھی ۔۔۔ ہے سلاست میں نزاکت سادگی میں بانکپن
مُوجدِ عشاق اے نغمہ نواز و نغمہ گر ۔۔۔ راگنی دیوی نے خود آ کر چھوئے تیرے چرن
صاحبِ فکرِ رسا اے شاعرِ شیریں نوا ۔۔۔ ہر غزل کا تیری مطلع صبح کی پہلی کرن
تیری پرگوی کی مل سکتی نہیں شاید مثال ۔۔۔ شعر خود ہوتے تھے موزوں ارتجالاً دفعتن
بحرِ عرفاں کے شناور صاحبِ حال و مقام ۔۔۔ تیرے دم سے لہلہا اٹھا طریقت کا چمن

آمدم در بارگاہت نغمہ سنج و مدح خواں
ہدیۂ از من بگیرا اے خسروِ ملکِ سخن

جمیل مظہری

یہ کس کے ذہنِ رسا کے سائے میں پل رہے ہیں نئے تصور
یہ کس کے جوشِ عمل کے سانچے میں ڈھل رہا ہے نیا زمانہ

یہ کس کے افسونِ ادعا نے طلسم صدیوں کے توڑ ڈالے
اجڑ گئیں ساری بارگاہیں، پلٹ گیا سارا کارخانہ

نہ وہ سیاست کے آشیانے، نہ وہ شریعت کے آستانے
نہ وہ ہوس کے قمار خانے، نہ وہ خرد کا نگار خانہ

تصورِ رنگ و بو بھی بدلا، طبیعت آب و گل بھی بدلی
فسانے بننے لگے حقیقت حقیقتیں بن گئیں فسانہ

جو راکھ کے ڈھیر رہ گئے ہیں وہ اب اٹھیں گردِ راہ بن کر
ہوا کی رفتار کہہ رہی ہے کہ قافلہ ہو چکا روانہ

مجھے چراغوں میں روشنی ہے، نشیلی آنکھوں کی نیند اڑی ہے
جمیل کی بانسری نے چھیڑا ہے شام سے صبح کا ترانہ

ساغر نظامی

ادب اے جہانِ حاضر یہ ہے بزمِ خسروانہ
ہے یہاں ازل ترنم، ہے ابد یہاں ترانہ
ہے ہر اک گدا کو حاصل غمِ عشق کا خزانہ
کہ رموزِ فقر سمجھے مرا خود غرض زمانہ
ترا نقشِ پا جہاں تھا وہیں اک آستانہ
کہ اگل دیا زمیں نے کوئی گمشدہ خزانہ
کبھی آہِ صبح گاہی کبھی نالۂ شبانہ
ہے وظیفۂ مسلسل ترا سوزِ عاشقانہ
تری انگلیوں میں بربط تری جنبشوں میں نغمے
ترا ہر نفس ترنم، ترا ہر نفس ترانہ
نہ یہاں ہے کوئی ہندو، نہ یہاں کوئی مسلماں
کہ ہے کعبۂ محبت ترا سنگِ آستانہ
ہو مبارک آسماں کو یہ فروغِ ماہ و انجم
کہ ہے کہکشاں سے بڑھ کر تری خاکِ آستانہ
نہ ٹھہر سکا جبیں میں مری بندگی کا طوفاں
جو فضا میں جگمگایا ترا سنگِ آستانہ

مظفرالدین خاں

(۱)

اے ہند کی اقلیمِ سخن کے مختار
حافظ نے کیے تھے حفظ تیرے اشعار
تو طوطیِ ہند ہے امیرِ خسرو
آتی ہے ترے نام سے گلشن میں بہار

(۲)

تو ہند میں ہے ملکِ سخن کا بانی
ہے زیب تجھے خسروی و سلطانی
ایران میں سکے کا چلن ہے تیرے
تھا تیرا لقب مہد میں بھی خاقانی

(۳)

ہے عشق ترے خاتمِ ہستی کا نگین
دیپک کی طرح سانس ہے آتش آگیں
تو شیخ میں اس طرح فنا ہے خسرو
ہیں تجھ میں فنا جیسے نظامِ حق ہیں

جگن ناتھ آزاد

السّلام اے شاعرِ روشن دل و روشن ضمیر　　السّلام اے کاروانِ عشق و مستی کے امیر
اے امیرِ ملکِ معنی، خسروِ دنیائے شعر　　تیرے سوزِ دل سے تاباں چہرۂ زیبائے شعر
تاجدارِ کشورِ الفاظ و اسلوب و بیاں　　دل ترا گنجینۂ معنی ہے لب گوہر فشاں
سرزمینِ ہند کے اے نے نوازِ پاک زاد　　آج بھی تیری غزل میں ہے نہاں دل کی کشاد

اے بہارِ رنگ و بوئے بوستاں تجھ پر سلام
اے وقارِ کشورِ ہندوستاں تجھ پر سلام

ذات تیری بہر دیں　　مال و دولت کی حصول
"نعم مال صالح" ہے گفتۂ پاکِ رسول
عام اہلِ زر سے اونچا تھا کہیں پایہ ترا　　درحقیقت فقر کی دولت تھا سرمایہ ترا
فقر یعنی اک نگاہِ راہ بیں، اک زندہ دل　　روح آزاد علائق، جسم اسیرِ آب و گِل
فقر یعنی مستی کردار و تسلیم و رضا　　دوسرے الفاظ میں گویا متاعِ مصطفےٰ

بسکہ مبنی فقر ہی پر تھی تری تطہیرِ فکر
نور کا پیکر غزل میں ہے تری تعمیرِ فکر

آشنائے رازِ ہستی، واقفِ ہر خیر و شر　　دل کی دنیا ہے ترے افکار سے زیر و زبر
صبر کا شیشہ تری ضربِ سخن سے ریز ریز　　تیرے نغمے سے گریبانوں میں پیدا رستخیز
جب تڑپ اٹھتا ہے تیرے شعر پر جذبِ دروں　　کم نظر اس کو سمجھتے ہیں فقط جوشِ جنوں
فلسفے والے نہ سمجھیں گے کبھی یہ رازِ دل　　گوشِ ظاہر تک پہنچتی ہے کہاں آوازِ دل
خاکِ تیرہ کو سراپا نور کر دیتا ہے تو　　پردۂ انوار میں مستور کر دیتا ہے تو

رُوح یوں پاتی ہے تیرے فیض سے سوزِ دروں
مہر سے جس طرح پاتی ہے رگِ گل موجِ خوں

سید غلام سمنانی

ترے ہی ذکر سے، یہ نظم و اہتمامِ سخن — ترے ہی حرف سے، شیریں ہوا ہے کامِ سخن
سپہرِ شعر ہوا، تجھ سے مطلعِ انوار — تو شمعِ بزمِ سخن ہے، تو مہرِ بامِ سخن
کہا ہے ژرف شناسانِ شعر نے تجھ کو — خدیوِ مملکتِ شاعری، امامِ سخن
ترے خیال سے، آرائشِ رخ و گیسو — تجھی سے صبحِ سخن ہے، تجھی سے شامِ سخن
ہے ترے ذکر سے معمور، محفلِ شیراز — بلند تجھ سے ہوا کس قدر مقامِ سخن
کسی کا فیض نظر ہے شریکِ حال ترا — ملی ہے تجھ کو جو یہ دولتِ دوامِ سخن
تری بہارِ سخن، گل فروشِ دشت و چمن — ہر اک دیار پہ برسا، ترا غمامِ سخن
ہے تری بزم میں، پاکوب، شاہدِ معنی — ہے ترے قدموں میں، محبوبِ لالہ فامِ سخن
ہر ایک تار ہے سازِ سخن کا، زخمہ فریب — نہ اعتبارِ سخن ہے، نہ احترامِ سخن
ہیں جرعہ خوار ترے کب سے تشنہ و محروم — نہیں ہے کوئی جو گردش میں لائے جامِ سخن

اٹھ اور اپنے اس اعجازِ خسروی سے ذرا
درست، از سرِ نو، کر دے تو نظامِ سخن

سلام مچھلی شہری

زمیں پر اگر دیوتا کچھ نہ ہوتے تو انساں شاید پریشان ہی رہتا
نظارے تو ہوتے بہاریں تو ہوتیں مگر گلشن فکر ویران ہی رہتا

حقیقت کا مفہوم واضح نہ ہوتا اگر دلنشیں کلپنائیں نہ ہوتیں
کوئی خاص منظر نکھر ہی نہ پاتا جو اس کے لئے کچھ فضائیں نہ ہوتیں

حقیقت کی ان ضوفشاں منزلوں میں، حسین خواب اب مسکرانے لگے ہیں
بزرگوں نے جو دیپ روشن کئے تھے وہی دیپ پھر جگمگانے لگے ہیں

کلا اور سنگیت کے دیپ پھر سے مقدس فضاؤں میں جلنے لگے ہیں
زہے عہد حاضر کہ حافظ کے بربط پہ میرا کے نغمے مچلنے لگے ہیں

مبارک کہ وادیٔ گنگ و جمن میں کلا کو نئی زندگی مل رہی ہے
مبارک کہ پھر طوطیٔ ہند خسرو کے افکار کی روشنی مل رہی ہے

نئی روشنی میں نئے تاج محلوں، اجنتاؤں کا جنم ہونے لگا ہے
ہمارے کلا مندروں سے قریب آج پھر پیار کا دھرم ہونے لگا ہے

ملی ہے ضیاء بار تعبیر جس کی وہی خواب پہلے بھی دیکھا گیا تھا
مبارک وطن کی سحر کہہ رہی ہے کہ آفتابوں کا اک سلسلہ تھا

شمیم کرہانی

مرحبا، خسروِ نوا گستر — طوطیِ ہند، نغمہ سنجِ بہار
ذہنِ خلّاق کا ہر ایک عمل — فکر و معنی کا قافلہ سالار
رزم میں بے عدیل ترک جری — بزم میں بے نظیر موسیقار
مصحفِ نظم، روشِ گلشن — صفحۂ نثر، غیرتِ گلزار
اس کی ہر بیت، اک شگوفۂ زر — اس کا ہر شعر، اک دُرِ شہوار
ہر رباعی میں زندگی کے رموز — ہر پہیلی میں ذہن کے اسرار
غزل اس کی لطیف تر ایسی — جیسے پھولوں کی نرمیِ رخسار
کافرِ عشق و صوفیِ صافی — بندۂ حق پرست و سجدہ گزار
عارضِ فن پہ غازہ و تابش — چہرۂ زندگی پہ گرد و غبار
بزمِ حرف و سخن میں نغمہ سرا — عشقِ محبوبِ حق میں سینہ فگار
اہلِ ایراں کو اعتبار آیا — ایسا محکم زباں کا معیار
بند راحت کے راستے لیکن — منکشف دو جہاں کے اسرار
سرزمینِ وطن میں جذب ہوا — ایسا رکھتا تھا خاکِ ہند سے پیار

تجھ پہ اربابِ فکر و فن کا سلام
قصرِ اُردو کے اوّلیں معمار

بشیر النساء بیگم بشیر

ہ

اے عندلیب خوش نوا پروانہ نظامِ دیں   روحانیت نواز ہے تیرا کلامِ دل نشیں
سلسلۂ نظامیہ ہے داستانِ خسروی

مردِ حقیقت آشنا تھا آستاں پہ بدگماں   اور واردات قلب تھے شیخِ طریق پر عیاں
کس درجہ ناز آفریں تھا امتحانِ خسروی

دل ایک ہی نگاہ میں محرمِ راز بن گیا   اور اک کبوتر حزیں دم بھر میں باز بن گیا
عشق کی ایک جست میں بدلا جہانِ خسروی

درویشِ بے مثال تو شاعر بے نظیر تو   نازشِ خانقاہ تو نورِ نگاہِ پیر تو
فقر کی آن بان پر قائم ہے شانِ خسروی

ہند و تتار و پارس کو شیر و شکر بنا دیا   سب کی زبان سے تو نے اک جادو نیا جگا دیا
اُردو زباں کی جان ہے اب تک زبانِ خسروی

فرما رہا ہے پیر ہی شان میں، یہ مُرید کی   من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
محبوبِ حق کی جان تھی لاریب جانِ خسروی

دامودر ذکی

خوبی و خلق کا حسیں پیکر — علم و فن کے کمال کا منظر
شاعرِ بے مثال، شیریں سخن — خوش گلو راگ، تال کا بہتر
ڈھولک اور جلترنگ اور ستار — ان کا موجد "خیال" کا معمار
عاشقِ دیں و صاحبِ عرفاں — تھا دل اولیا رہیں جن کا گھر
مہرباں جن پہ تھے نظام الدینؒ — اور شکستوں کا تھا یہاں نہ گذر
حسنِ الفت، خلوص کی تصویر — دین و ایماں کی روح کا منظر
گود میں جس کی گربیاست کے — ہو رہے تھے جوان پل پل کر
زینتِ کیف و آبروئے سپاہ — زینتِ بزم و آبروئے ہنر
سب کی نظروں میں قدر کے قابل — سب کے دل میں بنا ہے جن کا گھر
ایک اوجِ مزاح دانی وہ — جس سے واقف تھے سارے اہلِ نظر
اور درباداریاں دن رات — جن پہ کرتی رہی تھیں فخر اکثر
جن پہ ہر دل عزیزیاں تھیں نثار — اور محبّت کو ناز تھا جن پر
وضع داری کو عشق تھا جن سے — پیار خود داریوں کو تھا یکسر

فیض پاتے تھے سب بقدرِ ظرف
ایک جا جمع تھے بہت سے ہنر

شہباز صدیقی امروہوی

اے امیرِ نامور اے خسروِ عالی وقار　　صدرِ بزمِ عارفاں، ملکِ سخن کے شہریار
علم و عرفاں کا ہے تو دریائے ناپیدا کنار　　حکمت و دانش کو تیری ذات پر ہے افتخار
تیرا ثانی کم ہی دیکھے گی یہ دنیا اب کہیں
"عمرہا باید کہ فخرِ روزگار آید چنیں"

گرم ہے تیرے نفس سے محفلِ شعر و سخن　　شاعروں کی مجلسوں میں تو ہے صدرِ انجمن
زمزموں میں ہے ترے وہ طرفگی و بانکپن　　دم بخود ہے جن کو سن کر طوطیِ شکر شکن
چہکے بلبل کیا تری رنگیں بیانی دیکھ کر
خوش نوائی، نغز گوئی، نغمہ خوانی دیکھ کر

جملہ اصنافِ سخن پر ہے ترا انعام عام　　مرثیہ، قطعہ، رباعی میں ہے نامی تیرا نام
انوری کا تجھ کو حاصل ہے قصیدہ میں مقام　　عطر آگیں ہے غزل سے تیری سعدی کا مشام
تیرا خمسہ جو نظامی کے ہے خمسہ کا جواب
آج تک ہے بے ہمال و لاعدیل و لاجواب

ہر پہیلی ہے تری طبعِ رسا کا شاہکار　　تیرے دو سخنے ہیں گویا زعفراں کے کشت زار
تیری انملیاں دکھاتی ہیں جدا اپنی بہار　　کہہ مکرنی کا تری کہہ کر مکرنا ہے شعار
کس قدر دلچسپ ہے پنگھٹ پہ تیرا وہ ڈھول
جس میں باہم ہیں جتن سے چرخا، کتا، کھیر، ڈھول

مرثیہ قاآن کا تو نے لکھا وہ درد ناک — قلبِ بلبن ہوگیا فرطِ الم سے چاک چاک
پھاڑ کر جیب و گریباں ڈالی فرق و رُخ پہ خاک — ہوگیا آخر جواں فرزند کے غم میں ہلاک
واہ وا گفتار میں تیری اثر کا یہ کمال
راست تو یہ ہے اسی کا نام ہے سحرِ حلال

شاعری پر تیری کیوں نازاں نہ ہو ہندوستاں — ذاتِ سامی ہے تری معروف و مشہورِ جہاں
مستند اس درجہ تیری فارسی ہے بے گماں — لیتے ہیں اشعار سے تیرے سندِ اہلِ زباں
مرزا غالبؔ جو کسی ہندی کا قائل ہی نہیں
خاک پر گھستا ہے تیرے روبرو لوحِ جبیں

تو نے فلکِ ہند میں اُردو کی ڈالی داغ بیل — فارسی، ہندی کا آپس میں کرایا خوب میل
ابتدا میں شغل تیرا گو نظر آتا تھا کھیل — لیکن آخر میں منڈھے چڑھ ہی گئی بولی کی بیل
ہندوی و ریختہ بنتی ہوئی اردو بنی
جو کرے ہر قلب کو تسخیر وہ جادو بنی

گائکی کے فن میں اپنے عہد کا ہے تو امام — مطربانِ دہر لیتے ہیں ادب سے تیرا نام
اللہ اللہ قصرِ موسیقی میں تیرا یہ مقام — راگنی لونڈی ہے تیری راگ ہے تیرا غلام
با ابد بھی تیرے آگے بار پا سکتا نہیں
تان کوئی تان سین اپنی لگا سکتا نہیں

مختلف آلات موسیقی ہیں تیری یادگار — تیری ہی ایجاد کا ثمرہ ہے طبلہ اور ستار
آئی تیری سعی سے نغمہ نوازی میں بہار — تیرے ممنونِ کرم ہیں مطربانِ روزگار
سرنگوں تھے راگ کے طائر جو فرشِ خاک پر
پر سے سَم اور تال کے اڑنے لگے افلاک پر

سینۂ شفّاف تیرا "مخزنِ اسرار" ہے — روحِ جاں افروز تیرا مطلعِ انوار ہے
قلب تیرا نورِ ایماں سے تجلّی زار ہے — چشم تیری بادۂ دیدار سے سرشار ہے
نورِ حق سے سر بسر معمور ہے تیرا دماغ
خانۂ عرفاں کا تو ہے ایک تابندہ چراغ

گوناگوں اوصاف کا ہے ذات میں تیری قرآں　　فقر کا انداز ہے شانِ امارت سے عیاں
مرحبا یہ عسرت و عشرت کا دوگونہ سماں　　دلقِ درویشی بھی ہے ملبوس شاہی میں نہاں
بارگاہوں میں کبھی شاہوں کا تو دمساز ہے
خانقاہوں میں کبھی ولیوں کا تو ہمراز ہے

جب ہوئی صحبت نظام الدین کی تجھکو نصیب　　جاگ اٹھے برکت سے انکی تیرے خوابیدہ نصیب
رفتہ رفتہ ہو گیا مرشد سے تو اتنا قریب　　تجھ کو محبوب الٰہی نے کہا اپنا حبیب
شیر و شکر پھر توں مطلوب اور طالب ہوئے
اہل باطن کہہ اٹھے یکجان دو قالب ہوئے

جرأت و ہمت یہ تیری حبذا صلِّ علیٰ　　دین کی خدمت بھی کی دنیا سے مطلب بھی رکھا
معرفت کی راہ میں ہر مرحلہ بھی طے کیا　　شغل میں تصنیف کے بھی محو روز و شب رہا
کام لے کر آخر اپنے خسروی اعجاز سے
لکھے ملفوظاتِ مرشد دل ربا انداز سے

بزم اہل حال میں ہوتا ہے جب تو نغمہ زن　　وجد کے عالم میں آجاتی ہے ساری انجمن
نشہ ہو جاتا ہے دنیا کی محبت کا ھرن　　دل کو لگ جاتی ہے معشوقِ حقیقی کی لگن
تیرا نغمہ اس لئے تاثیر سے خالی نہیں
شرع کے حلقہ سے باہر تیری قوالی نہیں

الفت پیر طریقت میں نہ تھا تیرا جواب　　مرگ مرشد کی خبر سن کر نہ آئی تجھ کو تاب
چل کے بنگالہ سے پہنچا شہر دھلی میں شتاب　　تربت محبوب پر گریاں رہا مثلِ سحاب
چھ مہینے شور و شیون کر کے ساکت ہو گیا
چادر خاکی میں اپنا منہ چھپا کر سو گیا

مقصود سبزواری

یہ کون شمع تصوف جلا کے چھوڑ گیا
کہ جگمگا گئی شاموں کو شامِ پٹیالی
دیا تو ایک سرِ رہگذر جلا تھا مگر
سمیٹ لایا تھا صدیوں کی دیوالی
مہک مہک گئے تاریخ کے ورق جس سے
نہ تھا وہ ظلِّ سلاطینِ تغلق و خلجی
وہ کوئی نکہتِ بے قید بوئے آوارہ
چلی تو ساری ہوائیں بنا دیں سودائی
چراغِ گل کہ گل روشنی کہو اس کو
وہ رنگ و نور ہی اک دن امیرِ خسرو بنا
رہِ سلوک و طریقت میں اس کا پہلا قدم
تمام بیتی ہوئی منزلوں سے آگے تھا
جو دن میں بنتا تھا عکسِ جلالِ سلطانی
وہ شب میں گیسوئے سلطان الاولیا بھی رہا
بہ ایں جمالِ بصیرت بہ حُسنِ دامنِ شوق
بہت کٹھن تھی ڈگر اس کے حق میں پنگھٹ کی
اسی حبیب کی خاطر کئے تھے سولہ سنگھار
اسی نظام نے رکھی تھی لاج گھونگٹ کی
وہ شاعری تھی کہ شیراز و اصفہان کا دل
جبینِ ہند پہ سجدے ہیں اہلِ فارس کے
وہ ہندی دوہے پہیلی وہ کہہ مکرنی کا فن
ہزار جھانکتے آنچل سے چاند ماوس کے
وہ بھیرویں وہ حسیں راگنی وہ سُر سرگم
کہ رستے دھارے گلے سے نکلتے سب رس کے
کلام چارۂ سفاکیٔ جہاں اس کا
خموشی پردۂ دشتِ سکونِ جاں اس کا
حریمِ نیم شبی میں وہ شعلۂ آواز
نوائے سوزِ جگر شمع اور دھواں اس کا

ادب تصوف و نغمہ یہ احترام کریں
کہ آستانۂ خسرو کو سب سلام کریں

وہ ترکستان کے لاچینی قبیلہ کا دُرِ یکتا
بلخ کی دل کشا بستی ہزارہ میں ہوا پیدا

تھا نام اُس کا امیر سیف الدین محمود نیک اختر
سیاست میں، تدبر میں نہ تھا اس کا کوئی ہمسر

بہا لایا اسے ہندوستاں میں سیل تاتاری
سکونت کو ضلع ایٹہ میں پٹیالی پسند آئی

یہ شمس الدین التمش کا دورِ حکمرانی تھا
یہ دورِ اہلِ ہنر کے حق میں دورِ دُر فشانی تھا

ہوا اس کے تدبّر کا جو چرچا بزمِ یاراں میں
رسائی ہوگئی موصوف کی دربارِ سلطاں میں

ملا سلطانِ عالیجاہ کو جب گوہرِ یکتا
لیا دامانِ رحمت میں بڑھایا مرتبہ اس کا

مدد کی ہر طرح سلطاں کی توسیع ریاست میں
ترقی مملکت نے خوب کی اس کی معیت میں

ولیٔ باصفا حضرت عماد الملک کی دختر
امیر سیف الدین کے عقد میں آئی جواں ہوکر

ہوئے اس کے بطن سے تین لڑکے نیک خو پیدا
وہ عز الدین، یمین الدین، حسام الدین گلِ رعنا

ہوئے پیدا یمین الدین چھ سو اکاون میں
مطابق عیسوی سن کے وہ بارہ سو ترپن میں

محلہ میں قریب ان کے کوئی مجذوب رہتے تھے
جناب سیف اس ہستی سے بیحد انس رکھتے تھے

ہوئے پیدا یمین الدین تو ان کو گود میں لے کر
چلے حضرت کی خدمت میں دعائے خیر کی خاطر

لیا آغوش میں، دے کر دعائے خیر فرمایا
"یہ خاقانی سے آگے شاعری میں دو قدم ہوگا"

یہی بچہ، یمین الدین، امیر خسرو کہلایا
سخن گوئی و موسیقی میں اعلیٰ مرتبہ پایا

تھے چار ہی سال کے خسرو کہ انکے والدِ اطہر
پئے تعلیم اپنے ساتھ دہلی لے گئے آکر

طلب کے ساتھ ہی ذوقِ حصولِ علم تھا کامل
اسی باعث اوائل عمر ہی میں ہو گئے فاضل

شغف تھا شعر و موسیقی سے زیادہ فطرتاً ان کو
کئے اشعار موزوں سات سالہ عمر میں دیکھو

ابھی نو سال ہی کے تھے کہ والد نے لڑائی میں
بڑی مردانگی سے جان دی شہ کی حمایت میں

عماد الملک نے لی اپنے ذمہ تربیت ان کی
علوم ظاہری کے ساتھ دی تعلیم باطن بھی

یہاں حضرت نظام الدین کی صحبت ملی ان کو
بالآخر بیعت کر کے دیدیا دل پیر کامل کو

عماد الملک بارہ سو تہتر میں ہوئے واصل
اور اس کے بعد خسرو کو ہوئی فکر معاش ابدل

وہ ہمدرد و مساکیں، منکسر، صوفی منش خسرو
تعصب سے بری، حضرت نظام الدینؒ کے پیرو

رفاقت میں، حمایت میں، سخاوت میں، مروت میں
وہ یکتائے زمانہ تھے شجاعت میں، سیاست میں

خوش اخلاقی و ہمدردی، مساوات و صلح جوئی
ذہانت، دینداری، بذلہ سنجی، نغمہ آرائی

ان اوصاف حمیدہ سے رہا متصف ابدل
عوام و خاص میں ہوتی نہ کیوں مقبولیت حاصل

انھیں اوصاف کے باعث امیر و شاہ و شہزادے
مصاحب، میر خسرو کو بنا لینے کے خواہاں تھے

رہے دو سال تک خسرو ملک چھجو کے درباری
کرلی، بعد اس کے بغرا و محمد کی مصحف داری

کیا بارہ سو چوراسی میں منگولوں نے اک حملہ
شہادت پائی شہزادہ محمد نے سبحان اللہ

محمد کی شہادت پر لکھا اک مرثیہ ایسا
ہوا جس کا جہانِ علم و فن میں ہر طرف چرچا

پھر اس کے بعد سرجاندار نے ان کو بلا بھیجا
بڑھائی عزت و حرمت، ندیم خاص فرمایا

اسی کے نام پر تخلیق کی ہے اسپ نامہ کی
فقید المثل یہ تصنیف ہے اپنے زمانہ کی

ہوا رونق فزا جب کیقباد اورنگ شاہی پر
لکھائی "قران السعدین" مثنوی خسرو سے خوش ہو کر

نوازش کی، ملک الشعرا کا بخشا خطاب ان کو
ندیم خاص فرمایا، نوازا بے حساب ان کو

وزاں پس قتل کیقباد شمس الدین کیمورث
برائے نام تھا سلطان و تخت و تاج کا وارث

مربی و اتالیقی میں اس کمبخت کو لے کر
جلال الدین خلجی نے سنبھالا اقتدار آخر

دیا خسرو کو اس نے پہلے مصحف دار کا عہدہ
پھر اس کے بعد امارت دے کے اونچا کر دیا درجہ

جلال الدین کے جنگی کارناموں پر یہ چھوٹی سی
لکھی ہے مثنوی خسرو نے مفتاح الفتوح ایسی

ہے جسکی حیثیت اب تک بھی تاریخ و سیاست میں
ادب میں خوب تر ہے یہ تو لاثانی صداقت میں

علاؤالدین و قطب الدین مبارک شاہ نے پیہم
جناب میر خسرو کی رکھی وہ حیثیت قائم

دلیل بے ضمیری پیشۂ دربار داری تھا
ملی غیرت کہ خسرو کا رویہ بردباری تھا

نظر دربار کے ماحول پر رکھتے تھے اکثر
نہ تھے وابستگی یک رخہ کے قائل و خوگر

انھیں الفت تھی ہر دم زیست کے اقدار اعلیٰ سے
اسی باعث تو ان کی زندگانی میں تنوع ہے

رکھی شاہانِ دہلی نے عنایت کی نظر ان پر
وجہ یہ تھی کہ وہ پہچانتے تھے شاہ کے تیور

نہ رکھتے تھے کبھی باہر قدم حدِ امارت سے
ابھرنا جانتے تھے ڈوب کر بحرِ سیاست میں

بظاہر منہمک دربار داری میں رہے خسرو
مگر تھے اصل میں وہ معرفت کی راہ کے رہرو

سلاطین کو فرائض سے کیا کرتے تھے وہ آگاہ
نمائندہ تھے وہ حضرت نظام الدین کے درگاہ

سلاطیں سے عوام الناس کی حاجت روائی کو
روا مرشد کے کہنے پر رکھا مدحت سرائی کو

مشن حضرت نظام الدین کا پورا کیا جس نے
سلاطین کو عزیزوں کا کیا حاجت روا جس نے

بہت ہی ناز تھا حضرت کو ان کی ذات والا پر
بہت مسرور ہو ہو کر کہا کرتے تھے اکثر

جو پوچھے گا خدا روزِ جزا لایا ہے کیا تحفہ
تو کہہ دوں گا یہ خسرو ہے مرے اعمال کا ثمرہ

ہوئی تیرہ سو پچیس میں نظام الدینؒ کی رحلت
سیہ پوشی میاں خسرو کی آخر ہو گئی قسمت

نہ تھی تابِ جدائی چھ مہینہ بعد ہی آخر
چلا سوئے عدم وہ فارسی کا بے بدل شاعر

تھی ان کو جملہ اصنافِ سخن پر دسترس حاصل
مگر غزلیں ہیں ان کی بے پناہ تاثیر کی حامل

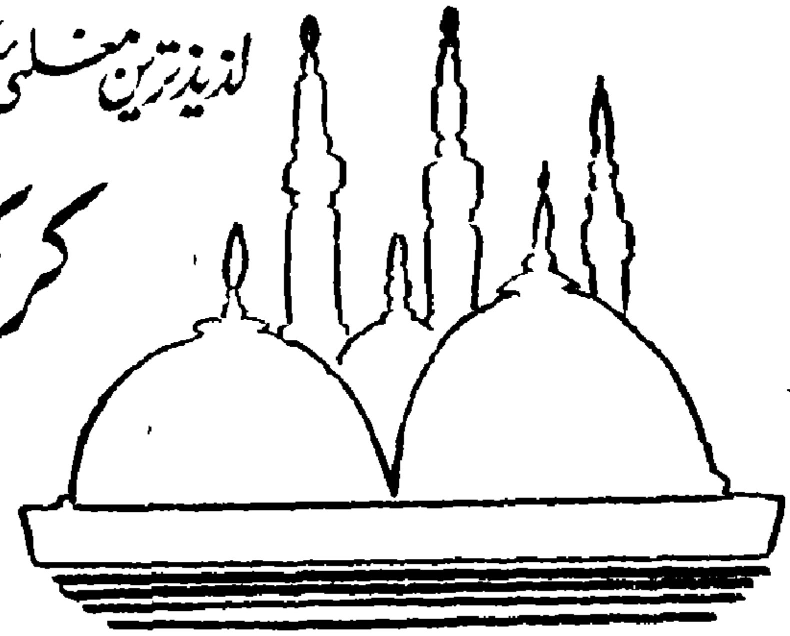
زباں ہے مستند، طرزِ ادا ہے دلکش و زیبا
سلاست اور روانی میں ہیں اک بہتا ہوا دریا

کلام حیران کن شہ کار ہے اوجِ تخیل کا
جسے پڑھ کر پتہ چلتا ہے معراجِ تعقل کا

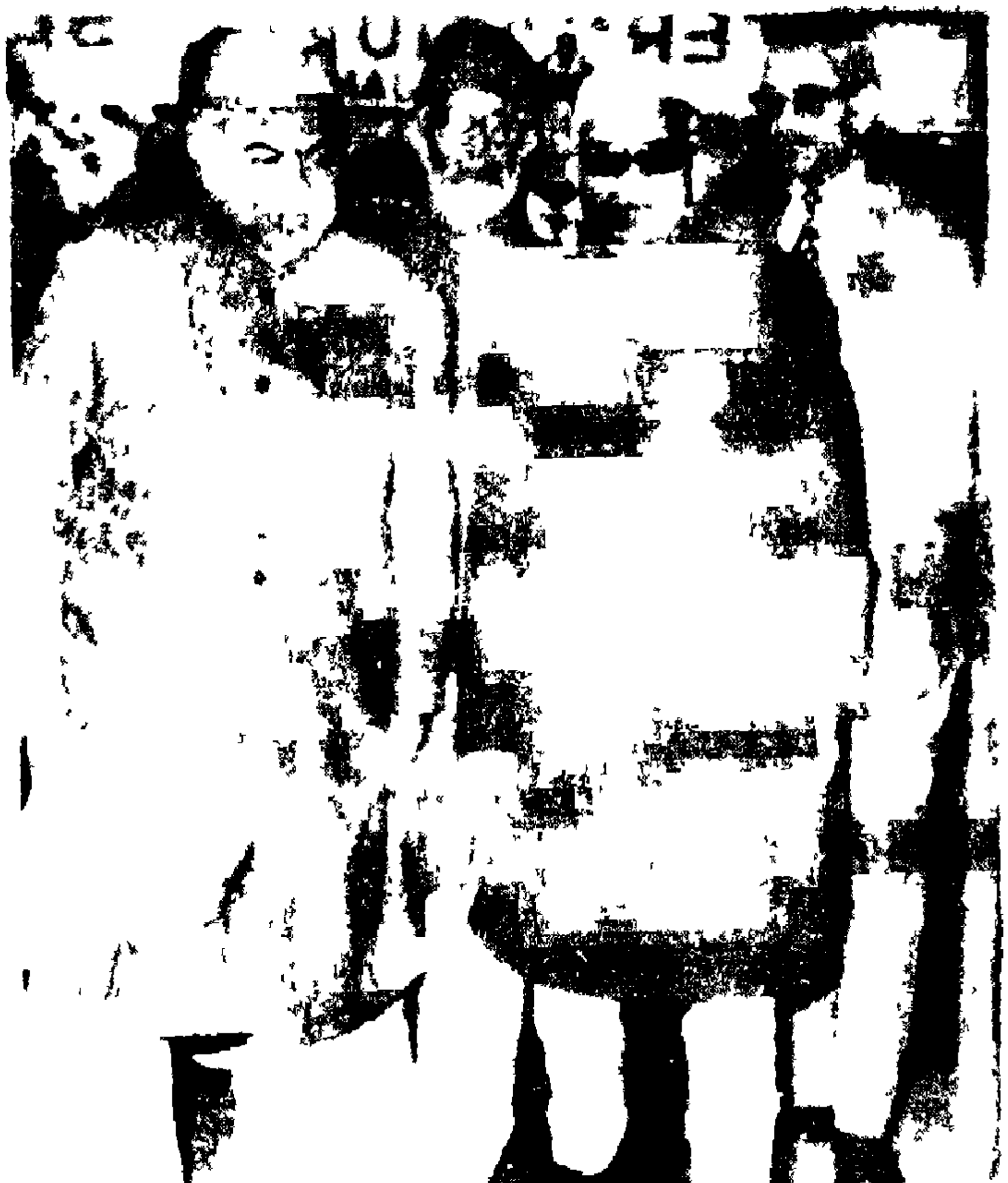
فقط وہ فارسی کے ہی نہیں تھے شاعرِ خوش گو
وہ ہیں اردو کے خالق اور پہلے شاعرِ پُر گو

کریں ہم جس قدر بھی ناز ان کی ذات والا پر
بجا ہے، راست ہے، زیبا ہے اے مرغوبِ نیک اختر

سلام اے طوطیِٔ ہندوستاں اے شاعرِ خوش گو
سلام اے خسروِ ملکِ صفا، اسلام کے پیرو







عزت مآب فخرالدین علی احمد صاحب صدر جمہوریہ ہند بین الاقوامی امیر خسرو سیمینار کے افتتاح کے لئے تشریف لاتے ہوئے
امیر خسرو یادگار کمیٹی کے اراکین جناب نورالحسن صاحب وزیر تعلیم صدر جناب یونس سلیم صاحب ایم۔ پی نائب صدر اور جناب حسن الدین احمد صاحب سکریٹری آپ کے ساتھ ہیں



ٹکٹ
امیر خسرو کی رسم اجرا
پروفیسر ایس۔ ایس۔ ناصر ایچ
[illegible] کی صدر صدر جمہوریہ
[illegible] کرنے کے بعد [illegible]
[illegible]

Punjab Wakf Board's Publication
The AUKAF Quarterly
50, Sardar Patel Marg, AMBALA Cantt.